زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... چاندتاروں کالہو ......

یہ ۷ فروری ۲۰۱۱ء کی بات ہے کہ مجھے بیٹھے بٹھائے خیال آیا جس طرح پروین شا کراچانک چلی گئی تھیں، کہیں میں یا دوسرے ساتھیوں میں سے کوئی اچانک نہ چلا جائے اس لئے مجھے چاہیے کہ قریبی احباب کے بارے اپنی یاداشتیں محفوظ کرلوں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میراانتخاب اختر جمال کی کتاب ''سمجھوتہ ایکسپریس'' تھی۔ اگلے روز معروف افسانہ نگار شکیلہ رفیق کی ای۔میل سے اختر جمال کی وفات کی اطلاع ملی۔ محترمہ اختر جمال عمر اور لکھنے میں مجھ سے سینئر تھیں مگر کبھی اُنہوں نے اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ اختر جمال ۲۲ مئی ۱۹۳۰ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم بھوپال اور ناگپور میں حاصل کرنے کے بعد پاکستان آ کر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے اور پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا چونکہ اُن کے شوہر احسن علی خاں کی تعیناتی گجرات، ایبٹ آباد اور راولپنڈی میں ہوتی رہی اس لئے اختر جمال نے اپنا تقرر اسلام آباد کے کالج میں کرالیا۔ اختر جمال کے افسانوں کے موضوعات دو طرح کے ہیں ایک تو وہی جو تحریک پاکستان، آزادی کے حصول میں طلباء کی جدوجہد اور ہجرت کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں اور دوسرے نہایت جدید زمانے کے سماجی مسائل سے متعلق۔ اوّل الذکر موضوعات بھی اکہرے اور سادہ نہیں ان میں خاصا پھیلاؤ اور تنوع ہے وہ دونوں اطراف کے لوگوں کو روزگار اور رہائش کے معاملات اور تقسیم شدہ کنبوں کو ویزا، پاسپورٹ اور اجازت ناموں میں پیش آنے والی دشواریوں کا احوال بیان کرتی ہیں۔ تقسیم کے موضوعات کے علاوہ اختر جمال جدید زمانے کی ایجادات اور معاملات سے متعلق افسانے بھی خوب تحریر کرتی تھیں جس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب فراہم کررہی ہے۔

...... منشایاد

دستیابی: 155/B، بلاک 5، گلشنِ اقبال، کراچی۔

...... دوسرا رُخ ......

ڈاکٹر سید سعید نقوی غیر معمولی تخلیقی ذہن کے مالک، ہر دلعزیز صاحبِ قلم اور اردو کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے یہاں افسانہ محض دل بہلانے والی قصّہ خوانی نہیں بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کا انکشاف ہے۔ اُن کے افسانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر افسانے کی پشت پر کوئی نہ کوئی حقیقت موجود ہوتی ہے اور یہ قصّہ نما حقیقت اُن کی تحریر کو آخر آخر افسانہ بنادیتی ہے ایسا افسانہ جو مروّجہ افسانہ کی ڈگر سے الگ ہوتا ہے اور سخت سے سخت تنقیدی معیار پر بھی افسانہ بنائے رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ مغرب میں مشرق کے ثقافتی ترجمان ہیں، اُن کا ذہن مطالعے کی وسیع بنیاد پر مغربی سہی مگر روح کی سطح خالص مشرقی ہے۔ ہر چند وہ وطن سے ہزاروں میل دُور امریکہ میں مقیم ہیں لیکن اُن کی جذباتی و محسوساتی دنیا یکسر مشرقی تمدن سے وابستہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے پہلے مجموعے کی طرح اُن کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''دوسرا رُخ'' بھی مقبول ہوگا اور عام و خاص دونوں ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

...... ڈاکٹر فرمان فتح پوری

دستیابی: 155/B، بلاک 5، گلشنِ اقبال، کراچی۔

...... آخری راز ......

عمران مشتاق صاحب کی کہانیوں میں زبان آسان، شگفتہ اور موثر ہوتی ہے۔ مکالموں کی زبان بچوں کے مدارجِ عمر کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اساطیری، اخلاقی اور عصری، سائنسی اور جغرافیائی موضوعات پر ان کی کتنی ہی دلچسپ اور معلوماتی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ اس وقت بھی ایسی ہی کئی کہانیاں مثلاً سونامی، تھمب الرٹ، قبرستان کا بھوت، دوسرا پراٹھا اور سو کا نوٹ میرے سامنے ہیں۔ اُنہیں عام واقعات کو بھی پُر اثر کہانیوں کا روپ دینے میں ملکہ حاصل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اُن کا یہ مجموعہ ادبِ اطفال کے قارئین کو بہت پسند آئے گا۔

...... مُرتضٰی ساحل تسلیمی

دستیابی: R-95، سیکٹر 15-B، بفرزون، نارتھ کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۰، شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۱ء

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔

فون: 5462495,5490181-51-(92+)

فیکس: 5512172-(92+)

موبائل: 5358114-333-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدرزیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

بے زبانی کا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔آصف ثاقب ۵
فبی آلاء ربکما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۶
اُنہیں کے دم کی برکت۔۔۔۔۔۔۔وقار بن الٰہی ۷
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۳
عداوت ہی سہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منشایاد ۲۲
اپنے دور کا فاتح۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رشید امجد ۲۶
ایک صاحبِ کردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل آزر ۲۸
عروج وزوال کی داستان۔۔۔۔۔۔۔احمد جاوید ۳۳
پنکھڑی کا گداز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حمید شاہد ۳۶
ایک آدمی کئی کہانیاں۔۔۔۔۔۔احسان بن مجید ۳۸

افسانہ

چاہ درپیش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقار بن الٰہی ۴۱
مانوس خطوط۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۴۶

رحمت کی گھٹائیں

امین راحت چغتائی، صابر عظیم آبادی ۴۹

افسانے

گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اختر آزاد ۵۰
محفلِ ہست و بود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا اصغر ۵۱
بے لگام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید سعید نقوی ۵۷

صفاتِ نو بہ نو

مشکور حسین یاد، محمود الحسن، منظر ایوبی، امین راحت چغتائی، سعید قیس، آصف ثاقب، غلام مرتضیٰ راہی، غالب عرفان، سریواستو رند، خیال آفاقی، رب نواز مائل، شاہین فصیح ربانی، صدیق شاہد، تشنہ بریلوی، مسرور احمد زئی، پرتپال سنگھ بیتاب۔ ۶۰

افسانے

پیکدان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مراق مرزا ۶۸
عید گاہ سے واپسی۔۔۔۔۔۔۔۔اسلم جمشید پوری ۷۰
ابابیلیں منڈلا رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۵

فن کی زندہ مثال

زہیر کنجاہی، کرامت بخاری، حیات رضوی، سجاد مرزا، رومانہ رومی، بشارت پرویز، شگفتہ نازلی، عرش صہبائی، اسد بیگ، خورشید انور، اکرام تبسم، اختر رضا سلیمی، تصور اقبال، شائستہ سحر، اخلاق عاطف۔ ۸۰

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔۔فیروز عالم ۸۵

ہوائیں چیختی ہیں

محمود شام، کشمیری لال ذاکر، منظر ایوبی، یوگیندر بہل تشنہ، انوار فیروز، رب نواز مائل، قمر بھوپالی، قیصر نجفی، فیصل عظیم، سیفی سرونجی، سید توقیر حیدر، عظمیٰ صدیقی، تنویر شاہد۔ ۹۲

نشانِ راہ

شام کی منڈیر سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انور سدید ۱۰۰
انبالہ کے مسلم شعراء۔۔۔۔۔۔۔۔ایم۔پی۔چاند ۱۰۲

آئینۂ فن

سانسوں کا سنگیت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسعود مفتی ۱۰۹

ورثہ

تقدیر بنی ہے دیواریں۔۔۔۔۔۔خورشید احمد صدیقی ۱۱۱

ایک صدی کا قصہ

اے۔آر۔کاردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۵

☆

○

''بے زبانی کا کیا ہے''

○○○

بے زبانی کا کیا ہے سبب میں نہیں جانتا
کیا پڑا ہے زباں پر غضب میں نہیں جانتا
سرگزشتِ محبت سنانی تو مشکل نہ تھی
کیسے تم کو سناؤں یہ جب میں نہیں جانتا
میں قلم کے کڑے اِمتحان میں پڑا ہوں
وہ لکھوں گا جو حدِادب میں نہیں جانتا
اس طرح چھوڑ کر مجھ کو تنہا میرے حال میں
چل دیئے ہیں کہاں لوگ میں نہیں جانتا
ختم ہونے کو ہے یہ مری داستاں دوستو
تم کو آخر میں لکھنا ہے کب میں نہیں جانتا
کج نصیبوں فقیروں کی سچی کہانی لکھوں
کج کلاہوں شہوں کا ادب میں نہیں جانتا
کیسی ہوتی ہے دل کی لگن کچھ خبر نہیں
کیسا ہوتا ہے حُسنِ طلب میں نہیں جانتا
بام و در کیوں ہیں لرزش میں مجھ کو بتائے کوئی
ملک میں کیا ہے شور و شغب میں نہیں جانتا
اعتبار و وقارِ سُخن ویسا ثاقب نہیں
ایسی حالت ہے کیوں اس کی میں نہیں جانتا

آصف ثاقب
(بوئی ہزارہ)

○

○○○○

قرطاسِ اعزاز

○○○

وقار بِن الٰہی

○○

کے نام

○

فبای آلاءِ ربکما تکذبٰن

فاری شا
(اسلام آباد)

نام
مختار احمد
قلمی نام
وقار بن الٰہی
پیدائش
کیمبل پور (اب اٹک)
تاریخ
۲۴مئی ۱۹۳۷ء (سرکاری)
۲۳ستمبر ۱۹۳۶ء (غیر سرکاری)
تعلیم
: گورنمنٹ ہائی سکول، کوہاٹ (میٹرک)
: گورنمنٹ کالج، اصغر مال، راولپنڈی (ایف۔اے)
: گورنمنٹ کالج، کیمبل پور (بی۔اے)
: ڈپلوما (صحافت)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
: ایم۔اے (اُردو) پنجاب یونیورسٹی، لاہور
(گولڈمیڈلسٹ)

ملازمت
لیکچرر
(گورنمنٹ کالج، ہری پور، گوجرخان، کیمبل پور، اسلام آباد)
:اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر (وزارتِ تعلیم)
: ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر (وزارتِ تعلیم
:جوائنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر (وزارتِ تعلیم)
:چیئرمین۔فیڈرل بورڈ آف ایجوکیشن، اسلام آباد

دیگر مشاغل/مصروفیات:
:پروگرام کمپیئر۔راولپنڈی ریڈیو (III) ۱۹۷۰ء۔۱۹۸۰ء
:ماہر زبان ونشریات، ریڈیو بیجنگ، بیجنگ، چائنا۔۸۱۔۱۹۸۲ء
:مترجم۔'چین باتصویر'۔بیجنگ'۔۸۱۔۱۹۸۲ء
:یونیسکومیگزین ''پیامی''۔۱۹۹۷ء۔۱۹۹۸ء

ادبی مصروفیات:
آغاز:
پہلی کہانی۔ ۱۹۵۵ء

شائع شدہ تصنیفات:
افسانے
ایک سو پچاس
مضامین
تقریباً پچاس
مجموعے
''کس سے کہے وہ'' ۱۹۹۲ء
''اُتر نا دریا میں'' ۱۹۹۲ء
''چاہ درپیش'' ۲۰۰۰ء
''پہلے پہلے خواب'' ۲۰۰۴ء
پانچواں مجموعہ (زیرِ ترتیب)۔
''ماں، میں تھک گیا ہوں'' (خودنوشت) ۲۰۰۶ء
''اُمید کی کرن'' (بچوں کے لئے طویل کہانی) ۲۰۰۲ء
''سمندر کے نیچے'' (ترجمہ/مطبوعہ فیروزسنز، لاہور) ۱۹۵۹ء
(وزارت میں کام کے دوران اور ملازمت سے فراغت کے بعد چند ایک تحقیقی مقالے بھی لکھے جن کا تعلق براہِ راست کارِ سرکار اور قومی امور سے تھا لیکن اس تحقیق نے قومی سطح پر بہت سے کام آسان بنائے)۔
(پاک و ہند کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانے کئی ایک غیر ملکی زبانوں (جرمن، انگریزی، روسی، ایرانی، ہندی وغیرہ میں ترجمہ کیے جا چکے ہیں)۔

صحرانوردی:
افغانستان، ترکی، رومانیہ، اٹلی، یونان، ایران، فرانس، برطانیہ، عوامی جمہوریہ چین، امریکہ، آسٹریلیا، تھائی لینڈ، سنگاپور، انڈونیشیا، نیپال، سوئٹزرلینڈ، سعودی عرب، روس، تاشقند وغیرہ۔

تحقیق:
راولپنڈی کے ایک نوجوان نے افسانوں پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔جدید زبانوں کی یونیورسٹی نے اِس مقالے پر اُسے ایم۔فل کی ڈگری ایوارڈ کی ہے۔

☆

''اُنھیں کے دم کی برکت''

ماں میں تھک گیا ہوں سے انتخاب

وقار بن الٰہی

پنڈی گھیب (ضلع کیمبل پور) کے پہلو میں ایک برساتی نالا ''سیل'' بہتا ہے۔سارا سال چہرے پر ریت ڈالے بس لیٹا رہتا ہے۔لیکن برسات کے موسم میں اُس کے مزاج کا (محبوب یا نیتاؤں کے مزاج کی طرح) کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔اب تو اُس پہ پُل بن گیا ہے لیکن میرے بچپن میں اُس پہ نہ پُل تھا اور نہ ہی پاٹ محدود۔طغیانی کی صورت میں اکثر بسیں پار ہی رُک کر پانی کے اُترنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ہمیں سختی سے ہدایت تھی کی سیل کی طرف رُخ بھی نہ کرنا' ورنہ پتہ بھی نہیں چلے گا اور دوسری دنیا میں پہنچ جاؤ گے (اُس عمر میں کس کافر کو دوسری دنیا کا پتہ ہوتا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو سوچا یہی جا سکتا ہے کہ بھلی جگہ ہی ہوگی) ہم نے بات سُن لی' پلّے باندھنے کی عمر نہ تھی۔تایا زاد بھائی' احمد وحید اختر' (وہی پیپلز پارٹی کا احمد وحید اختر' سینیٹر' ایم۔این۔اے) مجھ سے بمشکل ایک برس چھوٹا ہوگا۔وہ اسکول نہیں جاتا تھا' مسجد میں کلامِ مجید حفظ کر رہا تھا۔ایک دن بارش برسی اور اسکول میں جلد ہی چھٹی ہوگئی تو ہم دونوں سیل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

پانی تو اُتر گیا تھا لیکن بسوں کی چلنے سے جو گڑھے بن گئے تھے' اُن میں پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ہم نے فوراً جوتے' کپڑے اُتارے اور دھڑام سے پانی میں کود گئے۔کچھ نہ پوچھئے' کتنا مزہ آیا۔دیر تک یہ شغل جاری رہا اور ہمیں وقت کے گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔اُدھر تایا جان گھر آئے اور ہم دونوں کو غائب پایا تو اُن کا ماتھا ٹھنکا' فُرت باہر نکلے' کسی کھوجی کی طرح کھوج لگاتے ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ہم جو سوکھے کی ماری بطخوں کی طرح پانی میں غوطہ پر غوطہ لگا رہے تھے' تایا جان کو دیکھ کر یوں لگا' جیسے بطخیں کسی سنگدل شکاری کی گولی کا نشانہ بننے والی ہوں۔انہوں نے کہا کچھ نہیں' ہم باہر نکلے' کپڑے پہننے کی فرصت تھی نہ اجازت' ہاتھوں میں لٹکا لئے اور لٹکتے چہروں کے ساتھ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔اب اگر راستے میں لوگ تماشا دیکھتے اور ہنستے رہے تو اِس میں اُنہی کا قصور ہے' ہمارا تو نہیں۔ٹھیک ہے' تایا جان اُنہی سے پوچھ پاچھ کر ہمارے تعاقب میں آئے تھے لیکن اُن سے کس نے کہا تھا کہ ہمارا اِنتظار اور اپنا اخلاق تباہ کرتے رہیں۔گھر پہنچے' یوں کہ وحید آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔سیل پر سے تو طغیانی اُتر گئی تھی لیکن تایا جان کے غصے پر تو اب آ رہی تھی۔مجھے تو اِس لئے بخش دیا گیا کہ پرائی اولاد ہے لیکن وحید بیچارے کی سخت ٹھکائی ہوئی' اِس کے بعد دونوں کو مُرغا بن جانے کا حکم ملا۔مکان کسی ہندو مہاشے کا تھا جو بڑا باذوق تھا۔مُرغا بن کر اور ٹانگوں میں سے سر نکال کے جو نظریں اُوپر اُٹھیں تو کمرے کی چھت دکھائی دی' واہ واہ کیا خوبصورت رنگ برنگے شیشے استعمال کئے گئے تھے۔آپ اسے مبالغہ یا سر جھکانے کی وجہ سے آنکھوں کے آگے رنگ اور تارے ناچنے کا معاملہ خُدارا نہ سمجھیں۔

☆

ہائی اسکول کے مضامین میں سے ایک مضمون جغرافیہ کا بھی تھا جو ماسٹر غلام محمد پڑھایا کرتے تھے۔رہنے والے تو پنڈی گھیب کے تھے لیکن اُنہیں یقیناً ہماری خاطر یہاں (کیمبلپور) تبدیل کیا گیا تھا۔۔وہ اپنے مزاج اور انوکھی طرز کی سزاؤں کی وجہ سے ماسٹر گلّو کے نام سے مشہور تھے۔مجھے یاد ہے' آغاز اُنہوں نے 'زمین گول ہونے کے ثبوت' کے سبق سے کیا۔دو دِن پڑھاتے رہے۔یہاں کِس کافر کو زمین کی گولائی سے غرض تھی' یوں بھی اگر چپٹی بھی ہوتی تو کیا' آپ ہی انصاف فرمائیے' کیمبلپور نیچے گر جاتا یا ہم پہ کیا اثر پڑنا تھا' یہی ہوتا' صبح گھر سے اسکول کے لئے نکلتے تو بعد دوپہر گھر ہی غائب پاتے۔اِس سے بہتر ہمارے لئے اور کون سی صورتحال ہو سکتی تھی۔لیکن ظلم یہ ہوا' کہ تیسرے روز ماسٹر گلّو نے ساری جماعت کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور باری باری ہر ایک سے زمین گول ہونے کے ثبوت پوچھے جانے لگے۔جو درست جواب دینا شروع کرتا اُسے فوراً بیٹھ جانے کا اشارہ ہوتا اور اُنگلی دوسرے اگلے لڑکے کی جانب اُٹھ جاتی۔جسے کوئی جواب نہ سوجھتا اُسے کھڑا رہنے دیا جاتا اور یوں باری باری ساری جماعت بھگتائی جاتی۔بعض خاصے ہوشیار بھی تھے۔پہلوں کی کہی ہوئی باتوں کو ہی دہرا دیتے۔لیکن ہم میں اتنی بھی عقل کہاں تھی چنانچہ ہر روز' میرے سمیت' آٹھ دس ایسے ضرور نکل آتے' جن سے کوئی جواب نہ بن پڑتا (یہ بھی نہ کہہ پاتے کہ ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہیں اور دور ایک جہاز۔۔۔۔اتنا بھی کہہ دیتے تو ماسٹر بیٹھنے کا اِشارہ کر دیا کرتے تھے) یا وہ یہی کہہ کر چُپ ہو جاتے' کل تک تو گول تھی' آج کا معلوم نہیں۔

اب ماسٹر صاحب کھڑے ہوؤں کو باری باری اپنے پاس بُلا کر کُرسی کے پاس بٹھاتے اور اطمینان سے بغل میں ہاتھ ڈال کر ایک آدھ رگ اِس کمال سے مروڑتے کہ چیخیں آسمان تک جا پہنچتیں (پتہ نہیں اِن بیچاری رگوں نے اُن کا کیا بگاڑا تھا جب کہ اُن کے پاس ہڈیاں تھیں یا رگیں بلکہ رگوں کا تو جال بچھا ہوا تھا) دو چار مرتبہ تو یہ درس گاہی دہشت گردی برداشت کر لی لیکن جب دیکھا کہ زمین چپٹی ہوتی ہے نہ ہی دوسرا سبق شروع ہوتا ہے تو جماعت میں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ہم جماعت زمین گول ہونے کے ثبوت فراہم کرتے رہتے اور میں نیچے اسکول میں بیٹھا رہتا۔جونہی گھنٹہ بجتا اور ماسٹر دوسری جماعت کا رُخ کرتے تو میں بھی اپنی جماعت میں پہنچ جاتا۔

لیکن یہ چوہے بلی کا کھیل بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔ایک دن خطرہ

ٹل جانے کے بعد جو میں کمرہ جماعت میں داخل ہوا' تو مانیٹر نے گردن سے دبوچ لیا اور مقتل کی طرف لے چلا۔ ''گلو ماسٹر کہہ گئے ہیں' جب تم جماعت میں آؤ تو اُن کے پاس حاضر کئے جاؤ۔ چلو'' مانیٹر کے ساتھ ہمارے تعلقات کچھ ایسے کشیدہ بھی نہ تھے لیکن اُس روز تو اُس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ وہ شاید چھٹی جماعت کا کمرہ تھا' جہاں ماسٹر صاحب موجود تھے۔ مانیٹر نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور میرا سر آگے کر دیا۔ اُنہوں نے وہیں سے صدا لگائی ''گِھن آنس'' (لے آؤ) آواز کیا تھی' لگا' ڈیزی کٹر پھٹا ہے۔ نزدیک پہنچنے کی دیر تھی کہ ماسٹر صاحب نے زناٹے کا ایک تھپڑ ٹِکا دیا (مجھے اُس دن ہی یہ محاورہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ دن میں تارے دیکھنے سے کیا مُراد ہے۔ بعض محاورے جب تک اُن پر عمل نہ کیا جائے' سمجھ میں نہیں آتے) میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ماسٹر جی' میری نانی مر گئی تھی۔'' اُنہوں نے دوسری بار اُٹھا ہوا ہاتھ فوراً روک لیا اور کمال شفقت سے میرے سر پر پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''تو پہلے کیوں نہیں بتایا' جاؤ میرا بیٹا' گھر جاؤ۔'' یہ پوچھنے کی تکلیف اُنہوں نے گوارا نہ کی کہ نانی مر گئی تھی تو پھر اسکول کیا لینے آئے ہو۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شُکر ہے' نانی زندہ تھیں بلکہ اپنے ہونہار نواسے کو دعائیں دینے برسوں زندہ رہیں۔

☆

اُس زمانے میں دہلی سے ایک رسالہ ''بیسویں صدی'' نہایت باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا ایک تو اُس کی سرکولیشن بہت تھی' دوسرے پاک و ہند میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ خوشتر گرامی اُس کے ایڈیٹر تھے اور اُنہیں افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ناموں کے ساتھ ڈگریاں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ اِسی لئے کرشن چندر کا افسانہ شائع ہوتا تو اُن کے نام کے ساتھ بی۔اے ضرور لکھا ہوتا۔ اس کے علاوہ مُدیر کے نام خط اور مصنف کا پتہ بھی دیا ہوتا۔ مجھے جانے کیا سوجھی کہ ایک افسانہ اُنہیں بھیج دیا۔ فروری (۱۹۵۷ء) کے شمارے میں دیکھتا ہوں' میرا افسانہ ''چور'' نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے۔ خوشی تو بہر حال ہوئی لیکن چند ہی دنوں بعد خطوط کا ایک تانتا بندھ گیا۔ افسانے کا موضوع تو کوئی خاص نہیں تھا' ہاں' عورت کی بے وفائی کا قِصہ ضرور تھا۔ معاف کیجئے' اُس عمر میں میرا مخصوص موضوع عورت ہی ہو سکتا تھا۔ مشاہدہ تو بس برائے نام تھا' محض تخئیل کے بل بوتے پر قصہ گھڑ لیتا تھا۔ ہئیت کے لئے منٹو میرے اُستاد تھے اور فضا قائم کرنے کے لئے اے۔ حمید سے بہتر مصنف اور کون ہو سکتا تھا۔ اس افسانے کی اشاعت اور خطوط نے ڈھارس بندھائی۔۔

☆

ایک صاحب کی رہنمائی میں پرنسپل کے دفتر میں داخل ہوا' وہ تھے نہیں' انگریزی پڑھا رہے تھے۔ دیر بعد تشریف لائے تو میں نے اُن کا جائزہ لیا۔ چہرہ سوکھا ہوا' جیسے ہڈیوں پر چمڑہ مَڑھ دیا گیا ہو' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی لیکن گھوم گھام کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتی ہوئیں' جسم بھی دُبلا پتلا' سر پر پرانی رومی ٹوپی' جس کا پھُندنہ لہرا رہا تھا۔ بیٹھ چکے تو میں نے عرض کیا۔ ''جی' میرا نام۔۔۔'' اُنہوں نے بات کاٹ دی۔

''آپ دفتر سے فارم لیں اور پُر کر کے میرے پاس لے آئیں' داخلہ مل جائے گا۔ ویسے یوں بغیر اجازت آپ کو پرنسپل کے کمرے میں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔'' پھر عرض کرنے کی کوشش کی۔ ''جی' میرا نام۔۔۔'' اُنہوں نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی لیکن میری طرف دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔

''برخوردار' کہہ تو دیا ہے' فارم بھر کر لے آؤ' کیوں میرا وقت برباد کرتے ہو۔''

''جی میرا نام مختار احمد ہے اور میں یہاں پڑھانے آیا ہوں' پڑھنے نہیں۔'' میں اتنا طویل جملہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا' اِس ڈر سے کہ کہیں وہ سہ بارہ نہ ٹوک دیں۔ اُنہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا' مسکرائے' بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔

''معاف کرنا بھائی' زیادہ تر لوگ داخلے کے لئے ہی آ رہے ہیں' میں سمجھا۔۔۔کیا اِسی برس ایم۔اے کیا ہے؟'' اُنہوں نے جواب کا انتظار نہیں کیا' فائل میں سے پروانے کی نقل' جو اُنہیں بھیجی گئی تھی' نکالی' ایک فارم کی تین چار کاپیوں پر دستخط کروائے اور مجھے اِس سمندر میں دھکیل دیا۔ چل بیٹا' کل تک تو شاگرد تھا' پچھلے بنچوں پر بیٹھ کر بلیڈ بجایا کرتا تھا یا گُلو ماسٹر سے ڈر کر کلاس سے ہی بھاگ جایا کرتا تھا' آج تو خود اُستاد بن گیا ہے' اب لڑکے تیرے سامنے بلیڈ بجایا کریں گے اور تو اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ سب کچھ ہنستے کھیلتے برداشت کیا جائے' کسی شاگرد کو شرارت کرتے دیکھ کر پیٹ میں مروڑ نہ پڑنے لگیں' ورنہ مزہ نہیں آئے گا۔۔

☆

۱۹۶۵ء کی جنگ کے تین ہی روز بعد اِسلام آباد میں کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا' مجھے اِسی کالج میں (۱۹۶۶ء) رپورٹ کرنے کو کہا گیا۔

پہلے روز ہی کالج پہنچنے اور اُس کا حدود اربعہ جاننے میں نانی یاد آ گئی (پتہ نہیں' ایسے موقعوں پر نانی ہی کیوں یاد آتی ہے' دادی کیوں نہیں حالانکہ بقول اشفاق احمد مرحوم' نانکے تو پہلے ہی اسٹیشن پر اُتر جاتے ہیں)۔ مت پوچھئے' کن مشکلات کو عبور کر کے وہاں تک پہنچا۔ پرنسپل اصغر مال کالج کے ایک سینئیر اُستاد رانا عبدالرشید تھے' اُنہیں معاملات سنبھالنے کے لئے وہاں بھیجا گیا تھا لیکن کالج میں پہنچنے اور وہاں سے واپس نکلنے کا معاملہ ایسا تھا کہ وہ بھی بے بس تھے۔ ہم پاکستانیوں کی اِس عادت کی جتنی بھی تعریف کی جائے' کم ہے کہ ہم بس حُکم جاری کرنے میں سب سے آگے ہیں' اُس کے بعد ہر کام اللہ پر چھوڑ لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ یہ کوئی دیکھتا ہے نہ ہی سوچتا ہے کہ حُکم کو بجا لانے میں کِن

رکن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور اُن مشکلات کو حل کون کرے گا (ہم ادارے بھی اسی طرح کھولتے ہیں کہ بینر پھڑ پھڑا رہے ہوتے ہیں سنگِ بنیاد مبارک ہاتھوں سے رکھ دیا جاتا ہے تصویریں ٹھکا ٹھک اُترتی ہیں ٹی۔وی پر رپورٹ بھی نشر ہو جاتی ہے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے کیا گیا ایک وعدہ اور پورا کر دیا ہے اور اُس کے بعد اُسی جگہ پر برسوں دھول اُڑتی رہتی ہے یہاں تک کہ نقاب کشائی کی تقریب کی تختی کا پینٹ رنگ بدل کر پہلے پھیکا اور پھر سیاہ ہو جاتا ہے)۔ اُردو چونکہ بارھویں جماعت تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی اس لئے میرے علاوہ ایک اُستاد اور بھی تھے علی سجاد مہرا کبرآبادی دُبلے پتلے دھان پان سے۔ شعر کہتے تھے۔ یوں کہئے کہ شاعری کے لئے اُن کا حلیہ بالکل مناسب تھا۔ سر کے بال سفید تھے لیکن جب اُنہیں ٹی۔وی کے مشاعرے میں شامل ہونا ہوتا تو رنگ لیتے تھے۔۔

☆

شروع شروع کی بات ہے اِسلام آباد کی سڑکوں پر گاڑی تو رہی ایک طرف پیدل چلنے والا بھی خال خال ہی نظر آتا تھا کہ عیدِ قرباں آ گئی۔ بیشتر مکیں اپنے اپنے گھروں اور علاقوں کو بھاگ گئے۔ پھر بھی تھوڑے سے اِس بستی کو آباد کرنے کی تہمت سہنے کے لئے یہیں رہ گئے۔ دوسرے سیکٹروں کی طرح ایف۔ سکس کے سیکٹر میں بھی چند ایک فلیٹوں میں بلب روشن ہونے لگے۔ اِن فلیٹوں میں حکومت کے درمیانے درجے کے افسران رہتے تھے۔ وہ آپس میں مل بیٹھے اور طے یہ پایا کہ چندہ کر کے ایک بیل خرید لیتے ہیں۔ ذبح خود ہی کریں گے اور گوشت بھی خود ہی بنائیں گے گو اِس کام کا تجربہ بالکل نہیں لیکن کھال اُتارنا اور گوشت بنانا کون سا مشکل کام ہے (سرکار نے بیشتر کو اسی کام پر تو مامور کر رکھا ہے)۔

لیجئے عید کا سورج بھی طلوع ہو ہی گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد سبھی حِصہ داران اُس میدان میں جمع ہو گئے جہاں ایک درخت کے ساتھ بیل بندھا ہوا تھا۔ کسی نے پرات اُٹھا رکھی تھی اور کسی کے دونوں ہاتھوں میں پتیلا تھا۔ جو ہاتھ آیا اُٹھا لائے تھے۔ چند ایک بچے بھی بیل کے ذبح ہونے کا تماشا کرنے کے لئے وہاں اِکٹھے ہو گئے تھے۔ سب ایک دائرے کی صورت میں منتظر لیکن سہمی ہوئی نظروں سے بیل کو دیکھے جا رہے تھے۔ ایک صاحب نے چھری لہراتے ہوئے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا وہ آگے بڑھے اور کوشش کی کہ بیل کے اگلے پاؤں میں رسہ ڈال دیں۔ بیل بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اُس نے جو گھور کر اور پھر غرا کر صاحب کی طرف دیکھا تو صاحب پانچ فٹ پیچھے جا گرے۔ اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے ایک اور صاحب جو اپنے محکمے میں خاصے خونخوار مشہور تھے آگے آئے اور بیل کی پچھلی ٹانگوں میں رسہ ڈال کر جو ایک ہی جھٹکا دیا تو بیل ایک پہلو میں گر گیا اب سب مشکل کشاؤں نے فوراً بیل کی مشکیں کس دیں جیسے تھانے میں کسی قیدی کی کسی جاتی ہیں۔ جب یقیں ہو گیا کہ بیل اب کسی صورت ہلنے کا نام نہیں لے گا تو چھری بردار حضرت آگے بڑھے بیل کی گردن پر چھری رکھی اور ناظرین کی طرف یوں دیکھا جیسے چھری اُن کی اپنی گردن پر پھرنے والی ہو۔ پھر بسم اللہ پڑھ کر چھری پھیرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابھی وہ گردن کی لٹکتی جھالر ہی کاٹ چکے تھے کہ بیل کو اچانک احساس ہوا کہ وہ جس کام کو اِن لوگوں کی دل لگی سمجھے ہوئے تھا دراصل اُس کی جان لینے کی کاروائی تھی اُس نے اچانک ہی نعرہ بلند کیا بے ساختگی سے اِتنا اور ایسا زور لگایا کہ رسہ ٹوٹ ٹاٹ کر جانے کہاں غائب ہو گیا بیل اُٹھا اور اُٹھ کر سرپٹ بھاگنے لگا۔

اب سین کچھ ایسا تھا کہ آدھی کٹی گردن کے ساتھ بیل بھاگا جا رہا تھا جب کہ خون تیزی سے اُس کی کٹی رگوں میں سے بہتا اور اُس کے فرار کے راستے کی نشاندہی کرتا جاتا تھا۔ ذبح کرنے والے صاحب چھری لہراتے تیزی سے اُس کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے اور حصہ لینے والے حضرات اُن سب کے پیچھے پیچھے پراتیں پتیلے اُٹھائے اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں بیل گر ہی جائے گا بس وہیں اُن کی عید ہو جائے گی۔ البتہ دو چار اِس لئے بھی بھاگ رہے تھے کہ اُن کی بیگمات فلیٹوں میں چولہوں پر پتیلے چڑھائے پانی گرم کر رہی تھیں۔

''ابھی مُنی کے ابّا اپنا گوشت لا رہے ہوں گے تو۔۔'' اُنہیں کیا خبر کہ مُنی کے ابّا تو میراتھون میں شرکت کئے ہوئے ہیں۔۔۔ خیر سے زیرو پوائنٹ (جائے حادثہ سے تقریباً پانچ کلومیٹر دور) بیل نے ٹھوکر کھائی منہ کے بل گرا ایسا کہ پھر اُٹھا نہیں۔ ہمارے پہلوان بھی چھری سمیت اُس کے سر پر پہنچ ہی گئے لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اُن کا سانس تیز چل رہا تھا یا بیل کا خون زیادہ تیزی سے بہہ رہا تھا۔ صاحب نے ایک قلندری نعرہ بلند کیا اور چھری ایک ہی بار ایسی چلائی کہ گردن کٹ کر ایک اور صاحب کے پاؤں میں آ گری۔۔

اب کھال اُتارنے اور گوشت بنانے کا مرحلہ آیا تو نہ پوچھئے کتنی اور کیسی کیسی لڑائیاں لڑی گئیں۔ حصہ دار اپنے اپنے حصے کا گوشت لے کر فلیٹوں کو پلٹے تو شام کے چار بج رہے تھے۔ بیگمات کی خونخوار نظروں کے سامنے ہر ایک کی یہی استدعا تھی۔۔ ''بیگم دُعا کرو اللہ قبول کرے۔۔۔''

☆

سیکریٹریٹ کے ڈی بلاک میں مجھے ایسے ساتھی ملے جنہیں دیکھ دیکھ کر میرا جی چاہتا سب کو بتاؤں اور سِکھاؤں کہ محنت اور سیکریٹریٹ کی ملازمت ایسے کی جاتی ہے۔ وہ ہمارے ریوڑ کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ پہلے سے وزارتِ تعلیم میں موجود تھے شاید اونچی سطح کے کلرک۔۔ اب جو لوگ ٹرک بھر بھر کر آنے لگے تو اُن کا بھی داؤ لگ گیا اور وہ سیکشن آفیسر ہو گئے۔ دفتر میں وہ ہمیشہ نو بجے کے بعد آیا کرتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد اخبار اُٹھاتے اور مطالعے میں غرق ہو جاتے۔ اِس دوران کوئی چٹ پٹا ٹکڑا دِکھائی دے جاتا تو

مجھے بھی محظوظ کر دیتے' فون آتا تو سُن لیتے اور تُرت جواب دینے کا وعدہ کر لیتے۔ گیارہ بجے کے قریب وہ اُٹھتے' اپنی الماری کو چابی لگا کر فائلیں نکالتے اور سب کی سب اپنے دائیں رکھ کر ہاتھ جھاڑتے اور بیٹھ جاتے۔ ایک ایک فائل اُٹھاتے' اُسے بائیں رکھتے جاتے' ساتھ ہی ساتھ بُڑبُڑائے بھی جاتے۔

''اِس پر تو نوٹ لکھنا ہے۔۔۔ٹھیک۔۔۔یہ جواب آج ضروری ہے۔۔۔ہوں۔۔۔اِس پر ریمائنڈر دینا ہے سُسرے بھنگ پی کر سو جاتے ہیں' جواب ہی نہیں دیتے۔۔۔یہ۔۔۔ہاں۔۔۔یہ جواب نہ بھی گیا تو کیا ہوا' کون سی قیامت آ جائے گی۔۔۔اور اس میں۔۔۔پتہ نہیں ڈپٹی کیا چاہتے ہیں؟۔۔؟'' دائیں طرف کا ڈھیر بائیں منتقل کر کے پھر ہاتھ جھاڑتے' میری طرف دیکھتے۔

''ہاں تو میاں' ذرا فون کا خیال رکھنا' ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں' میں چائے پی آؤں۔ بس یوں سمجھو کہ گیا اور آیا (ساتھ ہی چٹکی بجاتے)''۔ اور میرا جواب سُنے بغیر وہ غائب ہو جاتے۔ بارہ سوا بارہ بجے تشریف لاتے اور آتے ہی کسی نہ کسی عزیز یا عزیزہ کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ ایک بجے یہ کاروبار ختم ہوتا تو دفتر میں لنچ اور نماز کی بریک ہو چکی ہوتی۔ وہ فون لے کر اِدھر اُدھر گھماتے اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے۔

''یار' دفتر میں میں کھانے کا قائل ہوں نہیں' بس' بہت ہوا تو چائے پی لی۔ اب سُسری چائے بھی ملتی ہے تو کون سی' ٹھنڈی ٹھار' ذائقہ لگتا ہے کسی درخت کی چھال اُبالی گئی ہے۔ میں ذرا صدیقی صاحب سے مل کر آتا ہوں۔ چائے مل گئی تو واہ واہ' نہیں تو پھر تمہیں ہی موقع دوں گا'' اور وہ نکل جاتے۔ دو بجے لوٹتے' آتے ہی بائیں طرف رکھی فائلوں کو ایک ایک کر کے اُٹھاتے اور جب ڈھیر تیار ہو جاتا تو اُٹھتے' الماری کھولتے' فائلوں کا بنڈل اُٹھا کر اندر رکھتے' چابی پھیرتے اور انگڑائی ضرور لیتے' ہاتھ اور کندھے پیچھے لے جا کر سینہ پھلاتے اور کہتے'' آج تو تھک گئے۔ اچھا بھئی میں تو جا رہا ہوں۔ دیر ہو گئی تو بس میں جگہ نہیں ملے گی۔'' خُدا جھوٹ نہ بُلوائے میں پورا ایک برس اُن کا یہ تماشا دیکھتا رہا۔

☆

یہ وہی علاقہ (بُخارا) تھا جہاں بے شمار حکمران اور حکمرانوں کے خاندان پیدا ہوئے' جہاں علم کے متوالوں کے لئے بے شمار مکتب' بیشمار کتب خانے اور ایک سے بڑھ کر ایک عالم موجود تھے۔ دنیا کا ایسا کون سا علم ہے جس کے اِبتدائی نقوش یہاں نہیں ملتے (اغیار نے ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھایا' اُنہیں اُٹھانا بھی چاہیئے تھا' تھوڑا بہت اِضافہ کیا اور ہر شئے کو اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ ہم پھر بھی نہیں سمجھے کہ غفلت کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے)۔ پھر حکمران تھے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر نکلے' اپنی سلطنتوں سے مشرق کا رُخ کیا تو راستے میں حائل ہر شئے کو عبور کرتے ہوئے منزلوں پر منزلیں طے کرتے' ہر دشمن پر فتح حاصل کرتے گئے۔ صرف فتح ہی حاصل نہیں کی بلکہ وسیع و عریض علاقے پر سینکڑوں برسوں پر محیط حکمرانی کا ڈول بھی ڈالتے گئے۔۔ہم تاریخ' وہ بھی اپنی تاریخ سے لاکھ بیگانہ ہو جائیں' خیوا' بُخارا' سمرقند اور فرغانہ کے نام کیسے بُھلا سکتے ہیں۔۔۔اغیار نے تاریخ کے سینے سے بے شمار نشان کُھرچ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن۔۔۔بھلا تاریخ سے بھی کوئی حقیقت کُھرچی جا سکتی ہے؟ اب تو چاروں اوُور ویرانی ہی ویرانی دکھائی دیتی ہے۔ ہاں! مستقبل کے سہانے خوابوں کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے لیکن۔۔۔۔وہی علاقے جہاں سے فاتحین کے قافلے روانہ ہوا کرتے تھے' اب (میں تیس پینتیس برس پُرانی بات کر رہا ہوں) وہاں زیادہ سے زیادہ ہوٹل کے تہہ خانے میں نوجوان آتے' ناچ گانے میں شریک ہوتے اور دو چار گلاس اپنے اندر اُنڈیل کر چلے جاتے ہیں' جیسے اُنہوں نے زندگی کی معراج پا لی ہے۔۔

☆

چین میں رہنے کے باوجود مجھے چینیوں کی چند ایک چیزیں سمجھ میں نہ آئیں۔ ایک تو اُن کا ایک پلڑے والا ترازو تھا' وہ وزن کے ٹھیک ہونے کا اندازہ کیسے کرتے تھے' بتانے پر بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ایک پلڑے میں کچھ ڈالتے' پھر ڈنڈی اُٹھا کر کہتے' لو ایک جن ہو گیا۔۔۔۔۔دوسری چیز اُن کا ایبکس (حساب کتاب کرنے کا تختہ) تھا' جس کی سلاخوں میں پروئی گولیوں سے وہ جمع تفریق کرتے تھے۔ کیسے' یہ وہی جانتے تھے؟ ایک بار وانگ سے سیکھتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ مجھے یہ تو سمجھاؤ اگر دس میں سے تین منفی کرنے ہوں تو کیسے کریں گے تو اُس کے جواب نے مجھے حیران ہی نہیں پریشان بھی کر دیا کہ وہ ایبکس پر منفی کرنا نہیں جانتا تھا۔ چونکہ اُس کا کام صرف جمع سے متعلق تھا (ہر شام اُسے اپنی رپورٹ میں لکھنا ہوتا تھا کہ اُس روز کتنے الفاظ ریڈیو سے نشر ہوئے)۔ اِس لئے وہ صرف جمع کرنے سے ہی واقف تھا (ہماری حکومت کی طرح جو اشیأ کی قیمتوں میں اضافہ ہی کرنا جانتی ہے کمی کا سبق اُس نے پڑھا ہی نہیں)۔ تیسری شئے اُن کا طرزِ تخاطب تھا۔ ہر کسی کو وہ 'تھنچر' (کامریڈ) کہہ کر پُکارتے تھے لیکن جلدی میں کبھی تھنچ کہہ جاتے اور کبھی تھنز۔ میرے پلے کبھی نہ پڑا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔۔اور چوتھی بات' اُن کی عادت کہ جب بھی' کوئی بھی ملتا' ضرور پوچھتے' کھانا کھا لیا ہے؟ مجھے ایک بار شرارت سوجھی' جونہی کامریڈ نے پوچھا' کھانا کھا کر آئے ہو تو میں نے جواب دیا۔ نہیں۔۔تو اُس نے فوراً کہا' جاؤ' جا کر کھانا کھا کر آؤ۔۔ آخر وہ دوسروں کے کھانا نہ کھانے کے بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہوتے تھے؟ شاید اس لئے کہ اُن کے ہاں دوسروں کو کھانا کِھلانے کی گنجائش نہیں تھی یا۔۔شروع شروع میں سڑک کے کنارے ایک خاتون بیٹھی نظر آتی تو میں اُسے بڑے اِنہماک سے دیکھتا۔ خاتون نے منہ پر ماسک' سر پر ٹوپی' ہاتھوں میں دستانے اور اوپر اوور آل پہن رکھا ہوتا' سامنے آئس کریم کی ڈبہ نما ریڑھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آواز نکالتی تھی جسے سمجھنے

کی میں نے سرتوڑ کوشش کی، جب پلے کچھ نہ پڑا تو ایک روز ساتھیوں سے پوچھ ہی لیا۔

''یارو، یہ کہتی کیا اور بیچتی کیا ہے؟'' تو وہ ہنس پڑے۔

''یہ خاتون آئس کریم نہیں، برف کے میٹھے گولے (ice candy) بیچتی ہے (مجھے اپنے اسکولوں کے باہر برف کو رندہ کرنے کے بعد گولے بنانے والے یاد آ گئے) اور آواز دیتی ہے۔۔''مچھنگڑ''۔۔اگر چوسنا چاہو تو لے دیتے ہیں لیکن تمہارے گلے کا ذمہ نہیں لیتے۔۔۔''

☆

دسمبر ہی کی شام تھی جب میں بیکنگ کے ایئرپورٹ پر اُترا تھا اور وانگ اور پانی مجھے لینے آئے تھے، دو برس بعد دسمبر کی ہی شام تھی جب پی۔آئی۔اے کا جہاز ٹوکیو سے آ کر رکا مجھے اِس پرواز سے اپنے وطن لوٹ جانا تھا۔ایئرپورٹ پر یونم اور جوشی مجھے خُدا حافظ کہنے آئے تھے۔یونم کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چینی کھڑے حیرت سے دیکھے جا رہے تھے۔۔یہ پاکستانی اور ہندوستانی (ہم انفرادی طور پر ٹھیک ٹھاک رہ سکتے ہیں لیکن ہجوم میں نہیں، ہجوم کی بھاشا کچھ اور ہو جاتی ہے)۔اِسی فلائٹ پر نور محمد بھی ہے جسے ہم سب نورا کہتے تھے۔وہ ہر فلائٹ سے بیکنگ آتا تھا تاکہ چینی مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔والد اُس کے بھارت سے آئے تھے لیکن والدہ ہانگ کانگ کی تھیں اِس لئے وہ چینی بول لیتا تھا۔فلائٹ سے وہ بیکنگ میں اُتر جاتا تھا اور اگلے روز جب فلائٹ ٹوکیو سے واپس آتی تو وہ کراچی جانے کے لئے تیار ہوتا۔میں نے کہا ناں۔۔۔اچھے لوگ اور بہت اچھے لوگ ملے، نورے نے پورے دو برس مجھے پاکستانی چائے اور میری بیگم کو کراچی کی سبز مرچ مسلسل سپلائی کی۔اچھے لوگوں سے ہی تو زندگی میں رنگا رنگی آتی ہے۔۔

☆

چلئے، جان چھوٹی لاکھوں پائے۔۔۔۔میں نے (سیکریٹریٹ ڈی بلاک) کی کھڑکی سے باہر املتاس کے درخت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔جب میں اِس عمارت میں وارد ہوا تھا (تقریباً تیئیس برس پہلے) تو یہی درخت دکھائی دیئے تھے۔برسات کا موسم گذر چکا تھا اور درختوں پر سبزہ ہی سبزہ تھا، البتہ ٹہنیوں اور شاخوں پر املتاس کی یہی پھلیاں لٹک رہی تھیں۔اتنا عرصہ گذر گیا، کئی بہاریں آئیں اور چلی گئیں، کتنی بار روشوں پر پھول کھلے اور مُرجھا کر کیاری کا ہی کھاجا بن گئے لیکن۔۔۔۔متعدد بار اِن درختوں پر بھی پیلے پھول آئے، جھڑے نہیں، پھلیاں بن کر جھولنے لگے البتہ یہ پہچاننا مشکل تھا، پہلی پھلیاں کون سی ہے اور نئی کون سی۔پرانی پھلیاں شاید اپنی بہار دکھا کر گر جاتی تھیں یا کوئی اُنہیں اُتار لیتا تھا لیکن کسی کو کیا پڑی ہے کہ پھلیاں اُتارتا پھرے، وہ بھی املتاس کی۔۔۔درخت آج بھی اُسی شد و مد سے پھلیاں لٹکائے ہوئے تھے البتہ خود تھوڑے سے بوڑھے لگ رہے تھے۔میں نے سوچا شاید میری طرح، جیسے پرانی پھلیاں گر کر نئی کی جگہ بنا دیتی ہیں جیسے۔۔۔۔بہرحال اِن درختوں سے بڑا طویل ساتھ رہا۔۔جب بھی میری آنکھیں درد کرنے لگتیں یا میں کسی بھمل بھوسے میں پھنسا ہوتا تو اِسی طرح کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر، ایئر کنڈیشننگ کی ڈکٹ پر کہنیاں ٹکا کر یا صرف ہاتھ رکھ کر اِن درختوں اور پھلیوں کو دیکھا کرتا تھا۔۔آج بھی یہی کر رہا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے، پہلے میرے پاس لامحدود وقت ہوا کرتا تھا آج۔۔۔وقت ہی تو نہیں ہے۔۔۔

جونہی پانچ بجیں گے، میں اپنا بریف کیس اُٹھا کر کاریڈور سے ہوتا ہوا، لفٹ سے نہیں سیڑھیوں سے نیچے اُتر جاؤں گا۔ڈی۔بلاک کے مرکزی دروازے سے نکلتے ہی میرا اِس عمارت سے رشتہ منقطع ہو جائے گا۔کل میں اوّل تو اِدھر کا رُخ بھی نہیں کروں گا اور اگر آ بھی گیا تو میں ایکس یا سابقہ کے طور پر آؤں گا۔۔۔کھڑکی سے ہٹ کر میں نے سوچا۔۔یہ تیئیس برس کیسے پلک جھپکنے میں گذر گئے۔۔۔

باہر مجھے کسی ڈرائیور وارائیور کا انتظار نہیں تھا بورڈ کا ڈرئیور تھا تو لیکن میں نے اُسے پہلے ہی رُخصت کر دیا تھا۔۔۔بریف کیس پکڑا، باہر کاریڈور میں آیا تو سارے لوگ جا چکے تھے کہ کاریڈور سنسان پڑا تھا جیسے دن بھر کی مشقت کے بعد ستا رہا ہو۔۔۔کاریڈور طے کر کے میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔۔۔تھیں ہی کتنی۔۔۔باہر آیا تو راستے بھی سنسان پڑے تھے۔البتہ پارکنگ میں کھڑی گاڑی میری منتظر تھی۔۔اِس دفتر، اِس وزارت میں میں نے زندگی کے تیئیس برس گذارے تھے اور آج جب کہ میں یہاں سے رُخصت ہو رہا تھا تو۔۔۔۔مجھے خُدا حافظ کہنے کے لئے کوئی ایک شخص، ہاتھ یا دو آنکھیں بھی نہ تھیں۔یا شاید جانے والوں کے ساتھ ہم ایسا ہی سلوک کرنے کے عادی ہیں یا انسان کاٹتا وہی ہے جو وہ بویا کرتا ہے (کہتے ہیں، جانے والے کو سب سے ملنا اور خُدا حافظ کہنا چاہیئے کہ وہی دوسروں سے رُخصت ہو رہا ہوتا ہے اور وہی چلی ہوئی گولی یا خالی کارتوس ہوتا ہے۔میں تو کسی سے بھی نہیں ملا تھا؟) خیر۔۔میں نے سر جھٹک کر بریف کیس گاڑی میں پھینکا، گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کو ہو لیا۔۔۔

☆

ہمارے ہاں سیاست دانوں کا یہ محبوب مشغلہ رہا ہے کہ وہ مختلف محکموں کی سربراہی سنبھالنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔سیاست کے بارے میں یا اُن کے سیاسی اوصاف کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں سیاست کی الف بے سے بھی واقف نہیں (سوائے ایک بار الیکشن لڑنے کے لیکن اُس بات کو بھی پچاس برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا اور پایا کیا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ ناراض ہو گئے) لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بیشتر حضرات دفتری کام اور امور سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔اُنہیں کسی قاعدے کا عِلم ہوتا ہے نہ ہی وہ کسی پابندی کو قبول کرتے ہیں بلکہ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ اُس کی لاٹری نکل آئی ہے۔اور یہ تو ظاہر ہے، جس کی لاٹری نکل آئے، وہ مارے خوشی کے بے ہوش ہو کر کچھ بھی کر ڈالتا ہے (روس میں انقلاب کی کامیابی کے بعد جو لیڈر حضرات

تھے، اُنھوں نے تمام بڑے بڑے کارکنوں کو بُلایا اور اُنھیں مبارک باد دینے کے علاوہ یہ پیشکش کی کہ "لیجئے یہ آپ کا مکان، کار اور بینک بیلینس ہے۔ آپ نے انقلاب کے لئے بہت کام کیا ہے، اِسی لئے کامیابی نصیب ہوئی۔ آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر یہ میڈل آپ کو دیا جا رہا ہے۔ قوم آپ کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔۔ آج کے بعد آپ کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ مُلک میں انقلاب برپا کرنا ایک علیحدہ صورتحال ہے جب کہ حکومت چلانا اور انقلاب کے ثمرات کو عوام تک پہنچانا ایک دوسرا انقلاب ہے۔ یہ ساری مراعات اس ایک شرط پر آپ کو دی جا رہی ہیں کہ آپ ان شرائط پر کاربند رہیں گے تو بھلا آپ کا ہی ہوگا۔ اگر نہیں تو پھر نتائج کی ذمہ داری بھی آپ پر ہی ہوگی۔۔ سب نے ہنسی خوشی اس شرط کو قبول کر لیا لیکن چند ایک سر پھروں نے سوچا، اُنھوں نے قدرے زیادہ ہی قربانیاں دی ہیں چنانچہ اُنھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن چند دنوں بعد وہ کسی کو دوبارہ دِکھائی نہ دیئے)۔ ہمارے سیاست دانوں کو پارٹی اور مُلک پر کئے گئے احسانات ہی یاد رہتے ہیں۔

☆

تین چار روز مزید گزارنے، مکہ مکرمہ کے گردونواح میں تمام اہم مقامات دیکھنے اور منیٰ اور عرفات کا نظارہ کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔۔ مجھے دس برس پہلے کا سفر یاد آ گیا، جو رمضان المبارک میں رات کے وقت کیا تھا، اب ہم دن کے وقت جا رہے تھے۔۔ راستہ دیکھنے کا شوق تھا، وہی راستہ جس پر حضور ﷺ تشریف لے گئے تھے۔ ہماری گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی، تیز رفتار تھی جس نے چار گھنٹوں میں پہنچا دیا لیکن کوئی ہولے ہولے کان میں کہہ رہا تھا، اِتنا فاصلہ اُنھوں ﷺ نے کیسے طے کیا ہوگا۔۔ راستے میں ریت ہی ریت تھی یا سیاہ پتھر۔ یہ صرف اُنہی کے دم کی برکت ہے کہ ریت کے ٹیلوں کے نیچے تیل کے دریا رواں دواں اور کالے پتھروں نے کمال ہوشیاری سے سونے کے ذخائر کو چھپا رکھا ہے۔ ایک سیال سونا ہے، دوسرا سیاہ سونا۔ منزل پر پہنچ کر سبھی اپنا اپنا سامان رکھ کر حرم شریف کی طرف بھاگتے ہیں۔ میں بھی جاتا ہوں لیکن بھاگتا نہیں۔

راستے میں وجاہت سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھتے ہیں "ابھی تک حاضری نہیں دی؟"

"یار! سفر کی گندگی سارے جسم پر ہے۔ گو آ خانہء کعبہ سے رہے ہیں لیکن ذہن ابھی تک دنیا کی آلائشوں میں ڈوبا ہوا ہے، بس اِن سے چھٹکارا پا لوں تو حاضری دوں گا۔ حاضر نہیں ہوں گا تو جاؤں گا کہاں، آخر کو اتنی دور سے آیا بھی تو اِسی نیت سے ہوں۔" مکہ میں مقیم ایک دوست نے بتایا تھا کہ اُس کا بھائی حاضری دینے آیا تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔۔۔ اِس کا مطلب ہے، اُس کے ہوش وحواس قائم تھے (تبھی تو وہ کہہ پایا یا محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں)۔۔ ہوش وحواس ہی قابو میں نہ رہیں تو کہاں کا ڈرنا۔۔۔

☆

براہِ راست

منیر نیازی مرحوم نے اپنی ذات کے حوالے سے ہر کام میں تاخیر کا حوالہ دے کر اصل میں ہمارے قومی مزاج کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم مگر برملا اور برمحل یہ اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ جناب وقار بن الٰہی کے باب میں ہم تاخیر نہیں بلکہ بہت زیادہ تاخیر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جس طرح ہر ملزم اپنی صفائی میں کچھ کہنا، کچھ کرنا چاہتا ہے ہم اس طرح کا ارادہ رکھتے نہ تاخیر کو باعثِ تاخیر سے نتھی کر کے بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ البتہ ! آپ سے یہ درخواست ہمارا حق بنتا ہے کہ آپ ہماری واجب اور ناواجب مجبوریوں کے پیش نظر دیر آید درست آید کو بروقت آید گردانتے ہوئے زیرِ نظر شمارے کو اُسی توجہ ، اشتیاق اور انہماک سے زیرِ مطالعہ لائیں گے جس طرح دو عشروں پر مشتمل چہارسو کے شمارے آپ کی توجہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ اُمید اور یقین کی ہمسری میں آپ کو یہ اطمینان دلانا ہمارا فرض ہے کہ اس خاص شمارے کے مطالعے کی روشنی میں آپ کی ملاقات یقیناً ایک نئے اور پُرعزم وقار بن الٰہی سے ہوگی جو اپنے علمی، ادبی ورثے کے ماضی کے ساتھ مستقبل کی نگہبانی کا فریضہ بھی بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

گلزار جاوید

☆ آپ کا آبائی تعلق اٹک سے ہے جب کہ قیامِ پاکستان کے وقت انبالہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ انبالہ میں قیامِ کے اسباب اور تقسیم ہند کی چشم دید کہانی کے گواہ کی حیثیت میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ آپ اٹک کو میرا آبائی شہر کہنے پر مصر ہیں تو میں مان لیتا ہوں لیکن سچ جانیے' میں جس شہر میں پیدا ہوا' اُس کا نام کیمبلپور تھا' چھوٹا سا صاف ستھرا شہر۔ بعد میں جب عنانِ حکومت ہمارے ہاتھوں میں آئی' ہم نے صرف کیمبلپور کا ہی نہیں' بہت سے شہروں کے نام تبدیل کر دیئے۔ جب کوئی ٹھوس کام کرنے کو نہ ہو تو ہم اسی قسم کے کام کیا کرتے ہیں۔ کسی حق دار کو اُس کا حق دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ کیمبل نے کوئی ڈاکے نہیں ڈالے تھے' ایک شہر تو آباد کیا تھا۔۔

میرے والد دوسری جنگِ عظیم میں اپنے آقاؤں کی خدمت بجا لینے کے بعد برما کے محاذ سے واپس آئے تو اُنہیں انبالہ میں تعینات کیا گیا۔ میں اُس وقت کیمبل پور میں ہی چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُن کے ساتھ انبالہ جانا پڑا۔ انبالہ ہی میں تھا کہ ہند تقسیم ہو گیا اور والد کی یونٹ کے مسلمانوں کو پاکستان بھیج دیا گیا۔ پورے یونٹ کے ساتھ ہم بھی ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے روانہ ہوئے۔ روانگی سے پہلے اور بعد کی کہانی میں نے بڑی تفصیل سے اپنی سوانح (ماں' میں تھک گیا ہوں) میں رقم کی ہے۔ تین دن ہم انبالہ کے ریلوے سٹیشن پر پڑے رہے۔ ایک آدھ دن تو کھانے کے لئے سامان پلیٹ فارم کے ایک مسلمان ہوٹل سے فراہم ہو گیا لیکن اگلے ہی روز اُس ہوٹل کو جلا دیا گیا۔ ہم عین عید کے روز کھانا لینے وہاں گئے تو ہوٹل کی جلی چھت اور دیواروں پر خون کے چھینٹے دیکھ کر حواس کھو بیٹھے۔ تین روز تک گاڑی کے ڈبے ملتے تھے تو انجن نہیں ملتا تھا اور انجن ملنے کی اطلاع آتی تھی تو گاڑی کے ڈبے غائب کر دیئے جاتے تھے۔ خُدا خُدا کر کے تین روز کے بعد گاڑی روانہ ہوئی تو اُسے پٹیالہ کے سٹیشن پر روک دیا گیا کہ کوئی بھی ڈرائیور گاڑی آگے لے جانے کو تیار نہ تھا۔

شام کا وقت تھا جب ہم خرابیٔ بسیار کے بعد لاہور پہنچے۔ ساتھ کے دوسرے پلیٹ فارم پر ہند جانے والی گاڑی کھڑی تھی لیکن تکرار اس بات پر ہو رہی تھی کہ گاڑی مسافروں کو لے جانے کے لئے ہوتی ہے' لاشوں کو نہیں۔ تمام ڈبوں کے فرش اور سیٹیں تازہ تازہ خون سے لت پت تھیں اور ساری ٹرین میں ایک بھی نفس سانس لیتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔

یہ دونوں مناظر ذہن کے پردے پر ایسے نقش ہوئے ہیں کہ میں اُنہیں کھرچنے کی لاکھوں بار کوشش کر چکا ہوں' کامیابی نہیں ہوتی۔ میری عمر اُس وقت دس برس ہی تو تھی لیکن وہ فلم آج بھی چلنے لگتی ہے تو ایک ایک فریم واضح ہو کر مجھے کچوکے دیتا ہے۔ انسان کو حیوان یا شیطان کے روپ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ کاش ہمارے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوؤں نے بھی یہ مناظر دیکھے ہوتے۔۔

☆ مختار احمد سے وقار بن الٰہی بننے کی روداد سے ہمارے قارئین کو آگاہ کیجئے۔

☆☆ ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا' تو میرا کورس کی کتابوں میں بالکل جی نہیں لگتا تھا۔ ہر کلاس سے بھاگ جانا جیسے زندگی کی معراج تھی۔ پھر گروپ بھی ایسا مل گیا جن کو صرف آوارہ گردی سے غرض تھی۔ کالج سے جو وقت بچ جاتا وہ رسائل (زیادہ تر فلمی یا تاریخی اور رومانی ناول) کا مطالعہ مزہ دیتا۔ رسائل خریدنے کے لئے کورس کی کتابیں بیچ دیتا اور کتابیں پھر سے خریدنے کے لئے کیا کرتا' آپ کو کیوں بتاؤں؟ ۱۹۵۵ء میں والد کیمبل پور ٹرانسفر ہو گئے تو میں نے وہاں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت تک میں فلمی اور غیر فلمی خاصا مواد اپنی کھوپڑی میں ذخیرہ کر چکا تھا۔ خود بھی کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے مختار احمد شاد فلمی نام رکھا' پھر خیال آیا' ہر تیسرے بندے کا نام

مختار احمد ہے‘ تبدیل کرنا چاہیے۔وقار چھوٹے بھائی کا نام پکڑا اور والد کو بتائے بغیر الٰہی اُن کے نام سے چُرایا‘ اپنی طرف سے صرف بن شامل کیا اور یوں وقار بن الٰہی بن گیا۔ یہ نام مجھے اِس لئے اچھا لگا کہ اُس وقت تک لوگ صرف خالد بن ولید سے ہی واقف تھے اور بس۔اُس وقت تک میں کئی ایک چھوٹی موٹی کہانیاں لکھ چکا تھا لیکن چھپوانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جولائی میں ایک کہانی کراچی سے شائع ہونے والے بچوں کے ایک ماہنامے ’’بھائی جان‘‘ کو بھیجی جو اگست ۱۹۵۵ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہی میری پہلی تحریر تھی جو شائع ہوئی۔ایک وقت (جلد ہی) ایسا بھی آیا جب ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ہی تنخواہ لینے کے لئے مختار احمد زندہ ہوتا‘ اس کے بعد سارا مہینہ لمبی تان کے سویا رہتا۔۔یاد آیا‘ نکاح کے وقت بھی جاننے والے وقار صاحب پُکار رہے تھے اور میں دستخط مختار احمد کے کر رہا تھا۔۔

☆ دوہرے نام والے اصحاب اکثر دوہری شخصیت کے مالک بھی ہوا کرتے ہیں۔آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟

☆☆ دوہری شخصیت تو نہیں البتہ ایک ہی شخصیت کے دو پہلو یا دو رُخ ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی یا اچنبھے والی بات نہیں۔غور کیجئے تو ہر پہلو میں کئی عناصر یکساں ہوں گے۔مثلاً مجھے دیر سے پہنچنے‘ دیر سے وعدہ پورا کرنے سے سخت نفرت ہے۔کام ٹالنا میرا پیشہ نہیں‘ کسی کی سفارش مجھے گالی لگتی ہے اور۔۔۔ان ساری باتوں پر ادیب‘ معلم اور بیوروکریٹ تینوں یکساں حاوی رہے ہیں لیکن اپنی گھریلو اور ادبی زندگی میں میں بے حد لاپرواواقع ہوا ہوں۔اکثر اوقات کوئی چیز یا کاغذ رکھ کے بھول جاتا ہوں اور پھر پہروں دنوں تلاش کرتا رہتا ہوں۔ یہ بے ترتیبی نہیں تو اور کیا ہے۔اب اس بہانے کی بھی آڑ لے سکتا ہوں کہ ذہن جب دفتری ذمہ داریوں سے فارغ ہوتا ہے تو دوسری سوچوں‘ ادبی اُلجھنوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ باہر بے ترتیبی کی گنجائش نہیں ہوتی جب کہ گھر میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا‘ باہر سہل پسندی ڈبو دیتی ہے لیکن گھر میں۔۔۔

☆ وقار بن الٰہی کے دل و دماغ اور جسم پر کون حکمران ہے‘ ادیب‘ معلم یا بیوروکریٹ؟

☆☆ ادیب میں اپنے شوق‘ لگن اور محنت کے علاوہ جینز میں شامل تخلیقی جرثوموں کی تسکیں کے لئے بنا تھا بلکہ بنا نہیں‘ اس راستے نے مجھے خود ہی جکڑ لیا۔ معلم چونکہ ایم۔اے اپنے اِسی شوق کے تحت کیا تھا‘ موقع ملا تو بن گیا۔ یوں کہئے دو وقت کی روٹی کا بندوبست بھی تو کرنا تھا اور بیوروکریٹ میں کسی کے گھسیٹنے پر بنا۔ یقین کریں‘ بیوروکریٹ بننے کو میرا جی قطعاً نہیں چاہتا تھا لیکن حالات کے مطابق ڈھل جانا مجھے آتا تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی گیا‘ اس ادیب نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ملازمت سے فارغ ہوئے پندرہ برس گذر گئے ہیں‘ ادب میں اپنے آپ کو گُم کرنے کی وجہ سے مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ایک زمانہ گذر گیا ہے۔ادب نے مجھے سوچ‘ ٹھہراؤ اور جانے کیا کیا دیا‘ کتاب آپ کو دیتی ہے‘ آپ سے لیتی کچھ نہیں۔

☆ ۱۹۵۵ء میں آپ نے پہلا افسانہ کس تحریک‘ تاثر اور مواد کی بنیاد پر تحریر کیا‘ اس افسانے کا نام اور پلاٹ کس قسم کا تھا؟

☆☆ یہ واضح کرتا چلوں کہ میں نے تفصیل کے ساتھ منٹو‘ کرشن چندر‘ راجندر سنگھ بیدی‘ بلونت سنگھ‘ احمد ندیم قاسمی کو پڑھ رکھا تھا لیکن میں منٹو کی حقیقت نگاری اور کاٹ سے بیحد متاثر تھا۔ یہ ہمارے ہاں جو کرپشن کی وبا اتنی عام ہوئی ہے‘ اُس زمانے میں جڑ پکڑ رہی تھی۔ ہر کوئی کم سے کم وقت میں سب کچھ نہیں تو بہت کچھ سمیٹ لینا چاہتا تھا البتہ کرپشن کی قیمت میں اتنا پھیلاؤ نہیں آیا تھا‘ لوگ دو چار مُرغ لے کر بھی کام کر دیا کرتے تھے۔ یہ تو مشرقی بنگال کا حادثہ تھا جس کے بعد کرپشن میں لالچ شامل ہوگئی۔ مستقبل کے بارے میں جب بے یقینی بڑھنے لگی تو یہی کرپشن دیکھتے ہی دیکھتے تمام حدیں پار کرگئی۔ کراچی سے روزنامہ ’جنگ‘ کے زیرِ انتظام بچوں کے لئے ایک ماہنامہ شائع ہوتا تھا ’’بھائی جان‘‘ ‘اُسی کے سالنامہ میں یہ مختصر سی کہانی شائع ہوئی ۔یہ میری پہلی تحریر تھی جو شائع ہوئی۔ موضوع وہی have اور have not کا چکر اور ٹکراؤ۔ کہانی مختصر تھی اور میری کہانی کو دوسرا انعام مبلغ چھ روپے دیئے گئے۔ مجھے منی آرڈر کی فیس منہا کرنے کے بعد پانچ روپے چودہ آنے ہی ملے۔لیکن مجھے بے حد وحساب حوصلہ ملا‘ اِطمینان بھی کہ میں لکھ سکتا ہوں۔فوراً بعد اگلی تحریر اُسی برس کراچی کے ہی ایک ماہنامے ’’نقاذ‘‘ میں شائع ہوئی۔ ماہنامہ نیم سیاسی اور نیم ادبی تھا اور مُلک بھر میں پڑھا جاتا تھا‘ ظاہر ہے‘ یہ تحریر رشوت کے خلاف بھرپور احتجاج تھا۔اب یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ادیب کسی برائی‘ کرپشن‘ فراڈ‘ رشوت یا معاشرے میں رواج پا جانے والی کسی بھی برائی کے خلاف احتجاج ہی کر سکتا ہے‘ اُس کی نشاندہی کر سکتا ہے۔اس سے آگے کا کام دوسروں نے کرنا ہوتا ہے۔ مشین کے سارے ہی کل پُرزے کام کریں تو مشین چل سکتی اور چلتی رہتی ہے ورنہ۔۔۔

البتہ میں نے آج تک سوچا ہے نہ ہی مجھے محسوس ہوا ہے نہ اس کی کوئی اہمیت ہے کہ میرے جسم پر کس کا قبضہ ہے؟

☆ ہماری اطلاع کے مطابق آپ کی پہلی کہانی روزنامہ ’’تعمیر‘‘ راولپنڈی میں شائع ہوئی جبکہ آپ کراچی کے پرچے کا ذکر فرما رہے ہیں؟

☆☆ میں معذرت چاہتا ہوں۔پہلی کہانی روزنامہ ’تعمیر‘ میں نہیں‘ بلکہ بچوں کے ایک ماہنامہ ’بھائی جان‘ میں شائع ہوئی تھی جب میں کیمبل پور کے کالج میں پڑھتا تھا۔ تخیل نے اتنی جست لگائی تھی نہ اتنا حوصلہ بڑھا تھا کہ میں کسی بڑے موضوع پر لکھنے کی جسارت کرتا۔ بس ایک سوچ تھی‘ احتجاج تھا بے انصافی کے خلاف‘ معاشرے میں بڑھتی ہوئی تفریق کے خلاف۔ البتہ اُس کی اشاعت کے لئے جتن کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی‘ تحریر بھیج دی اور چھپ گئی۔ قارئین نے کیا تاثر قائم کرنا تھا‘ ہاں! ماہنامہ کی طرف سے انعام کی رقم ضرور ملی۔ (کچھ ہی عرصے پہلے سہ ماہی ’سیپ‘ کے مدیر نسیم درانی اسلام آباد آئے تھے تو وہ بڑی

محبت سے اُن دنوں کا ذکر کر رہے تھے کیوں کہ وہ بھی اُسی زمانے میں 'بھائی جان' میں لکھا کرتے تھے)۔

☆ ہمارے بہت سے بڑے اور نامور ادیب بدصورتیوں اور بے ترتیبی کو زندگی کا حُسن گردانتے ہیں جب کہ آپ کو اُلٹا ٹکٹ' ٹیڑھی لکیر' بدخطی اور بدنظمی سے از حد چڑ ہے؟

☆☆ آپ نے حوالہ چونکہ بڑے ادیبوں کا دیا ہے' اِس لئے میں اُن کی رائے کو تو نہیں جھٹلا سکتا' لیکن یہ تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ بدصورتی اور بے ترتیبی میں اگر حُسن ہے تو پھر آپ ہی کہئے' خوبصورتی اور ترتیب میں کتنا حسن اور دلکشی ہو گی۔ دوسرے ناموروں کے ذاتی احوال میں بدصورتی اور بے ترتیبی ہو سکتی ہے لیکن اُن کی کسی تخلیق میں بدصورتی اور بے ترتیبی ہو ہی نہیں سکتی بصورت دیگر اُس تخلیق کو ن قبول کرے گا یا اہمیت دے گا۔ غور کیجئے تو اوپر آپ نے (یا منشا یاد نے) جو خوبیاں گنوائی ہیں' اُن کا تعلق بھی تحریر سے ہی ہے۔ دوسرے اچھی صورت اور عمدہ ترتیب سے کسی دوسرے کو متاثر ہی کرتے یا کرنا چاہتے ہیں تو کیا کسی تخلیق میں ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا؟ یوں بھی روزمرہ زندگی میں آٹے میں نمک کے برابر سہی' نظم وضبط سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔

☆ امورِ خانہ داری میں آپ کی مہارت کے چرچوں میں کس حد تک سچائی ہے؟

☆☆ اس دعوے میں قطعاً کوئی سچائی نہیں۔ میں چائے بنانے (وہ بھی صرف اپنے لئے) کے علاوہ کوئی گھریلو کام نہیں کر سکتا۔ ہاں! اگر کہیں کوئی بے ترتیبی نظر آ جائے تو ناک بھوں ضرور چڑھا سکتا ہوں۔۔ منشا صاحب نے امور کی تفصیل بھی تو نہیں بتائی۔

☆ سنا ہے' آپ برسوں اعتکاف میں بیٹھے رہے ہیں؟

☆☆ میں نہیں کہہ سکتا' آپ نے اعتکاف کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ آپ وقفوں وقفوں سے غیر حاضری کہہ سکتے ہیں۔ وہ بھی میں جسمانی طور پر غیر حاضر رہا لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر اپنی کہانیوں کے ساتھ ہی جُڑا رہا ہوں۔ نویں دہائی کے آغاز میں میں دو برس کے لئے چین میں تھا لیکن افسانہ وہاں بھی لکھا جو بعد میں 'فنون' کے ایک شمارے میں شائع ہوا۔ لکھنے والا کاغذ قلم سے دور رہ سکتا ہے' اپنی سوچوں' اپنی ذہنی دنیا سے کیسے دور رہ سکتا ہے۔ بعض کہانیاں دس دس اور پندرہ پندرہ برس میری یادداشت میں دفن رہنے کے بعد کاغذ پر اُتری ہیں۔ موجودہ صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ اس برس میرے تین افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں لیکن وہ لکھے گذشتہ برس ہی گئے تھے۔

☆ پنجاب کے دیہی علاقے سے تعلق کے باوجود احباب آپ کو نستعلیق اور شائستہ آدمی گردان کر آپ کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقید؟

☆☆ آپ کیمبل پور کو دیہی علاقہ سمجھیں تو یہ سراسر زیادتی ہے۔ دوسرے اس کا جواب تو تہمت لگانے والوں سے ہی پوچھا جا سکتا ہے۔ پھر میں کیمبل پور میں رہا بھی کتنا ہوں۔ والد چونکہ فوج میں تھے' جہاں جاتے' ہماری سواری بھی ساتھ ہوتی۔ اُنہی کے طفیل ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دیولالی' انبالہ کے علاوہ 'بعد میں سیالکوٹ' کوہاٹ' راولپنڈی کی خاک چھان چکا تھا۔ پڑھنے کے لئے لاہور میں پناہ ملی۔۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ لاہور کے اورینٹل کالج میں داخلہ لینے کے بعد میں اُس وقت کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس حاضر ہوا (اللہ انہیں جنت نصیب کرے' بس اُسی روز ملاقات ہوئی)۔ مولوی نورالحسن عربی کے بلند پائیہ عالم تھے۔ فرمانے لگے۔

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' عرض کیا۔

''کیمبل پور کا رہنے والا ہوں۔'' فرمایا۔

''میرا مطلب ہے' آبائی علاقہ کون سا ہے؟'' پھر عرض کیا۔

''جی' کیمبل پور۔۔۔'' اب وہ جھنجھلائے۔

''عزیزم میرا مطلب یہ ہے کہ کہاں سے ہجرت کر کے آئے ہو۔'' مطلب تو میں اُن کا سمجھ گیا تھا لیکن۔۔۔

''جی' کہیں سے بھی نہیں۔ وہیں میرا گھر ہے۔'' حیران ضرور ہوئے۔ بولے۔

''تمہارا لہجہ اتنا صاف ہے کہ لگتا ہے۔۔۔۔''

ویسے احباب کی جو بھی نیت ہو' آپ کا ارادہ کیا ہے؟

☆ ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج' لاہور سے ملنے والے گولڈ میڈل کی روداد اور اپنے احساسات کی بابت کچھ بتایئے؟

☆☆ ۱۹۵۹ء میں لاہور' ملتان اور راولپنڈی سے ایم۔اے اُردو کا امتحان دینے والوں کی تعداد یہی کوئی نوّے کے قریب تھی (چند برس پہلے صرف لاہور سے اُردو کے شائقین کی تعداد سینکڑوں میں تھی)۔ کالج کے باقاعدہ طالب علم چوبیس یا پچیس تھے جن میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ نتیجہ اخبار میں شائع ہوا' تو پاس ہونے والوں میں میرے نمبر سب سے زیادہ لیکن بمشکل چار سو سے بڑھ کر تھے اور ابھی چار پانچ اُمیدواروں کے نتائج کا اعلان باقی تھا' سو ہم نے' جو مل گیا' اُسی پر اکتفا کیا' اور اپنے دھندے میں مصروف ہو گئے۔ کانووکیشن کے لئے جب دسمبر میں لاہور جانا ہوا' تو یونیورسٹی کی جانب سے دعوت نامہ پا کر پہلے حیرت ہوئی' پھر خوشی' خوشی بھی کیسی کہ سب کچھ بھول گئے۔ میں اُن ہونہار طالب علموں میں سے تھا جنہوں نے پاس ہو جانے کو ہی ہمیشہ معراج سمجھا لیکن اوّل پوزیشن حاصل کرنا وہ بھی ایم۔اے کے امتحان میں' میرے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ دیکھنے والوں کی پروا کئے بغیر جانے کتنے روز وہ میڈل لٹکائے پھرتا رہا۔

☆ آپ کے ہاں کہانی کا سفر دیہاتی' نیم دیہاتی' اور قصباتی حلقوں میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے شہروں کے بڑے مسائل آپ کی توجہ کیوں حاصل نہ کر سکے؟

☆☆ آپ کا کہنا اس حد تک بجا ہے کہ ایک مدت تک میں دیہاتی اور

نیم شہری ماحول کی ہی عکاسی کرتا رہا۔اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھے اتفاق بھی تو دیہاتی اور نیم شہری ماحول میں دن بسر کرنے کا ہوتا رہا ہے۔ایم۔اے کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں بھی ایک عرصہ ہلکے پھلکے شہروں میں بسر ہوا۔اسلام آباد آیا تو برسوں تک یہ شہر بھی تو قصبہ ہی رہا(اب بھی جب کہ عام دنوں میں سڑکوں پر گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آتی ہیں' عید کے دنوں میں یہ شہر اتنا سنسان ہو جاتا ہے کہ گیڈر بھی اس طرف آنے سے انکار کر دیتے ہیں)۔اس عرصے کو آپ پہلے پچیس برسوں تک محدود کر سکتے ہیں۔بعد کے پچیس برسوں میں، میں نے بیجنگ' پرتھ (آسٹریلیا)' امریکہ' جانے کن کن شہروں کے پس منظر میں افسانے لکھے ہیں۔ویسے بھی انسان کے بنیادی مسائل تو ایک جیسے ہی ہیں' خواہ وہ شہر میں رہتا ہو یا قصبے میں۔

☆ ابتدأمیں آپ کے ہاں کہانی سے زیادہ کردار نگاری پر زور دیا جاتا تھا' وقت کے ساتھ آپ کے مزاج اور برتاؤ میں تبدیلی کیوں کر رونما ہوئی؟

☆☆ میرا تو خیال ہے' میں اب بھی زیادہ تر ایسے افسانے ہی لکھ رہا ہوں جو کرداروں کے گرد گھومتے ہیں۔بلکہ اگر یہ کہوں کہ مجھے کردار پڑھنے اور سمجھنے میں خاصی آسانی رہتی ہے۔پھر قریب کے ہی کردار مجھے گھیر لیتے ہیں۔''غلطی' بس ہو گئی'' کا افتخار یا ''چاہ درپیش'' کا آہیر اور ایسے ہی دوسرے بیسیوؤں کردار میرے افسانوں کے کردار بنے ہیں۔اب ظاہر ہے' جن کرداروں کا میں انتخاب کرتا ہوں یا کروں گا' اُن کا کوئی نہ کوئی یا کئی منفی پہلو مجھے ستائیں گے۔میری دانست میں یہ لوگ معاشرے کی لے لوث خدمت کر سکتے ہیں۔لیکن اُن کی ساری کوششیں اُن کی اپنی ذات تک ہی محدود دکھائی دیتی ہیں۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ''بڑے''، جن کے ہاتھوں میں قوم کا مستقبل ہے جو نئی نسلوں کی پرورش میں اہم کردار کر سکتے ہیں' وہی اِن مکروہ کاروائیوں میں ملوث ہیں۔۔

☆ آپ کے ہاں وقت گذرنے کے ساتھ طنزیہ انداز تحریر نمایاں سے نمایاں تر ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میں تفصیل تو اوپر بیان کر چکا ہوں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھی اور میں اپنی سی سر توڑ کوششوں کے باوجود تنکا بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا سکے اور معاشرے' روزمرہ زندگی میں بہتری کی بجائے بگاڑ ہی آتا جا رہا ہے تو ہمارے پاس یہی طنز کے تیر چلانے کا کام رہ جاتا ہے۔یہ بھی نہ کرتے یا کریں تو جانے ہمارا انجام کیسا ہوتا۔۔لکھنے والا معاشرے کو اُس کا مکروہ چہرہ دکھاتا ہے بھر پور اعتراض کے ساتھ تاکہ جو کوئی تبدیلی لانے کے ذمہ دار ہیں' وہ وقتی دعوؤں اور زبانی جمع خرچ سے آگے بڑھیں اور کچھ کر کے دکھائیں۔

☆ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۹ء تک آپ کا سفر حقیقت نگاری ازاں بعد علامت نگاری سے متاثر ہے؟

☆☆ اگر آپ غور فرمائیں تو میرے علامتی افسانے بھی حقیقت نگاری کے ہی ضمن میں آتے ہیں۔بات چونکہ زیادہ چُبھنے والی تھی اور ایک آدھ محکمہ میرے پیچھے بھی تھا' اس لئے مجھے مجبوراً علامت کا سہارا لینا پڑا۔اُدھر علامت نگاری کے گرو اِن تحریروں کو علامت نگاری میں شمار ہی نہیں کرتے کیونکہ میں نے رائج علامتوں سے انحراف کر کے نئی علامتیں استعمال کی ہیں جو اُن کے نزدیک قابلِ معافی جرم نہیں ہے۔مجھے صرف اس بات سے غرض تھی اور ہے کہ میں نے ایک بات کہنی ہے' اپنے پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ شریک کرنا ہے تو اس کے لئے میں جو پیرایئہ بھی اختیار کروں' مجھے قبول ہے۔ہاں! جو کہنا چاہتا ہوں' اُس کا ابلاغ ہونا چاہیئے۔لیکن ایسے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے جنہیں علامت نگاری کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکے۔

☆ ''کس سے کہے وہ'' کے بیشتر افسانوں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ان افسانوں میں آپ نے تلذذ پسند' عشق پسند' منتقم پسند' کمزور' طاقتور عورتوں کے کردار تخلیق کئے ہیں۔آپ ہمیں ان کرداروں میں سے اپنے پسندیدہ کردار کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ آپ کی رائے کے پہلے حصے سے میں کسی حد تک اتفاق کرتا ہوں۔واقعی بیشتر تو نہیں البتہ پانچ چھ افسانوں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔سچ سچ بتایئے ہماری زندگیوں میں کیا عورت کو مرکزیت حاصل نہیں ہے؟ یہ تو ہم جیسے آرام طلب لوگوں کا الزام ہے' بہتان ہے کہ عورت کمزور جنس ہے' مرد سے کم تر ہے وغیرہ' ورنہ آپ ہی بتایئے' اُسے اگر مواقع فراہم کئے گئے اور اُس پر سے فضول کی پابندیاں اُٹھائی گئی ہیں تو اُس نے کہیں مایوس کیا ہے؟ مجھے اگر افسانہ ''کالی عورت'' کی وہ موٹی اور کالی عورت پسند ہے جسے گاؤں سے ایک نوجوان عشق کے جال میں پھنسا بہلا پھُسلا کر بھگا لایا تھا' وہ جب دیکھتی ہے کہ وہ نوجوان اُس کے زیورات لے کر بھاگ رہا ہے تو وہ اُسے قتل کر کے اپنے ساتھ کئے گئے دھوکے کا انتقام لے لیتی ہے تو مجھے ''کس سے کہے وہ'' کی مہر بھی پسند ہے جو مرد کے دھوکے کے سامنے بے بس ہو کر ہر ظلم کو مقدر کا لکھا جان کر قبول کر لیتی ہے۔اِس اقدام کو اُس کی ہار نہ سمجھئے' وہ گلیوں میں بھٹکنے کی بجائے اگر انسپکٹر کی داشتہ بن کے رہنے کو ترجیح دیتی ہے تو یہ بھی ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ایک صورت ہے۔یوں کہیئے' مجھے وہ کردار زیادہ بھائے جو اپنے خلاف ظلم ہوتا دیکھ کر آواز بلند کرتے یا جدوجہد سے کام لیتے ہیں۔

☆ جو لوگ آپ کے ہاں صنعتی ترقی سے خوف کی نشاندہی کرتے ہیں' اُن کے بابت آپ کیا کہیں گے؟

☆☆ میں صنعتی ترقی سے بالکل خوف زدہ نہیں۔ہاں! مادر پدر آزاد ترقی سے ضرور خوفزدہ ہوں۔آپ ہی کہیئے' ہمیں صنعتی ترقی نے کیا نہیں دیا اور اس کائنات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن یہ بھی تو دیکھئے' اس ترقی نے بیروزگاری اور اُس سے جنم لینے والی بے راہ روی نے ہمیں کیا دیا ہے۔ہمیں فوائد اور نقصانات دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔

☆ جمیل آذر صاحب نے جس روز آپ کے اندر منٹو کے اوصاف

تلاش کئے اُس روز آپ کے احساسات کیا تھے؟

☆☆ بھائی جی، جمیل آذر بھلے آدمی ہیں۔ اُنھیں میری سوانح اور چند ایک افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اُنہوں نے یہ رائے قائم کر لی ہے۔ اگر میرے بارے میں وہ یہ رائے رکھنے میں سنجیدہ ہیں تو میں اُنکی رائے کا ضرور احترام کرتا ہوں لیکن حضرت! منٹو بہت بڑے افسانہ نگار تھے، وہ کسی کی پروا کئے بغیر جس سچائی سے کسی خرابی کو پیش کرتے تھے، بالکل ایک سرجن کی طرح جو جسم کے متاثرہ حصے کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے یہ منٹو کا ہی کمال تھا۔ ۱۹۵۵ء میں منٹو کا انتقال ہوا تو میں اُس وقت تک اُن کی تقریباً تمام تحریریں پڑھ چکا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں، میں اُن سے متاثر ہوں اور اس سے زیادہ نہیں۔۔۔ میرے احساسات کیا ہونے تھے، جب اُنہوں نے یہ فرمایا تو میں تقریباً ستر برس کے پیٹے میں تھا، کسی خوش فہمی کا شکار ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن میں اُن کا ممنون ہوں کہ اُنہیں میرے افسانوں میں کسی بڑے کی جھلک دکھائی دی۔۔

☆ اردو ادب کی حد تک یہ فیشن یا وبا عام ہے کہ ہر کوئی اپنے پسندیدہ قلم کار کو کسی نہ کسی بڑے غیر ملکی قلم کار سے مماثل قرار دیتا ہے۔ آپ کے احباب کس بنیاد پر آپ کی تخلیقات کو چیخوف سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں؟

☆☆ اس فیشن اور وبا کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ میں نے چیخوف کی بہت کم تحریریں پڑھی ہیں۔ وہ بھی روس کا حقیقت نگار تھا اور شاید اسی لئے میری تحریروں میں ویسی ہی صفات دکھائی دیتی ہیں۔ ویسے وہ کون سے حضرات ہیں جو اتنی بے تکلفی برتتے اور بیچارے چیخوف کی روح کو آرام نہیں کرنے دیتے؟ آپ نے خود ہی جب اس بھیڑ چال کو وبا کہہ دیا ہے تو میں اس بارے میں کیا عرض کروں؟ کہنے والوں کو کہنے دیجئے۔

☆ آپ کے افسانے کی ابتدا محمد حسن عسکری کی افسانے کے اعلانِ زوال کے بعد شروع ہوتی ہے۔ دریافت ہم آپ سے یہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اردو افسانے کو زوال سے بچانے کے لئے کیا جتن کئے اور اُس کے کیا نتائج رہے؟

☆☆ مجھے آپ کے اِس سوال کا لہجہ اور انداز بہت پسند آیا۔ محسوس بھی ہوا جیسے میں کمرۂ امتحان میں بیٹھا ہوں اور ممتحن یہ پرکھنا چاہتے ہیں کہ میری پہنچ خاص طور پر تاریخ میں کتنی ہے۔۔ سوال نامہ کے جواب دیتے ہوئے مجھے ممتاز مفتی مرحوم بار بار یاد آئے۔ وہ کہتے تھے۔ ''صاحبو! میں نہ تو مورخ ہوں نہ ہی نقاد۔ میں تو سیدھا سادہ افسانہ لکھتا ہوں اور بس۔ اب آپ کی صوابدید پر ہے کہ اُس میں سے آپ کیڑے نکالیں یا پھول۔'' عسکری صاحب اس اعلان سے کیا حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ تو وہی جانیں لیکن کیا اس کے بعد اُنہوں نے خود کچھ نہیں لکھا؟ ادب کی کسی بھی صنف کو آپ کیسے زوال پذیر کہہ سکتے ہیں جب کہ اس صنف میں مسلسل طبع آزمائی کی جارہی ہو، ہیئت میں، نظریات میں، اندازِ نگارش میں آئے روز تبدیلیاں کی جارہی ہوں۔ ہمارے ہاں رسائل (ماہنامے، ادبی، نیم ادبی) کی بڑی تعداد آج کیا شائع کر رہی ہے، کیا وہ صرف شاعری کے سہارے زندہ ہیں؟ میں نے عسکری صاحب کی رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اپنے کام سے کام رکھا، افسانے لکھے جو مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ہاں! نتائج کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ اب بھی لکھا اور خوب لکھا جا رہا ہے۔ کبھی اُس کے ڈھانچے میں سے کہانی غائب ہو گئی تھی لیکن یہ تبدیلی اُسے راس نہ آئی اور ایک بار پھر افسانہ کہانی سمیت لکھا جا رہا ہے۔

☆ وقار بن الٰہی کو اپنے ہم عصروں سے بچھڑا ہوا افسانہ نگار کن معنوں میں کہا جاتا ہے؟

☆☆ بقول حمید شاہد: ''عام، بے ضرر سی کہانیاں، جو کہیں بھی مشتعل نہیں کرتیں، عین ایسے زمانے میں لے آنا کہ راتوں رات شہرت ہتھیانے کا زمانہ بھی بیت چکا ہو، مجھے یہ باور کرانے کے لئے کیا کافی نہیں ہے کہ وقار ہو نہ ہو، اپنے ہم عصروں سے بچھڑا ہوا افسانہ نگار ہے''۔ بات یہ ہے کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت منٹو، کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی اور اے۔ حمید وغیرہ کا شور وغوغا تھا اور وہی افسانے کے میدان پر چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک میں نے لکھا اور بہت لکھا جو پاک وہند کے رسائل میں شائع ہوا۔ پھر کچھ تو ملازمت کی مصروفیات اور کسی حد تک گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے اس رفتار میں کمی آ گئی اور خاصی آئی۔ اب میرے ساتھ ساتھ لکھنے والے نہ صرف لکھتے رہے بلکہ مجموعے بھی چھپوا رہے تھے۔ اسے غفلت ہی کہئے کہ میں نے اس طرف توجہ نہ دی اور صرف رسائل تک ہی محدود رہا۔ قاسمی صاحب، یونس جاوید، منشا یاد ان لوگوں سے جب بھی ملاقات ہوتی، سب کا تقاضا ہوتا کہ اب مجموعہ آنا چاہئے۔ تم لاکھ لکھو اور رسائل میں چھپتے رہو، جب تک کتاب نہیں آئے گی تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا لیکن یہ راہ کسی نے نہ سجھائی کہ میاں مجموعہ تو اپنے پیسوں سے ہی چھپوانا پڑے گا جب کہ میرا خیال یہ تھا کہ لکھنے کو میں نے لکھ دیا ہے۔ اب مجموعہ چھاپنے کا کام کسی اور کو کرنا چاہئے۔ وہ بات بنی نہیں اور مجموعہ آنے میں دیر بلکہ بہت دیر ہو گئی۔ شاید اسی لئے حمید شاہد مجھے بچھڑا ہوا افسانہ نگار گردانتے ہیں۔

☆ آپ کے ناقدین یہ کہنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں کہ وقار اپنے فنی سفر میں زندہ رہنے والی ایک بھی تحریر قلمبند نہیں کر سکے؟

☆☆ پہلی بات تو یہ کہ ناقدین اگر یہ کہتے ہیں تو یہ ان کا استحقاق ہے، کہنے دیجئے۔ اب سوال کا دوسرا حصہ یہ کہہ رہا ہے کہ زندہ رہ جانے والی تحریر۔۔ تو جناب ان ناقدین کی نظروں سے اگر 'نقوش' میں شائع ہونے والا افسانہ ''خالق'' گزرا ہے (جس پر پاکستان ٹیلی وژن نے ٹیلی پلے بھی پیش کیا تھا)، اگر اُنہوں نے ادبِ لطیف' لاہور میں شائع ہونے والا افسانہ ''ستاروں کے خواب'' (اگست ۱۹۵۸ء) پڑھا ہے (علی گڑھ میگزین 'ہماری زبان' نے اس افسانے کو اُس ماہ کا بہترین افسانہ قرار دیا تھا)، اگر اُنہوں نے افسانہ 'بے بسی' اور

'اُترنا دریا میں' پڑھے ہیں (جن کے بارے میں منشا یاد کا کہنا ہے کہ ''وقار نے اگر کچھ اور نہ بھی لکھا ہو تو یہ افسانے اُسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں) اگر اُنہوں نے وہ افسانے پڑھے ہیں جو اکادمی ادبیات' پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والے ہر سال کے 'بہترین ادب' میں شامل ہوئے' یا اُنہیں علم ہوتا کہ کتنے افسانے دوسری زبانوں (ایرانی فارسی' روسی' فرانسیسی' انگریزی' چینی' پنجابی وغیرہ) میں ترجمہ ہو چکے ہیں تو وہ شاید یہ رائے کبھی قائم نہ کرتے۔اس کے باوجود مجھے ان کی رائے کا احترام ہے۔۔یا شاید زندہ رہ جانے والی تحریروں کے اجزائے ترکیبی کچھ اور ہوتے ہوں گے؟ مجھے بہر حال ایک سوال ضرور کھٹکتا ہے کہ کیا کسی افسانے یا تحریر کو بہترین یا زندہ رہ جانے والی قرار دلانے کے لیئے اُس کا لکھنا اور چھپوا دینا ہی کافی ہوتا ہے یا شاید دیگر عوامل کی بھی۔۔۔۔

☆ آپ کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ دوسروں کی تعریف میں بُخل سے کام لیتے ہیں اور اس خاص موقع پر آپ کو بھی منیر نیازی مرحوم کی طرح پیشاب کی حاجت ہونے لگتی ہے؟

☆☆ یہ تاثر بالکل غلط ہے۔میں تعریف کے ڈونگرے برسانے کا قائل نہیں' ہاں! جائز تعریف تو مصنف کا حق ہوتا ہے۔کئی بار اگر کسی محفل میں کسی مصنف کی کوئی تحریر بیحد پسند آتی ہے اور میں رش کی وجہ سے وہاں کچھ نہیں کہہ سکتا تو فون پر اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔اچھی تحریر پر داد تو مصنف کا حق ہوتا ہے اور آپ اُس سے اُسے کیسے محروم کر سکتے ہیں۔۔

☆ لکھنے کی ابتدا کے سینتیس سال یعنی ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۲ء پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہونے کا سبب اور نقصان کی بابت اپنے خیالات سے آگاہ کیجئے؟

☆☆ اسباب میں سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ مجھے فرصت ہی نہیں ملی کہ توجہ دیتا۔دوسرا سبب یہ کہ میرے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ بڑے بڑے مصنفین بھی جب تک کسی پبلشر کی 'خدمت' پر آمادہ نہ ہوں' مجموعہ نہیں چھپ سکتا اور میری بے وقوفی یہ کہ مجموعہ شائع کرنا ہے تو پبلشر خود کرے' مجھے کیا پڑی ہے جو میں۔۔۔اور تیسرا سبب میری خام خیالی پر مبنی یہ سوچ کہ اگر اپنے پیسوں سے ہی مجموعہ شائع کرانا ہے تو میں یہ پیسے اپنے بچوں پر کیوں نہ خرچ کروں۔۔۔چنانچہ دیر ہوتی گئی اور میرے دو مجموعے (''کس سے کہے وہ'' اور ''اُترنا دریا میں'') ایک ساتھ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئے۔۔اِن کا کیا حشر ہوا' یہ کہانی بھی سن لیجئے۔۔پہلا مجموعہ ''کس سے کہے وہ' اسلام آباد کے ایک صاحب نے شائع کیا۔وہ خود کسی سرکاری ادارے میں کام کرتے تھے۔ادارے کا کام ہی تحقیق اور تصنیف کا تھا۔اُن کی لکھوائی گئی چار پانچ کتابیں چھپواتے تو ایک کتاب رشوت کے طور پر اپنی بھی چھپوا لیتے۔میرا مجموعہ بھی اسی انصرام کے تحت شائع ہوا' لیکن پبلشر کا نام اور ادارہ موصوف کی بیگم کا تھا۔میری (یا اُن کی) قسمت کہ کتاب کے شائع ہونے کے فوراً بعد اُن کا بیگم کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور بات طلاق تک پہنچی' ساتھ ہی ان کی ملازمت بھی جاتی رہی (یقین کیجئے' اُن کی طلاق یا ملازمت سے فراغت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا) چنانچہ اُنہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب مع چند ایک دوسری کتابوں کے ردی والے کے پاس بیچ دیں۔۔ دوسری کتاب ''اُترنا دریا میں' لاہور سے اسلم گورا نے شائع کی۔کتاب تو شائع ہو گئی اور مجھے رائلٹی میں کتاب کی چند ایک کاپیاں بھی مل گئیں لیکن اسلم گورا جو کچھ کر رہے تھے' (شاید اسٹاک ایکس چینج میں شیئرز کی خرید وفروخت کا دھندہ۔ اپنے علاوہ دوسروں کا مال بھی دوسروں کے کہنے پر داؤ پر لگاتے) اُس میں اُنہیں اچانک گھاٹے اور شدید گھاٹے کا سامنا کرنا پڑا' چنانچہ وہ بھی کتابیں پھینک پھانک کر غائب ہو گئے (ان دونوں حضرات کے غیر متوقع حادثات میں میں یا میری کتابیں کسی طور ملوث نہیں تھیں)۔۔میری دانست میں لکھنا' کتاب ترتیب دینا' اور کتاب چھپوانا یہ سارے مختلف دھندے ہیں۔میں پہلا کام تو کر ہی رہا تھا لیکن دوسرے کام۔۔میرے بس میں نہیں تھے۔

☆ سب سے پہلے تیسری پھر دوسری ازاں بعد پہلی کتاب چھپوانے کی منطق کیا ہے؟

☆☆ یاروں کا خیال تھا' ۵۶' ۵۷ میں لکھے گئے افسانوں کا ۱۹۹۲ میں چھپنا عجیب اور بے وقت کی راگنی لگتا ہے' اس لئے ترتیب اُلٹی کر لیتے ہیں سو کر لی گئی لیکن جو حشر ہوا' وہ میں بیان کر چکا ہوں۔

☆ کیا آپ کے افسانوی مجموعوں میں زمانی تقسیم کا سبب بھی اندازِ فکر کی تبدیلی تو نہیں؟

☆☆ جی نہیں' جب طے کر ہی لیا کہ مجموعہ شائع ہو تو پھر ایک مجموعہ تو ممکن نہ تھا۔چنانچہ ۹۲ء تک شائع شدہ افسانوں کو کسی زمانی تقسیم کے بغیر دو حصوں میں بانٹ دیا تا کہ اشاعت میں آسانی ہو۔۔اِسی طرح تیسرے مجموعے میں وہ افسانے شامل ہیں جو ۵۶ء اور ۶۲ء کے درمیان شائع ہوئے۔چوتھے مجموعے میں ۹۳ء سے ۲۰۰۰ء تک شائع ہونے والے افسانے جگہ پا سکے ہیں اور اب پانچویں مجموعے میں ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۱ء تک کی شائع شدہ تحریریں شامل ہوں گی۔۔یہ کوئی زمانی تقسیم نہیں' سہولت کے پیشِ نظر چند برسوں کے دوران شائع شدہ تحریریں شامل کی گئی ہیں۔۔

☆ ایک زمانے میں یہ بھی رواج عام تھا کہ اہلِ قلم کسی نہ کسی ''سکول آف تھاٹ'' سے وابستہ ہو کر اُس کی بہت تشہیر کیا کرتے تھے۔آپ کے ہاں اس حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟

☆☆ پنڈی گھیب اور کیمبل پور کے سکول تو ابھی تک ذہن سے اُترے نہیں' کسی اور سکول کے بارے میں سوچنا کیا؟ رہ گئے تھاٹ اور تشہیر تو صاحب کہاں کا تھاٹ اور کیسی تشہیر۔۔

☆ کچھ اسی طرح کا سوال حلقوں' گروپوں اور جتھوں کے حوالے سے بھی کرنا لازمی ہے۔

☆☆ اور میرا جواب بھی وہی ہے جو میں اس سے پہلے سوال کے جواب میں دے چکا ہوں۔البتہ کسی زمانے میں حلقہ اربابِ ذوق کی سرگرمیوں میں شرکت کرنے کا بڑا شوق تھا لیکن وہ بھی اس حد تک کہ منشایا دالیکشن جیت جائے اور محفلیں وقت پر منعقد ہوں اور بس۔

☆ آپ کے ساتھ اور آپ کے بعد لکھنے والوں کا حلقہ اثر اندرون اور بیرون ملک دور دور تک پھیل چکا ہے اور آپ ابھی تک راولپنڈی اور اسلام آباد سے باہر نہیں نکل پائے ہیں؟

☆☆ آپ حقیقتِ حال سے بخوبی واقف ہیں لیکن کہلوانا اور سننا مجھ سے چاہتے ہیں۔میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے شہرت کا پہلے ہوکا تھا نہ اب ہے۔لکھتا میں اس لئے ہوں کہ کچھ نہ کچھ مجھے تنگ کرتا اور ستاتا ضرور ہے' کوئی معاشرتی کج روی' بے راہ روی یا معیار سے گری ہوئی حرکات' انسان کی تذلیل وغیرہ' میں اُسی کے بارے میں لکھتا اور قاری کو بتانے' شامل کرنے کے لئے چھپواتا ہوں۔میرا کام اشارہ کر دینا ہے' نشاندہی کرنا ہے' کوئی نہ کوئی سمجھتا تو ضرور ہوگا۔بس یہی کافی ہے' مجھے اس سے زیادہ کی خواہش ہے نہ طلب۔۔۔جو بڑے بڑے نام اندروں اور بیرون ملک مشہور ہو چکے ہیں' کبھی آپ نے اُن سے پوچھا ہے کہ۔۔۔جانے دیجئے' آپ مجھے جس طرف لے جانا چاہتے ہیں' میں اُدھر جانے کو تیار نہیں۔ہاں! راولپنڈی اور اِسلام آباد میں کم از کم کیمبل پور تو شامل کر لیجئے۔

☆ جب شہرت ریوڑیوں کی طرح بٹ رہی تھی' اُس وقت آپ گہری نیند سوئے رہے اور جب چڑیاں سارا کھیت چگ گئیں تو آپ انگڑائی لیتے ہوئے نیند سے جاگ کر یکے بعد دیگرے افسانوی مجموعے اور خودنوشت چھپوانے میں مصروف ہیں؟

☆☆ مجھے حمید شاہد کے اس بیان سے اتفاق نہیں۔پہلی بات تو یہ کہ شہرت اب بھی بٹ رہی ہے لیکن پہلے ریوڑیوں کے بھاؤ بٹی نہ اب اس بھاؤ بٹنے کی کوئی گنجائش ہے۔دوسری بات یہ کہ چڑیوں کے چگ جانے کا ذکر کریں گے تو آپ شہرت کو داؤ پر لگا رہے ہیں جیسے یہ کوئی گھٹیا سی شے ہو۔۔۔میں اپنی تحریریں اب چھپوا رہا ہوں تو میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو کچھ لکھا وہ کسی نہ کسی طور محفوظ ہو جائے۔تیسری بات یہ کہ تھوڑے بہت پیسے اب میں بھی اس کام کے لئے خرچ کر سکا اور کر رہا ہوں۔۔۔میں کتنی بار اور کس کس کو کہاں کہاں کہوں کہ شہرت میرا مسئلہ کبھی رہا ہے نہ ہے۔۔۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ سرکاری ذمہ داریوں کے سلسلے میں ہمیشہ تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار رہے' اس کا کوئی سبب یا جواز آپ یا آپ کے مخالفین کے پاس ضرور ہوگا؟

☆☆ میں کالج میں تھا یا وزارت میں یا مختلف شہروں میں امتحانات کے سلسلے میں' ہر جگہ میرا رویہ ایک جیسا ہی رہا۔کوئی کتنا بھی مشکل یا کٹھن کام ہوا گر مجھے یقین ہو جاتا کہ وہ کام درست ہے اور ہونا چاہئے تو میں نے کبھی کسی کی مخالفت کی پروا نہیں کی۔اُس کام کو پورا کرنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں لیکن اگر مجھے معمولی سا بھی شک ہو گیا یا کسی نے سفارش کر دی تو جان لیجئے' وہ کام کبھی نہیں ہوگا۔مجھے اِطمینان یہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی کہ اپنی حدود سے نہ بڑھوں۔وزارت میں چوبیس برس گذارنے کے بعد میں جب فارغ ہوا تو میرے بارے میں ہر کسی کی رائے یہی تھی کہ میں کسی کا کام نہیں کرتا۔یہ رائے کسی نے نہ دی کہ میں نے کبھی کسی کام میں کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔کام کرنے کے سلسلے میں بھی تھوڑی سی ترمیم کی ضرورت ہے کہ میں' کسی کا ضابطے کے خلاف کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔کالجوں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا کہ تینوں جگہ میں اپنی کوششوں سے گیا لیکن وزارت میں میرا خیال ہے کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جہاں کی میں نے سیر نہ کی ہو۔(غلط) کام کرنے کے سلسلے میں میرا رویہ یہی تھا کہ کام نہ کرنے پر مجھے زیادہ سے زیادہ کیا سزا ملے گی کہ ایک ونگ میں سے مجھے دوسرے ونگ میں بھیج دیں گے تو اس سے کیا فرق پڑے گا' چنانچہ صرف سیر ہی نہ کرائی گئی بلکہ مجھ سے کئی درجے نیچے حضرات مجھ سے پہلے ترقی حاصل کرتے گئے۔ایسی داستانیں ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہیں' اس لئے چُپ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

☆ آپ تو بڑے ٹھنڈے میٹھے آدمی ہیں' پھر پروفیسر انور بخشی مرحوم سے آپ کو کیا تکلیف پہنچی کہ آپ ہاتھ دھو کر اُن کے پیچھے پڑ گئے

☆☆ اس رائے کے لئے کہ میں ٹھنڈا میٹھا آدمی ہوں' بے حد شکریہ۔(اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کتنا میٹھا ہوں' ہاں ٹھنڈا ضرور ہوں) نور بخشی مرحوم ہمیں ایف۔اے میں فارسی پڑھایا کرتے تھے (یہ شاید ۱۹۵۴ء کی بات ہے)۔سادہ مزاج کے آدمی تھے' کلاس میں آتے تو کتاب کھولتے ہی اُس میں گُم ہو جاتے۔ہم جیسے لفنگوں کو کھُلی چھُٹی مل جاتی۔ہم اِطمینان سے بنچ کی درزوں میں بلیڈ پھنسا کر سارا پیریڈ جلترنگ بجاتے رہتے (یہ کام ڈاکٹر سلیم اختر بھی کیا کرتے تھے)۔ظاہر ہے اِس حرکت کے پیچھے سوائے شرارت کے اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔پکڑے بھی گئے' اگر ڈاکٹر صفدر حسین اس روز اچانک نہ آ جاتے تو شاید ہمارا علم حاصل کرنے کا جذبہ اور پروگرام ادھورا ہی رہ جاتا۔

☆ راجندر سنگھ بیدی جیسے بڑے افسانہ نگار نے ساٹھ سالہ فنی سفر میں کل ستاسی افسانے لکھے جب کہ آپ پچاس سال میں دو سو سے زائد افسانے تحریر کر چکے ہیں؟

☆☆ اجازت دیں تو حساب کتاب میں درستگی کر لیں۔دو سو سے زائد میری کل تحریریں ہیں' افسانے نہیں۔بہت سی تحریریں فیچر ہیں یا معلوماتی مضامین۔لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں چند ٹکے کمانے کے کام آتے تھے۔۔افسانے گننے بیٹھوں تو ڈیڑھ سو بھی مشکل سے ہی بنیں گے۔اب اُن میں سے بھی انتخاب کرنے لگوں تو پچاس سے زیادہ نہیں بنیں گے۔یہی تعداد بہت

ہے۔ابتداً میں باڑھ کی سی کیفیت تھی' رسالوں میں نام پڑھ کر اچھا بھی لگتا تھا۔رسائل کے مدیرانِ کرام بھی دم نہیں لینے دیتے تھے۔ایسے میں معیار کا کوئی کیا خیال رکھتا۔پھر بیدی تو بیدی تھے' آپ نے گنگوا تیلی کو کہاں اُن کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

☆ آپ کے ہم عصر بلکہ جونیئر لکھنے والوں پر بڑے بڑے ناقدین نے لکھ لکھ کر دفتر بھر مارے جبکہ آپ کی جانب اُنہوں نے آنکھ بھر کر دیکھنا بھی مناسب نہ جانا۔آپ کے خیال میں اس کا ذمہ دار کون ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ میں یہ لکھ کر جان چھڑا سکتا ہوں کہ اس میں قصور تو میرا ہی ہے یا یہ کہ حضور' آپ اُن سے ہی پوچھئے جو دفتر کے دفتر لکھتے یا لکھواتے ہیں۔۔سچ جانیں' میں نے کبھی اس کی ضرورت سمجھی نہ اہمیت دی' نہ بے حساب کتابیں چھپوائیں' نہ اُنہیں سپلائی کیں۔اب ناقدین کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ بیٹھ کر رسالوں کی ورق گردانی کرتے رہیں۔۔دوسرے مجھے شُبہ ہی ہے کہ میری نام نہاد بیوروکریسی یعنی وزارت میں موجودگی نے بھی مجھے خاصا نقصان پہنچایا۔ہر کسی نے مجھے بیوروکریٹ سمجھ لیا اور بدکا رہا یا میرے خلاف نام نہاد عناد پالے رکھا' جب کہ میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ میں اس ڈینگی کا شکار نہیں ہوا۔۔چلئے' کسی کو کسی بھی وجہ سے میرے پاس آنے میں تامل تھا تو میں ہی کسی کے پاس چلا گیا ہوتا' یہ بھی نہ ہو سکا کہ مجھے بھی ہجوم سے' کسی کے پاس جانے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔۔رہی بات آنکھ بھر کر نہ دیکھنے کی تو۔۔ہو سکتا ہے' اُن کی آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہو۔۔۔یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اِدھر چمک اِتنی زیادہ ہو کہ دیکھنے والے کی نظریں تاب ہی نہ لا سکتی ہوں۔۔

☆ ہمارے ملک میں بہت سی زیادتیوں' ناانصافیوں کی شکل میں علاقائی زبانوں کی حق تلفی کی زیادتی بھی شامل ہے۔آپ کے خیال میں اس کا سبب کیا ہے؟

☆☆ ہماری سرکاری زبان انگریزی اور قومی زبان اُردو ہے۔علاقائی زبانوں کے لئے دفتر کے دفتر موجود ہیں' وہ بھی زبانی' زیادہ تر سیاستدانوں کے۔ظاہر ہے' علاقائی زبانوں کے ساتھ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔علاقائی زبانوں میں جو بڑی بڑی زبانیں ہیں اُنہیں نمائندگی ملنی ہی چاہئے۔اُردو کو قومی نہیں بلکہ رابطے کی زبان کہہ لیجئے۔کہ اب اُردو' ٹوٹی پھوٹی سہی' ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے' اُردو سمیت باقی زبانوں کو بھی قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔لیکن صرف احکام ہی نہ جاری کئے جائیں۔ضروری ہے کہ سکولوں میں پہلی پانچ جماعتوں تک علاقائی زبان اور اُردو پڑھائی جائے اور چھٹی جماعت سے انگریزی اور اُردو۔۔علاقائی زبانوں کو اسکولوں میں رائج کرنے سے بھی بہت سے فتنے اپنی موت آپ مر جائیں گے۔۔لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کرے کون۔۔۔۔

☆ کبھی آپ کو ''ماں بولی'' کے حوالے سے اپنی کوتاہی کا احساس یا اُس کی خدمت کی خواہش دل میں پیدا ہوئی۔

☆☆ کوتاہی نہیں زیادتی کا احساس ہوا' اور بار بار ہوا' لیکن ایک نہیں بہت سے عوامل ہیں جو راستے کا پتھر بن جاتے ہیں۔ہوش سنبھالا تو گھر میں سبھی پنجابی بولتے تھے' ہم نے بھی وہی زبان تو تلائی' بولی اور اُسی میں زندگی بسر کرنے لگے۔چھٹی جماعت تک تو ٹھیک تھا' پھر ایک نئی زبان کا آغاز پہلی جماعت سے ہی ہو گیا تھا' اب اُس نے پر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔بی۔اے میں پہلی بار ذرا سنجیدگی سے اس زبان سے آشنا ہوئے۔ایک زمانہ بیت گیا' اِسی بولی کے غلام ہو کر رہ گئے۔۔کبھی کالج کے زمانے میں خیال آیا تو پنجابی میں اگر لکھا نہیں تو اپنی بعض تحریروں کا ترجمہ ضرور کیا جو روزنامہ 'امروز' کے پنجابی صفحہ پر شائع بھی ہوا' لیکن یہ کوئی مستقل کام نہ تھا۔۔بات یہ ہے کہ اگر ماں بولی کو اختیار بھی کر لیں تو ہم غریب لوگ ہیں' تعلیم اسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ ٹوٹی پھوٹی ملازمت مل جائے گی اور یوں زندگی بسر کرنے کا سامان ہو جائے گا۔اب ہم میں سے جو زیادہ پڑھ گئے' اُنہوں نے ایک اور زبان میں شُد بُد حاصل کر لی' اُنہوں نے اعلیٰ ملازمتیں سنبھال لیں' پیچھے رہ جانے والوں کو بچی کھچی ملازمتیں یا دوسرے شعبوں میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔۔عرض کیا نا' سارا معاملہ روٹی کا ہے۔آپ پنجابی کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائیں' چیدہ چیدہ مضامین کو پنجابی میں منتقل کر دیں' پھر وہ بھی پنجابی میں پڑھانا شروع کر دیں' دفاتر اور عام شعبوں میں کام پنجابی میں ہونے لگیں تو بات بن سکتی ہے۔۔لیکن یہ سب کچھ یہ سوچ کر نہ کیجئے کہ نتائج دو نہیں تو چار برسوں میں ہی حاصل ہو جائیں گے' ایسے کاموں میں کئی کئی عشرے بھی بیت جاتے ہیں۔چین کے ایک سکول میں جانے کا اتفاق ہوا' تجسس تھا کہ انہوں نے مضامین چینی میں منتقل کر لئے ہیں' دیکھیں تو' یہ منزل کیسے طے کی گئی۔سکول کی ایک اعلیٰ جماعت میں اُستاد سائنس پڑھا رہ تھے۔ہم نے بھی وہ کتاب پکڑ لی۔ہم بھی جان گئے کہ سبق کس موضوع کے بارے میں ہے کیونکہ عبارت تو چینی زبان میں تھی لیکن سائنسی اصطلاحات انگریزی میں درج تھیں۔یہ میں اُس ملک کی بات کر رہا ہوں جو ہم سے پہلے آزاد ہوا' اور جہاں اپنی زبان میں پڑھانے کی کوششیں کئی عشروں سے کی جا رہی ہیں۔بعض صوبوں میں مادری زبان (سندھ میں سندھی اور خیبر میں پشتو اور بلوچستان میں شاید بلوچی) اور اسی زبان میں ایک منزل تک چند مضامین پڑھائے بھی جا رہے ہیں لیکن کیا حاصل ہوا' اس کا اندازہ کرنے کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔۔لیکن اس مشکل پر بھی توجہ دیجئے کہ خیبر میں اگر پشتو پڑھائی جا رہی ہے تو ہزارہ میں لوگ کیوں پشتو پڑھیں' سندھ میں سندھی رائج ہے تو اُردو بولنے والے سندھی کیوں پڑھیں (یا پڑھیں تو کتنی زبانیں پڑھیں؟ اس طرح تو زبان ایک بھی نہیں آئے گی)۔۔۔یہی صورتِ حال ہر صوبے میں ہے۔حکومتیں شاید لسانی مخالفت اور اس سے پیدا ہونے والی کدورتوں سے ڈرتے ہوئے کوئی قدم اُٹھانے سے گریزاں ہوتی

ہیں۔۔۔طالب علم پر بوجھ ضرور پڑے گا لیکن چند درجوں تک مادری زبان کے علاوہ رابطے کی زبان (یعنی اُردو) پڑھایئے پھر مادری زبان کو چھوڑ کر رابطے کی زبان اور انگریزی شروع کر دیجئے۔میٹرک کے بعد وہی صورت ہو جو آجکل ہے۔۔میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ماں بولی پڑھانے کے کام کا آغاز تو کیجئے۔

☆ کچھ روداد اپنی سیاحت یعنی امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، چین، نیپال اور سعودی عرب کے حوالے سے بتایئے، کب کب اور کن وسیلوں سے گئے اور وہاں سے کیا کچھ لے کر آئے؟

☆☆ بیشتر ممالک میں کارِسرکار سے ہی جانا ہوا اور اس قسم کے پھیروں میں سوائے بھاگ دوڑ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض ثقافتی پھیروں کے بارے میں میں ہمیشہ ذہنی طور پر پریشان ہی رہا ہوں۔یہ ثقافتی پھیرے رومانیہ، روس، وغیرہ کے تھے، آپ ہی کہئے کیمونسٹ ملک سے آپ کیا حاصل کریں گے۔امریکہ میں دو بار گیا، پہلی بار مقصد یہ تھا کہ پاکستانی طالب علم جو وہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے ہیں اُن کے لئے آسانیاں کیسے پیدا کی جائیں، دوسری بار میرا جانا ذاتی نوعیت کا تھا۔برطانیہ میں کئی بار گیا۔مقصد وہی اپنے طالب علموں کے داخلوں کے لئے مواقع تلاش کرنا تھا۔فرانس، روس، یونان، ایران، نیپال، آسٹریلیا وغیرہ میں ثقافتی تبادلوں کے تحت جانا ہوا۔مقصد بس گھومنا ہی ہوتا تھا۔اُن ممالک سے بھی تو ثقافتی تبادلوں کے تحت وفود آیا کرتے تھے اور آتے ہیں۔۔چین کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل۔۔۔۸۰/۷۹ میں چین سے ایک ثقافتی طائفہ آیا تھا جس نے تمام بڑے شہروں میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔میں وزارتِ ثقافت کی طرف سے اُن کے ساتھ تھا۔حیدر آباد پہنچے تو ایک رات مقامی کونسل کے جو صاحب ہر آئٹم کے تعارف کے لئے مقرر تھے، کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔پریشانی تو ہوئی کہ اتنے کم وقت میں اور کوئی انتظام ممکن بھی نہ تھا، مجبوراً میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔۔مظاہرہ ختم ہوا تو ایک چینی فنکار نہایت محبت سے کہنے لگے۔''تم ریڈیو بیجنگ کی اُردو سروس میں کیوں نہیں آتے۔''میں صرف مُسکرا دیا۔۔چند ماہ ہی گذرے تھے کہ چین کے ریڈیو کی طرف سے باضابطہ دعوت نامہ موصول ہوا۔چند ماہ بعد میں دسمبر ۱۹۸۰ء میں بیجنگ کے لئے نکلا اور دو برس وہاں گذارنے کے بعد ۱۹۸۲ میں واپس وزارت تعلیم میں پھر سے کام کرنے لگا۔۔اور سعودی عرب تو میں کئی بار جا چکا ہوں، حج کے لئے صرف ایک بار اور عمرے کے لئے کتنی بار، اب یاد نہیں۔

آپ کے سوال کا ایک حصہ رہ گیا کہ میں وہاں سے کیا لایا۔امریکہ سے میں ایک افسانہ لایا تھا، چین سے بھی ایک ہی اور بس۔مکہ اور مدینہ میں کئی بار پیاس بجھانے کی کوشش کی، بُجھائی بھی لیکن پیاس ابھی تک ہے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوا کرتا ہے۔آپ کے پیچھے تو ماشاءاللہ دو خواتین (والدہ اور اہلیہ) کا ہاتھ رہا ہے۔اس حوالے سے آپ ایسا کچھ کہنا چاہتے ہیں جو اپنی خودنوشت سوانح میں نہ کہہ پائے ہوں؟

☆☆ اِن دو خواتین کے بارے میں مجھے جو کہنا تھا، وہ میں اپنی خودنوشت میں کہہ چکا۔اس میں اضافہ کیا کروں، کروں گا تو منہ کا ذائقہ ہی جاتا رہے گا۔ماں کو گئے سات برس ہو گئے، کبھی لگتا ہے، پچاس برس ہو گئے ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے، وہ گئی ہی کہاں ہیں؟ ابھی فون آئے گا اور وہ پوچھیں گی ''احمد، کیسے ہو؟'' اور بیگم۔۔۔تو مجھے یہ ماڈل کچھ پرانا لگتا ہے، ستر برس بھی نہیں چل سکا۔ان دنوں وہ گھٹنوں کے درد میں مبتلا منہ سے کچھ کہتی تو ہے نہیں، لیکن میں سوچتا ہوں، کہیں اس کا میں ذمہ دار تو نہیں، لیکن میں نے کب کہا تھا، اُنہیں تو اپنے کام خود کرنے کا مرض تھا، اب بھی ہے۔۔۔۔

☆ فنکار تو معاشرے کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا ہے جبکہ آپ نے اپنی خودنوشت کا عنوان ''ماں، میں تھک گیا ہوں'' تجویز کر کے اپنی تھکن کا اعلان کر دیا ہے، کون سی تھکن جسمانی یا ذہنی؟

☆☆ میں نے تھکن کا ہی اعلان کیا ہے، فرار کا نہیں۔تھوڑا سا ستا لوں تو یہ سفر پھر سے شروع ہو جائے گا۔۔اِنتظار کیجئے، پانچواں مجموعہ میں ترتیب دے چکا ہوں۔۔

☆ آخیر میں آپ ہمارے قارئین سے کچھ کہنا پسند فرمائیں تو ہمیں خوشی ہوگی؟

☆☆ اتنے ڈھیر سارے سوالوں کے جواب دینے کے بعد مجھے حضرتِ غالب کا ایک شعر بار بار یاد آ رہا ہے:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

۔ نوبل 2010 ۔

15 اپریل 1931 کو اسٹاک ہوم میں پیدا ہونے والے سویڈن کے اسّی سالہ معروف شاعر ٹرانس ٹرومر کو ادب کے نوبل انعام 2010 کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔دس شعری مجموعوں کے خالق ٹرانس ٹرومر کا پہلا شعری مجموعہ تیئس سال کی عمر میں اُس وقت سامنے آیا جب وہ یونیورسٹی میں نفسیات کے طالب علم تھے۔ٹرانس ٹرومر نے نوبل کے ادبی انعام سے پہلے متعدد ایوارڈ حاصل کئے جن میں بونز ایوارڈ، پیٹری آرک پرائز، ورنورڈک پرائز سمیت متعدد ایوارڈ شامل ہیں۔ان کی شہرت و ناموری کو دیکھتے ہوئے اُن کے نام پر ''ٹرومر ایوارڈ'' کا اجراء بھی ہو چکا ہے۔زندگی کے آخری ایّام میں شاعری کے علاوہ ٹرومر پیانو سے شغف رکھتے ہیں وہ بہت اچھے پیانو نواز اور فرد کی شناخت کے بہت بڑے حامی گردانے جاتے ہیں اور یہ ہی اُن کی شاعری کی بنیاد ہے۔

عداوت ہی سہی۔۔۔۔

منشایاد

(●)

وقار بن الٰہی ایک باوقار اور سگھڑ عورتوں کی طرح سلیقہ شعار آدمی ہے۔ میں نادان دوستوں کو پسند کرتا ہوں' اِس لئے وہ میرا دشمن بلکہ سوکن ہے۔

وہ ایک عجیب وغریب آدمی ہے۔غریب تو وہ خیر اتنا نہیں جتنا عجیب ہے۔دیکھنے میں معقول' اِس عہدِ زیاں میں بھی با اصول' باہر سے نرم اور سادہ' اندر سے پیچدار بلکہ خاردار' امورِ خانہ داری و دفتری میں ماہر۔سرکاری افسر ہوتے ہوئے بھی وزیروں' امیروں سے الرجک اور ادیب ہوتے ہوئے شہرت سے بے نیاز۔پنجابی ہوتے ہوئے نستعلیق اور ٹائم ٹیبل کے مطابق زندگی گزارنے والا۔بظاہر سنجیدہ' بہت کم بولنے والا لیکن بے تکلف دوستوں خصوصاً اپنے چپڑقناتی دوستوں کی محفل میں سب سے زیادہ چہکنے والا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی لطیفے' چٹکلے کا غبارہ چھوڑنے والا' لفافے پر اُلٹا ٹکٹ' کاغذ پر ٹیڑھی لکیر اور کتے کی سیدھی دم دیکھ کر رنجیدہ ہو جانے والا۔معاشرتی خرابیوں' سیاست کی بداعمالیوں اور انسان کی تحقیر پر کُڑھنے والا' بیگم کی پسند کا لباس پہننے کے باوجود خوش لباس' دنیا بھر کی سیاحت کرنے کے باوجود صاف بلکہ ہمارے قومی انتخابات کی طرح شفاف' گندم جیسی رنگت کے باوجود خوش شکل' دوستوں اور رشتہ داروں میں ہر دلعزیز' اپنے ساتھیوں میں خوش نصیب اور برسوں ادبی اعتکاف میں بیٹھے رہنے کے باوجود کامیاب ادیب لیکن میرا ازلی اور جنم جنم کا دشمن اور رقیب۔ایسا عجیب آدمی چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی ضرور مل جائے گا۔چھوٹے شہروں میں یہی خرابی ہوتی ہے' نام پتہ معلوم نہ بھی ہو تب بھی ہر پھر کر بار بار ملاقات ہو جاتی ہے۔

وہ خود ہی نہیں' اُس کا نام بھی عجیب ہے۔شاعر ادیب لوگ اپنے ادبی نام کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے۔آرٹسٹوں اور کاتبوں سے طرح طرح کے نام لکھواتے (اب کمپیوٹر کے مختلف فونٹس میں کمپوز کرتے کراتے) ہیں۔غزل بے شک بے وزن چھپ جائے' افسانے کا کوئی پیرا گراف چھپنے سے رہ جائے' معاف کر دیں گے مگر نام چھپنے میں اونچ نیچ ہو جائے تو ایڈیٹر کو کبھی نہیں بخشیں گے۔مگر یہ عجیب آدمی ہے۔ہاتھی کے دانتوں کی طرح اس کے کمانے کا نام اور ہے اور چھپوانے کا اور۔دفتر میں فون کرو تو پتہ چلے گا پورے محکمے میں وقار بن الٰہی کے نام کا کوئی آدمی نہیں۔گھر کا پتہ پوچھنے نکلیں تو محلے کے اور کئی گھروں سے طرح طرح کے وقار نکل آئیں گے مگر اس اللہ کے بندے کا سراغ نہیں ملے گا۔میں انہیں اگر کبھی خط لکھوں یا کوئی دعوت نامہ پوسٹ کروں تو لفافے پر وقار بن الٰہی معرفت مختار احمد لکھتا ہوں اور حالانکہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی پتا نہیں ہلتا مگر یہ وقار بن الٰہی ہے۔بعض لوگ جنہیں وقار سے سفارش وغیرہ کا کوئی دفتری کام پڑ جائے تو وہ ان کے نام کی شروع' ؤ کو' ب' سے بدل دیتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وقار ان کے چھوٹے بھائی کا نام ہے یعنی انہوں نے برادرِ بزرگ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے برادرِ خورد کا نام ہتھیا رکھا ہے۔میرا خیال ہے برادرِ خورد مباش والی مثل اس کے بعد ہی رائج ہوئی ہو گی۔پتہ نہیں اس کو تھری ان ون کہیں گے یا ون ان تھری مگر اس طرح یہ شخص جس کا دفتری نام مختار احمد' ادبی وقار بن الٰہی اور گھریلو احمد ہے۔بیک وقت تین ناموں کے مزے لوٹ رہا ہے۔بھابھی انہیں گھر میں ہی نہیں ہر جگہ احمد پکارتی ہیں۔اگر وہ غُصے میں نہ ہوں یا ٹیلی فون پر آواز صاف سنائی دے تو ان کے منہ سے یہ خوبصورت نام اور بھی پیارا لگتا ہے۔بصورت دیگر بڑا کنفیوژن ہوتا ہے کہ کس کو کہہ رہی ہیں؟

ایک دنیا جانتی ہے اور اگر پہلے نہیں جانتی تھی تو اب جان جائے گی کہ وقار بن الٰہیٰ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔اس لئے میں ان کی ہر بات کا مطلب اُلٹا لیتا ہوں۔اس خوش نصیب آدمی کی طرح جس کی بیوی دریا میں ڈوب گئی تھی اور وہ اس کی نعش اپ سٹریم میں تلاش کر رہا تھا۔لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ نیچے کی طرف جا کر کیوں نہیں ڈھونڈتے ہو تو بولا۔اس نے زندگی بھر کبھی سیدھی بات نہیں کی۔میرا خیال ہے مر کر بھی وہ اوپر ہی گئی ہوگی۔آپ وقار بن الٰہیٰ کی اُلٹ بازی ملاحظہ فرمائیں کہ سب سے پہلے تیسری کتاب چھپوائی پھر دوسری اور اب پہلی مرتب کرنے کے بعد چوتھی کے پیچھے ہیں۔

ممکن ہے بھابھی سے یا اوروں سے کبھی سیدھی بات بھی کرتے ہوں مگر حرام ہے جو انہوں نے میرے ساتھ کبھی سیدھی بات کی ہو۔اگر میں کہوں کہ چلو فلاں آدمی سے ملتے ہیں تو کہیں گے' وہ بھی کوئی آدمی ہے اور اگلے روز میں یہی دہراؤں کہ فلاں بھی کوئی آدمی ہے تو کہیں گے کیوں کیا خرابی ہے اس میں' تمہاری طرح تو نہیں' ٹھیک ٹھاک آدمی ہے۔میرے ایک افسانے پر جو انہوں نے آج تک سب سے اچھی اور تفصیلی رائے دی وہ یہ تھی ''برا نہیں ہے''۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے ایک چٹنی کی ترکیب بتائی جو ہاضمے کی خرابی اور نفخ کے لئے مفید اور ان کی آزمائی ہوئی تھی۔اگلے روز میں نے انہیں نیو یارک اپنے ساتھ ہونے والی ادبی تقریب اور ٹی۔وی انٹرویو کی تفصیل بذریعہ ای میل بھجوائی اور بڑی بیتابی سے اُن کی رائے اور جوابی ای میل کا انتظار کرنے لگا۔دو تین روز بعد ان کا جواب ضرور آیا۔سبجیکٹ بھی وہی تھا جس کے تحت میں نے ای میل بھیجی تھی۔میں نے خوشی خوشی ای میل کھولی' لکھا تھا ''ہاؤاز چٹنی؟''

دوسروں کی تعریف کرنے میں بالکل منیر نیازی ہیں جنہیں بقول

ایک شاعر مشاعرے میں کوئی اچھا شاعر پڑھنے آئے تو فوراً پیشاب آجاتا ہے۔ بہرحال اپنے افسانوں کی تعریف سے ناخوش نہیں ہوتے اور نہ اُنہیں محفل سے اُٹھ کر جانے کی جلدی ہوتی ہے چاہے سخت حاجت ہو رہی ہو۔ ہم اکثر شام کو ایک ساتھ سیر کے لئے نکلتے ہیں اور لڑ جھگڑ کر جُدا ہوتے ہیں۔ پھر اتفاق سے اگلے روز ایک ہی جگہ پر ایک ہی وقت پر ہماری مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ یہ سارے معاشرے کی خرابیوں، دفتروں کی بے ضابطگیوں اور سیاست کی بداعمالیوں کا غصہ مجھ پر نکالتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کہیں گولی یا کوئی آئینی ترمیم چل جائے تو اس کا غصہ بھی مجھ پر نکالیں گے جیسے چلانے والا میرا پھوپھڑ لگتا ہو۔ میرے محکمے سے متعلق ہر شکایت کے لئے میں ہی جواب دہ اور جمعہ بازار سے مہنگی یا خراب سبزی خرید لائیں تو اس کی ذمہ داری بھی میری۔ اپنی کوتاہ نگاہی کی وجہ سے راہ چلتے وقت فٹ پاتھ کے کسی کھڈے میں گر پڑیں یا مین ہول کا ڈھکنا کوئی چُرا کر لے گیا ہو تو بھی میرا قصور۔ حتیٰ کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے وعدے کے مطابق میرے ہاں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکیں تو بھی میں قصوروار کہ ایسا وقت ہی کیوں مقرر کیا تھا۔ بس انہی باتوں نے مجھے ان کے خلاف کر دیا ہے اور میں ایک مدت سے انتظار کر رہا تھا کہ ان کی ہر بات کا بدلہ چکاؤں گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہماری تاریخ پیدائش کا سال ایک ہی ہے اور ہم نے لکھنے کی ابتداً بھی ایک ساتھ ۱۹۵۵ء میں کی۔ لیکن ہماری ملاقات ستائیس اٹھائیس برس کی عمر میں ہوئی۔ یونس جاوید کو شروع ہی سے اندھیرے اور اجالے کو آپس میں ملانے کا شوق تھا۔ وہ وقار کے کلاس فیلو اور میرے ''عکسِ نو'' کے زمانے کے دوست تھے اور لاہور سے مجھے تحفے میں کتابیں اور محبتیں بھیجتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے ہم دونوں کا تعارف خط کے ذریعے کرایا اور آج تک پچھتاتے ہیں۔

وقار سے میل ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑی کوفت ہوئی، ہر کام اور ہر بات میں اتنی نفاست، ترتیب اور سلیقہ، دوستی اور محبت بھی دیکھ بھال اور ناپ تول کر کرتے۔ مزاجوں میں وہی فرق تھا جو اٹک اور شیخوپورہ میں ہے۔ جغرافیائی پس منظر آدمی کی شخصیت اور تحریروں پر بھی اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اٹک بارانی اور پانی کی کمی کا شکار علاقہ ہے۔ پانی کو احتیاط اور کفایت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جب کہ شیخوپورہ سیلاب اور افراطِ آب کی وجہ سے سیم زدہ۔ اٹک میں زیرِ زمین پانی تلاش کرنا پڑتا ہے اور شیخوپورہ میں زمین کے باہر پانی آپ کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے اور آپ اس کے آگے آگے۔ چنانچہ آپ وقار بن الٰہی کے گھر جائیں تو صاف ستھری اور خوبصورت پیالی میں بنی چائے یا نفیس قسم کے گلاس میں شربت یا اسکوائش آجائے گی ساتھ میں اتنے ہی بسکٹ یا کباب، جتنے ایک نارمل اور مہذب انسان عام طور پر کھاتا یا اسے کھانا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں کو الٹی کی بجائے کوانٹٹی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور شربت کی بالٹی یا اسکوائش کے جگ سے آپ چاہیں تو غسل بھی کر سکتے ہیں۔

تخلیقی میدان میں بھی ہمارے درمیان یہی فرق رہا۔

میرے اندر کہانیوں کا ایک ٹال ہے، مجھے جب بھی فرصت ملتی ہے کلہاڑا اُٹھاتا ہوں اور کسی کہانی کی نئی گیلی چیرنے لگ جاتا ہوں لیکن وقار بن الٰہی اول تو کئی کئی مہینے کچھ نہیں لکھیں گے تو پھر جب لکھیں گے تو پڑھ سن کر لگے گا 'ذات کے سنار' کمہار یا کشیدہ کار ہیں۔

شروع میں وہ بھی میری اور رشید امجد کی طرح سیدھی سادی بیانیہ انداز کی کہانیاں لکھتے تھے مگر جب میری کہانیاں چھوٹے نیم ادبی پرچوں میں چھپ رہی تھیں، اُنہوں نے نقوش اور بیسویں صدی وغیرہ میں چھپ کر ہمیں پریشان اور قارئین کو حیران کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے خالق، اکیلا، ساربان، اپنا گھر اپنی آگ اور پرایا دوزخ جیسی مضبوط اور یادگار کہانیاں لکھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ عالم شوق کا، سانپ کی موت، بٹوارہ، دیسی صابن کی بُو اور نئی زندگی جیسی تہہ دار تمثیلی اور علامتی انداز کی کہانیاں لکھ کر ہمارا منہ چڑانا شروع کر دیا لیکن کاش! وہ چند ایک ایسی کہانیاں نہ لکھتے کہ میں ان کا جانی دشمن بننے پر مجبور ہو جاتا۔

لیکن ٹھہریئے میری اور ان کی دشمنی کا سبب صرف چند افسانے نہیں ہیں اور بہت سی باتیں بھی ہیں جو تھوڑی سی تفصیل چاہتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے خود کبھی حلقے کا الیکشن لڑا نہ کسی عہدے کی خواہش کی اور مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ انہوں نے مجھے اسلام آباد میں حلقہ اربابِ ذوق قائم کرنے اور بعد ازاں اسے مستحکم کرنے میں بہت مدد دی۔ ہر مہینے حلقہ کا پروگرام کاتب کی بجائے خود اور اس سے بہتر لکھ کر اور سائیکلو سٹائل کر کے مجھے دیتے رہے اور میری انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور مجھے کامیاب کراتے رہے لیکن اس میں ان کی غرض اور دشمنی پوشیدہ تھی۔ وہ چاہتے تھے میرا زیادہ تر وقت حلقہ کو چلانے، ادیبوں کو لا دلا کر حلقہ میں لانے، کارروائیاں لکھنے اور چھپوانے میں صرف ہوتا رہے اور میں پڑھنے اور افسانہ لکھنے پر پوری توجہ نہ دے سکوں۔ حلقہ کے قیام سے میرے بہت سے عزیز دوست مجھ سے خفا ہو گئے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ادبی سیاست میں میری اہمیت افسانہ نگاری کی وجہ سے نہیں، حلقہ کے سیکرٹری ہونے کی وجہ سے ہے۔ کچھ دوست الیکشن ہار کر میرے مخالف ہو گئے۔ اس طرح وقار بن الٰہی نے مجھے سوچی سمجھی سکیم کے تحت خوار کیا اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ مجھے پھنسا کر پہلے گھر میں اور پھر چین جا کر چین سے بیٹھ گئے۔ یہاں تھے تو میں اصرار کرتا کہ حلقہ میں چلو تو جواب ملتا ''وہ کیا ہوتا ہے؟'' واپس آئے تو کہتے ''اب تک ہے؟'' بہرحال مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اگر انہوں نے میرے ساتھ عداوت کی تھی تو خود بھی لکھ پڑھ نہیں رہے تھے لیکن انہوں نے مجھے دھوکا دیا اور چپکے چپکے افسانے لکھتے رہے۔ میرے کئی برس اس خوش فہمی میں اور حلقہ کی مصروفیات کی نذر ہو گئے، تب انہوں نے ایک ایک کر کے افسانے چھپوانا شروع کر دیئے۔ اسی دوران مجھے بھی ان کو ایک مصیبت میں پھنسانے کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ بھابھی کو وراثت میں کچھ رقم مل گئی جسے

وہ ٹھکانے لگانے کے درپے تھے۔ مجھ سے مشورہ کیا کہ اٹک میں کوئی جگہ خرید لوں یا باہر جا کر پی ایچ ڈی کر آؤں۔ یاد رہے اس زمانے میں اپنے ہاں پی ایچ ڈی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ میں نے سوچا ان کو ایسا مشورہ دینا چاہئے کہ ایک تو بھابھی کی رقم ہضم نہ کرسکیں دوسرے ڈھنگ کا یا علم وادب کا کوئی کام نہ کرسکیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک جاننے والے سے ایک پلاٹ دلوا دیا اور جلد جلد مکان تعمیر کرنے پر اُکسانے لگا۔ ان کے پاس مکان بنانے کے لئے بہت ناکافی رقم تھی۔ مجھے بحیثیت ایک انجینئر معلوم تھا کہ کتنا خرچ آئے گا مگر میں نے انہیں کم تخمینہ بتایا کہ ابھی مکان کا ڈھانچہ بھی پوری طرح مکمل نہ ہوا تھا کہ جمع پونجی ختم ہوگئی۔

ایک روز میں اپنے سائٹ آفس میں کام کر رہا تھا کہ وہ کسی مشورے کے لئے آئے۔ میں اُس روز کسی اہم کام میں مصروف تھا‘ زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ ناراض ہوکر وہ وہاں سے چلے آئے کہ آج تم نے مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ اب میں اتنا گیا گُزرا بھی نہیں تھا اور پھر اسلام آباد میں گھاس کی کیا کمی۔ شام کو میں نے ایک جگہ سے ہری ہری تازہ گھاس توڑی اور گفٹ پیک لے کر ان کے ہاں پہنچا۔ لفافہ لیتے ہوئے بڑے خوش تھے۔ کیا پتہ کیسے کیسے خوشگوار خیالات ان کے دل میں آئے ہوں گے۔ چائے پی کر جانے پر اصرار کیا مگر لفافہ تھما کر میں جلدی سے بھاگ آیا۔ پتہ نہیں گھاس کا انہوں نے کیا کیا؟ مکان بن گیا اور قرضے کی قسطیں ادا کرنا پڑیں تب انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہوگیا ہے اور میں نے انہیں پی ایچ ڈی کرنے سے کس طرح باز رکھا ہے۔ تب یہ میرے پیچھے پڑ گئے پہلے تو تقریر فرما فرما کر مجھ سے شاعری چھڑوائی۔ میں ان دنوں ماشاءاللہ اچھی بھلی نظمیں غزلیں گھڑ لیا کرتا تھا۔ یہ فرماتے کہ گھڑا خواہ تمہاری طرح کتنا ہی چکنا ہو اس میں جتنے زیادہ سوراخ ہوں گے اتنی جلدی خالی ہوجائے گا۔ تم صرف افسانہ لکھنے پر قناعت کرو اور جب میں نے سچ مچ شاعری کرنا چھوڑ دی یا شاعری نے مجھے چھوڑ دیا تو یہ میرے امتحانوں کے پیچھے پڑ گئے۔ میں نے ابھی صرف دو ایم۔ اے کئے تھے۔ تیسرے کی تیاری اور چوتھے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یہ میری جان کو آ گئے‘ کہتے۔ پنجاب یونیورسٹی والے بہت پریشان اور مالی پریشانیوں کا شکار ہیں کیوں کہ اس سال تم نے ابھی تک فیس داخلہ نہیں بھیجی۔ شریک کی بولی کا اثر آپ جانتے ہیں کتنا گہرا اور کاری ہوتا ہے۔ میں نے آئندہ امتحان دینے کا سلسلہ ترک کر دیا اور ان کی طرح جاہل رہ گیا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے۔ میں دو چار اور ایم۔ اے کر لیتا تب بھی کچھ فرق نہ پڑتا۔ مگر میری اس سوکن سے دیکھا نہ گیا کہ میرے پاس اُس سے زیادہ ڈگریاں ہوں۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ بدلہ چکانے کے لئے ایک دوسرا میدان چُنا اور اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپوا دیا اور نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا یعنی انہوں نے بڑی عبرت حاصل کی اور اپنی کتاب چھپوانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور نہ صرف افسانے لکھنے شروع کئے بلکہ بڑے بڑے ادبی رسالوں میں چھپوانے بھی لگے۔ میرے لئے سخت خطرہ پیدا ہوگیا مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ انہیں ملک ہی سے باہر لے گیا اور میرے لئے میدان خالی رہ گیا۔ ان کے چین جانے سے مجھے بڑا اِطمینان حاصل ہوا۔ میں نے ان کی غیر حاضری میں دھڑا دھڑ اپنی کتابیں چھپوانا شروع کر دیں اور دوستوں اور نقادوں کو تعریف وغیرہ کرنے سے بھی نہیں روکا۔ لیکن جس طرح ملک الموت کا آنا یقینی ہوتا ہے‘ یہ بھی ایک روز آ دھمکے۔ میں نے دوسری باتوں کے علاوہ ان کو ادب اور حلقے سے بدظن کرنے کی بہت کوشش کی مگر یہ میری باتوں میں پوری طرح نہ آئے اور کبھی سفرنامہ اور کبھی ناول لکھنے کی باتیں کرنے لگے۔ تب میں نے سوچا اس سے تو بہتر ہے کہ یہ کہانیوں مہانیوں کا ایک مجموعہ چھپوا لیں۔ اپنے شاگردوں اور جونیئر افسانہ نگاروں کے آدھ آدھ درجن مجموعوں کے سامنے ان کی حیثیت ہی کیا ہو گی۔ ویسے بھی تب تک ہم لوگوں نے خیر سے افسانے کے قارئین کو خاصا بددل کر دیا تھا۔ کوئی ان کی کہانیاں پڑھے گا تو رائے دے گا؟ میرا خیال تھا ایک آدھ مجموعہ چھپوا کر اور نقادوں کی سنگدلی‘ قارئین کی عدم دلچسپی اور ادبی حلقوں کی بے اعتنائی سے دل برداشتہ ہوکر کھُڈے لائن لگ جائیں گے مگر ان کے اوپر تلے دو مجموعے آ گئے‘ تیسرا مرتب کر دیا گیا اور چوتھے کے لئے دھڑا دھڑ افسانے لکھنے لگے۔ لیکن اصل خطرہ مجھے اس روز محسوس ہوا جب اُنہوں نے رابطہ کے اجلاس میں ’’بے بسی‘‘ کے عنوان سے افسانہ پڑھ کر مجھے بے بس کر دیا۔ یہ افسانہ مجھے لکھنا تھا اور یہ سب باتیں میرے دل و دماغ میں موجود تھیں اور بیت چُکی تھیں مگر پہل یہ کر گئے۔ پتہ نہیں انہیں میرے دل کی بات کا خود بخود علم کیسے ہوگیا تھا۔ اس طرح میرا ایک بہت خوبصورت افسانہ لکھنے سے پہلے ہی چھن گیا۔ پھر بھی میں نے صبر شکر کر لیا لیکن انہوں نے مجھے جلانے تڑپانے کا سلسلہ جاری رکھا اور رابطے اور حلقے میں باقاعدگی سے افسانے پڑھنے لگے۔ جن پر سننے والے بغیر سوچے سمجھے داد کے ڈونگرے برساتے۔ پتہ نہیں لوگوں کے ذوق کو کیا ہو گیا ہے۔ بس بھیڑ چال ہے‘ قیامت کی نشانی ہے۔ پھر ایک دن انہوں نے اپنا وہ افسانہ سنایا جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں‘ ’’اُترنا دریا میں‘‘ یقین کیجئے‘ میرا سر گھوم گیا۔ یہ ایک بیٹے کے تعلیم کے سلسلے میں امریکہ جانے کے متعلق کہانی ہے‘ جس میں اُس کے اداس ماں باپ کے جذبات و محسوسات کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ آپ خود انصاف کیجئے کہ انہوں نے جب یہ افسانہ لکھا اور سنایا تو ان کا بیٹا کہیں گیا نہیں تھا‘ اِسلام آباد کے کالج میں پڑھتا تھا اور میرا بیٹا امریکہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ظاہر ہے‘ یہ افسانہ بھی مجھے ہی لکھنا تھا۔ یہ میری ہڈ بیتی تھی مگر انہوں نے محض میری دشمنی میں یہ افسانہ لکھ ڈالا۔ پھر یہی نہیں میرے بیٹے سے پہلے اپنی آدھی اولاد کو امریکہ روانہ کر دیا۔ شکر ہے‘ ان کے دو ہی بچے ہیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے صرف اپنے افسانے کو سچ ثابت کرنے اور مجھے نیچا دکھانے کے لئے کیا۔

اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم دونوں کے درمیان کیا کیا رقابتیں اور دشمنیاں چل رہی ہیں۔آپ یقین جانیں میں جب اس افسانے ''اتر نا دریا میں'' کو پڑھتا ہوں تو مجھے بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ کھانی پڑ جاتی ہے۔یہ ایسا افسانہ ہے کہ جس کے پاس ہوُاس نے اور کچھ نہ بھی لکھا ہو تو افسانے کی تاریخ میں اُس کا نام زندہ رہ سکتا ہے۔جی چاہتا ہے اُنہیں سچ مچ دریا میں اُتار دوں۔پھرانہوں نے اپنے مجموعے کا نام بھی اسی افسانے پر رکھ دیا تا کہ جب بھی میری بک شیلف پر نظر پڑے میرا بلڈ پریشر بڑھ جائے۔

ان کی کتابیں چھپ گئیں تو میں نے حلقہ کے سیکرٹری سے سفارش کر کے ان کی دو کتابوں کی ایک تقریب حلقے میں رکھوا دی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ ایسا نہ کیا گیا تو یہ کسی تقریبات کرنے والے پروفیشنل کے ہتھے چڑھ جائیں گے جو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں دھوم دھام سے ان کی تقریب منعقد کرے گا جہاں وزیروں سفیروں اور امیروں کی قطار لگی ہو گی فوٹو گرافر بھاگتے دوڑتے پھرتے ہوں گے روشنیاں جھل مل کرتی اور وڈیو کیمرے ہر طرف حرکت کر رہے ہوں گے اور اگلے روز اخبارات میں چار کالمی تصویر اور سرخی۔۔۔۔مجھے اس تصور سے ہول آتا تھا۔

میرا یہ بھی خیال تھا کہ حلقے کے نقادان کی خوب خبر لیں گے اوران کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔مگر ہوا اس کے برعکس تمام مقالہ نگار اندر سے ملے ہوئے تھے۔تعریفوں کے پُل باندھتے رہے۔۔۔۔بس بھیڑ چال قیامت کی نشانی ہے۔

☆

''منشائے ایزدی''

5 ستمبر 1937ء،شیخو پورہ کے نزدیک موضع ٹھٹھہ نستر میں پیدا ہونے والے،اردوادب کے ہردلعزیز افسانہ،ناول،ڈرامہ نگاراور حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے روحِ رواں محمد منشایاد15 اکتوبر 2011ءکودل کے دورے کے باعث اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔اِنّ للّٰہ وانا الیہ راجعون ، جنابِ منشایاد کا اختصاص یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردوافسانہ لکھنے والوں میں منشاصاحب کا شمار صفِ اوّل کے اُن تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردوافسانے میں کہانی کو ہرصورت اور ہرحال میں برقرار رکھتے ہوئے قاری کے وسیع حلقے کو اپنا گرویدہ بنانے کے ساتھ ناقدین اور محققین کو بھی ہمیشہ نہال رکھا۔اُن کی شخصیت وفن کے معترفین میں ممتاز مفتی،احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹر وزیر آغا،امرتا پریتم،گوپی چند نارنگ،شمس الرحمٰن فاروقی،مظفرعلی سید،محمد علی صدیقی،انور سدید،وقار بن الٰہی،رشید امجد،مظہر الاسلام،اعجاز راہی،پروین شاکر،فتح محمد ملک،افتخار عارف،احمد فراز کے علاوہ ہر اُونچ اور ہر مزاج کے لوگ شامل تھے۔اُن کا حلقہ احباب وسیع اور دسترخوان بہت کشادہ تھا۔منشایاد نے اردو زبان کے ساتھ ماں بولی یعنی پنجابی میں بھی اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق کیا ہے۔اُن کے پنجابی ناول ''وگدا پانی'' کی مقبولیت بجائے خود ایک معتبر سند ہے۔منشایاد کو ادبی خدمات کے صلے میں صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی،نقوش ایوارڈ اور وارث شاہ ادبی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔منشایاد نے نصف صدی سے زیادہ ادبی سفر میں ایک درجن کے قریب تصانیف تخلیق کی ہیں۔(۱) خلاء اندر خلاء (۲) خواب سراب (۳) دُور کی آواز (۴) درخت آدمی (۵) وقت سمندر (۶) ماس اور مٹی (۷) بند مٹھی میں جگنو (۸) تماشا (۹) وگدا پانی (ناول) (۱۰) منشایئے (مضامین اور خاکے)

ادارہ چہارسو اردوادب کے نابغہ منشایاد مرحوم کے اہلِ خانہ،اقرباء،احباب اور قارئین سے منشاصاحب کی رحلت پر ہدیہ تہنیت اوراُن کے درجات کی بلندی کے لیے دعاؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔

عروب شاہد

(اسلام آباد)

''اپنے دور کا فاتح''

رشیدامجد
(راولپنڈی)

وقار بن الٰہی نے بطور افسانہ نگار اپنی پہچان اُس وقت کرائی تھی جب اُردو افسانہ بیانیہ کے سنہری دور سے گذر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب پڑھا جاتا تھا اور اُس پر محفلوں میں گفتگو بھی ہوتی تھی۔ میں جب ۱۹۶۰ء کے اوائل میں راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں وارد ہوا تو وقار بن الٰہی کی کہانیوں کا ذکر اکثر سُننے میں آیا۔ اِسی دوران میں نے اُن کی ایک دو کہانیاں ''نقوش'' میں پڑھیں' کہانیاں اچھی تھیں' دیر تک اُن کا اثر رہا۔ وقار سے ایک غائبانہ تعلق قائم ہو گیا۔ پھر اُن کی کئی کہانیاں نظر سے گذریں' وہ اٹک سے اِسلام آباد آ گئے۔ ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن اِس دوران اُنہوں نے لکھنا کم کر دیا اور پھر بالکل ہی غائب ہو گئے لیکن افسانے کے حوالے سے جب بھی گفتگو ہوتی' اُن کا ذکر ضرور آتا۔ ممتاز مفتی نے رابطہ کی بنیاد رکھی تو وقار بھی اُس میں شامل ہوئے اور رابطہ کے جلسوں میں کہانیاں پڑھنے لگے۔ اِن کہانیوں کو سن کر طمانیت ہوتی کہ وقار کا افسانہ نگار نہ صرف زندہ تھا بلکہ فنی ارتقائی مراحل بھی طے کر رہا تھا۔ اِن کہانیوں نے نہ صرف چونکایا بلکہ موضوعِ گفتگو بھی بنیں۔ ۱۹۹۲ء میں اُن کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے۔ ''کس سے کہے وہ'' میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک کی کہانیاں اور ''اُترنا دریا میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیانی عرصے کی کہانیاں شامل ہیں۔ وقار بن الٰہی نے اپنی پہلی کہانی ۱۹۵۵ء میں لکھی تھی۔ اِس حوالے سے ابھی ایک اور مجموعے کی جِسے پہلا مجموعہ کہنا چاہیئے' گنجائش موجود ہے۔

وقار بن الٰہی کی کہانیاں وسیع سماجی تناظر سے جنم لیتی ہیں۔ اِن کے موضوعات زندگی کی کُلیت سے جُڑے ہوئے ہیں' خود ان کے اپنے لفظوں میں ''مجھ پہ ایک قرض ہے' دھرتی کا' وطن کا' رشتوں کا' معاشرے کا' انسانیت کا 'بس وہی قرض چُکانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''

یہ اِظہار اِن کے اِس نقطۂ نظر کا ترجمان ہے کہ اِن کے نزدیک کہانی لکھنا نہ صرف ایک سنجیدہ عمل ہے بلکہ ایک قرض بھی' اِس حوالے سے اِن کی کہانیوں کا مجموعی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اِن کی کہانیوں میں زیریں لہر ایک مقصدیت ہے۔ ایک آدرش' ایک خواب جس کی تعبیر اِن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

وقار کی کہانیوں کا فنی تجزیہ کیا جائے تو جو عناصر خاص طور پر متوجہ کرتے ہیں' اِن میں واقعہ کی فنی بُنت کاری' فضا کی تخلیق اور کردار نگاری ہے۔ اِن کا کمال یہ ہے کہ وہ وقوع کو صرف واقعہ کی حد تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اِس میں ایک اکائی پیدا کرتے ہیں کہ خیال اور واقعہ مل کر کہانی بُنتے ہیں۔ اِس سے ایک ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جس میں کردار خود بخود فطری طریقے سے اپنی پہچان کراتے ہیں۔ اِن کی کہانی میں تکنیک اور بُنت کاری کا فن پوری مہارت سے موجود ہوتا ہے لیکن کہانی پڑھتے ہوئے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا کمال ہے جو ہمارے روائتی افسانے میں بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ دوسری اہم چیز ان کا بیان اور انداز ہے۔ انہوں نے اپنی ساری کہانیاں بیانیہ میں لکھی ہیں اور انہیں کسی حد تک حقیقت نگاری کی ایک صورت سمجھنا چاہیئے لیکن اِن کا بیانیہ نہ تو سپاٹ ہے' نہ یک سطحی' بلکہ علامت کا استعمال کیئے بغیر انہوں نے بیانیہ ہی میں ایک دبازت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لفظوں کا یہ استعمال اور جملے کی ساخت کا یہ طریقہ اِن کا اپنا ہے جس سے ان کے اسلوب کا ایک حصہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اسلوب سے ان کے افسانوں میں کہانی بیان کرنے کا ایک علیحدہ انداز اُبھرا ہے کہ واقعہ بعض اوقات سامنے کا ہوتا ہے اور اپنی تمام تر جُزئیات کے ساتھ اپنی پہچان بھی کراتا ہے لیکن افسانے کی شکل میں ڈھل کر اس میں ایک ماورائے عصر خوشبو پیدا ہو جاتی ہے' مطلب یہ کہ وہ ٹھوس حقائق سے اپنی کہانی کا تانا بانا بُنتے ہیں لیکن اِن کے اسلوب کی دبازت اور اِظہار اس میں کئی معنوی سطحیں پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ان کے موضوعات میں بڑی معاشرتی وسعت ہے۔ زندگی کے سامنے کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے دفتری زندگی کے اُلجھاؤ' گھریلو اُلجھنوں سے رشتوں کی نزاکت اور وطن کی محبت سے سیاست کے خارزار تک' ایک مکمل انسان اپنے پورے سیاسی سماجی تناظر کے ساتھ اِن کی کہانیوں میں موجود ہے۔ اس کردار کو اگر علامت سمجھا جائے تو یہ تیسری دنیا کا وہ انسان ہے جو بیک وقت کئی محاذوں پر نبُرد آزما ہے' کہیں پسپا ہو رہا ہے اور کہیں آگے بڑھ رہا ہے۔ اِس حوالے سے اِن کی کہانیاں اپنے عصر کی آواز ہیں جس کی بازگشت میں انسانی المیے بھی ہیں' طربیے بھی' سادگی اور بے چارگی بھی ہے اور ریاکاری و منافقت بھی۔

یوں تو وقار کی کہانیوں میں پاکستانی معاشرے کی کئی تصویریں موجود ہیں لیکن اِن کی وہ کہانیاں جنہیں تدریسی زندگی کے تجربے و مشاہدے اور وزارتوں میں ہونے والی دفتری سازشوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے' خاصے کی چیز ہیں۔ خود وقار نے تدریس سے دفتر کی طرف سفر کیا ہے گویا ایک قطب سے دوسرے قطب کی طرف۔ اس طویل سفر کے مشاہدات و تجربات کو جن کہانیوں میں بیان کیا گیا ہے وہ اپنے موضوع کے حوالے سے ہی منفرد نہیں بلکہ پورے اِظہار و بیان اور مواد کے لحاظ سے بھی اُردو کہانی میں ایک نئی فکری جہت کی خبر دیتی ہیں۔ دفتری زندگی' ماحول اور طریقہ کار پر ہمارے یہاں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ممتاز مفتی اور منیر احمد شیخ کی چند ایک کہانیوں کو چھوڑ کر یہ میدان تقریباً خالی ہی ہے' وقار نے اِس موضوع پر تواتر سے کہانیاں لکھی ہیں جن میں تفصیل سے

دفتری زندگی، وہاں کا ماحول، ایک دوسرے سے مخاصمانہ رویہ، پروموشن کی درپردہ سازشیں اور ایک کو گرا کر آگے نکلنے کی تصویریں خوبصورتی سے پیش کی ہیں۔ اِن کہانیوں میں ایک اُستاد کا مشاہدہ شامل ہے جو اگرچہ وہ اب نہیں رہے لیکن یہ استاد اُن میں آج بھی موجود ہے۔ اُن کی یہ کہانیاں صرف دفتری زندگی، ماحول اور کرداروں ہی کی عکاس نہیں بلکہ ایک زوال پذیر سسٹم کا نوحہ ہیں، اُن پر طنز ہیں اور اُن کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔

اُستاد کے حوالے سے یاد آیا کہ اُن کا ایک طویل تدریسی سفر بھی ہے جس کے مشاہدوں اور تجربوں کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اُنہوں نے اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے کئی کہانیاں ان دونوں مجموعوں میں شامل نہیں لیکن وہ ان کے اگلے مجموعے میں شامل ہوں گی۔

''کس سے کہے وہ'' میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء کے درمیان لکھے گئے افسانے شامل ہیں۔ اس میں شامل انیس افسانوں کا انتخاب بقول وقار بن الٰہی پچاس افسانوں میں سے کیا گیا ہے۔ یہ افسانے اپنے دور کے تمام قابلِ ذکر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اِن کہانیوں کے زیادہ موضوعات انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے دُکھ، المئے اور بدلتی ہوئی معاشرتی صورتِ حال ہے جس میں دیہاتی یا قصباتی کردار شہری زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش میں کہیں مضحکہ خیزی کا شکار ہوتے ہیں تو کہیں کسی سماجی المئے سے دوچار۔ اِس مجموعے کی کہانیوں میں سے ''انتظار''، ''کس سے کہے وہ''، ''ساربان''، ''گاڑی لائن بدلتی ہے'' اور ''طوفانِ خوابیدہ'' نے اپنی پہلی اشاعت کے بعد بھی کہانی پڑھنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔ یہ کہانیاں خاصی دیر کے بعد یکجا ہوئی ہیں۔ اِس دوران بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن بڑا ادب ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ وقار کا یہ اظہار صرف تعلّی نہیں بلکہ ایک تنقیدی محاکمہ ہے کہ

''عدمِ توجہ کے باعث یہ بروقت کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے۔ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ اگر اب شائع ہو رہے ہیں تو ایسی حرج کی بات بھی نہیں۔''

اِن کہانیوں کو پڑھ کر ان کی رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یہ کہانیاں بیس تیس برس بعد بھی اسی طرح تروتازہ ہیں اور ان کے موضوعات، کرداروں کی معصومیت اور ماحول اپنی طرف کھینچتا ہے۔

مجموعہ ''اُترنا دریا میں'' بھی ۱۹۹۲ء ہی میں شائع ہوا ہے، اس میں اٹھارہ کہانیاں شامل ہیں جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی ہیں۔ اِن کہانیوں کا مجموعی منظر نامہ تو وہی ہے لیکن انسانی رشتوں کی شکستگی، معاشرتی تنقید اور جنریشن بُعد کو فلسفیانہ پیچیدگی اور زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔ اِس مجموعے کی کہانیوں میں سے ''اُترنا دریا میں''، ''بوڑھوں کا سال''، ''ممتا''، ''اپنی آنکھ کا شہتیر''، ''نیلام'' اور ''سانپ کی موت'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ اِن کہانیوں کی دبازت صرف سماجی رشتوں یا کرداروں کی تصویر کشی تک محدود نہیں بلکہ پورا سیاسی سماجی تناظر موجود ہے۔ اِن کہانیوں کی خاص بات وہ بے چینی اور بے اِطمینانی ہے جو کبھی کبھی ہلکے طنز کا روپ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بے اِطمینانی اور بے چینی اس ردِ عمل کا اظہار ہے جو فنکار کے اندر پیدا ہو رہا ہے۔ وقار نے ان کہانیوں کے اندر چھوٹے چھوٹے منظر ناموں کی بجائے پس منظر میں پورے سسٹم، سماج اور اُس کے ان متعلقات کو سامنے رکھا ہے جو اندر ہی اندر اگرچہ کھوکھلے ہو رہے ہیں لیکن ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ اُسی طرح قائم ہے۔ اِن کہانیوں میں رشتوں کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں، ایک نیا بنتا ہوا سماج اپنا احساس کراتا ہے۔

یہ کہانیاں بھی بیانیہ میں ہیں اور کہانی بیان کرنے کی روائتی تکنیک میں گندھی ہوئی ہیں لیکن ان میں ایک تازگی ہے، زبان و بیان میں ایک تازگی جو ان کہانیوں کو اپنے عصری مزاج سے جوڑے ہوئے ہے۔ تجربے اور مشاہدے کے ساتھ مل کر نئی معنویت پیدا کر رہی ہے جس سے اِن کہانیوں کا فنی اور موضوعاتی دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔

یہ مجموعے وقار بن الٰہی کی فنی پہچان ہیں۔ ان میں ایک فنی تسلسل اور اِرتقا ہے اور موضوعاتی وسعت بھی۔ ان کی تازہ کہانیاں ایک اور بلکہ کئی مجموعوں کا تقاضا کر رہی ہیں۔ یہ مجموعے تو ان کی واپسی کا اعلان ہیں، اپنے دور کے فاتح کی واپسی، نئی فتوحات کے ساتھ!

۔ ستاروں پہ کمند ۔

جاپان کی تعمیراتی کمپنی شیمزو کارپوریشن مارچ 2011 میں سونامی کے نتیجے میں فوکوشیما ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کے بعد توانائی کے متبادل ذرائع استعمال کرنے کی پلاننگ کر رہی ہے۔ تازہ منصوبے کے تحت چاند کے خطِ استوا کی نچلی جانب 6ہزار800 میل طویل ایک بیلٹ باندھی جائے گی۔ اس بیلٹ کو لونارنگ (LUNARING) کا نام دیا گیا ہے۔ اس بیلٹ کی چوڑائی 248 میل ہوگی جبکہ اس میں 12 میل چوڑے انٹینا جوڑے جائیں گے جو توانائی کو زمین پر منتقل کریں گے۔ یہ تعمیر تاریخ کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر کہلائے گا۔ یہ منصوبہ محدود ذرائع کے مقابلے لامحدود اور آلودگی سے پاک ہوگا۔ اس منصوبے کی تکمیل سے بنی نوع انسان کا وہ خواب پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جو وہ ایک مدت سے شمسی توانائی کو استعمال میں لانے کی بابت دیکھ رہا ہے۔

ایک صاحبِ کردار شخص کی کتھا

پروفیسر جمیل آذر
(راولپنڈی)

وقار بن الٰہی سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی' کب ہوئی' کچھ یاد نہیں ہاں البتہ کبھی کبھار اُن سے حلقہ میں ملاقات ہوگئی اور اُن کا کوئی افسانہ سُن لیا۔ بہت عرصہ پہلے اُن کا ایک افسانہ حلقہ اربابِ ذوق' اِسلام آباد میں تنقید کے لئے پیش ہوا جسے میں نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔ اِس افسانہ میں اُنہوں نے اِس خوبصورتی اور ہُنر وری کے ساتھ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی تصویر کشی کی تھی کہ اب تک میرے کانوں میں پلیٹوں اور چھُری کانٹوں کا دھیما دھیما شور اور آنکھوں کے سامنے ویٹروں کا قمقموں کی روشنی میں سرو (serve) کرنے کا دھندلا سا منظر محفوظ ہے اور میں نے اپنے تنقیدی کلمات میں اِس منظر نگاری کو بہت سراہا تھا۔ اُس روز ہی میں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وقار بن الٰہی بہت بڑا افسانہ نگار ہے جسے فنِ افسانہ نگاری پر ایسی ہی دسترس حاصل ہے جیسی منٹو کو تھی۔ پھر ایک مرتبہ میں نے انہیں اِسلام آباد کی ایک کوٹھی میں جو غالباً خواندگی کمشن کا دفتر تھا' فائلوں میں مستغرق کام کرتے ہوئے دیکھا اور وہ ناقابلِ فراموش اِمیج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہوگیا۔ ایک بات جسے میں نے محسوس کیا کہ وقار کو جب دیکھا' اُنہیں دیکھ کر ایک روحانی مسرت محسوس ہوئی اور اپنائیت کا احساس ہوا۔ وقار ایک باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔ اُٹھتا ہوا قد' بھرے بھرے شانے' چمکتی بلوریں آنکھیں' چہرے پر خوشگوار متانت۔

''ماں' میں تھک گیا ہوں'' کی تقریبِ رونمائی کی خبر روزنامہ 'نوائے وقت' میں پڑھی۔ میں تو کتاب کے نام سے ہی چونک پڑا۔ میں نے سوچا کہ ہم تو سب ہی تھک گئے ہیں بھاگتے بھاگتے' کام کرتے کرتے' کچھ کرنے کی تگ و دو میں' محبوب کی اُلجھی لٹیں سلجھانے کی فکر میں۔ میں نے بلا سوچے سمجھے وقار کو ٹیلیفون کر دیا اور کتاب پڑھنے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ وقار نے ازراہِ لطف و کرم کچھ دنوں بعد مجھے اپنے نہایت خوبصورت دستخط کے ساتھ کتاب ارسال کر دی۔ کتاب دیکھتے ہی دِل خوش ہوگیا۔ اُن کی جاذبِ نظر شخصیت کی طرح کتاب کا گٹ اَپ بھی خوبصورت تھا۔ کتاب کا پورا ٹائیٹل یہ ہے ''ماں' میں تھک گیا ہوں۔۔۔ اپنی کہانی' اپنی زبانی''۔ عنوان پڑھنے کے بعد مجھے کئی سوانح عمریاں اور نظمیں یاد آگئیں۔ گہرے براؤن ٹائیٹل پر بنی اُن کی تین تصویریں ہیں جو بچپن' جوانی اور بُڑھاپے کی نمائندگی کر رہی ہیں اور اِن کے نیچے تین الفاظ پر مشتمل مصنف کا نام 'وقار بن الٰہی' درج ہے۔ کتاب کی پُشت پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری' بانو قدسیہ اور انور زاہدی اور ایک چینی خاتون سون لیِن مئے کی وقار کے فن اور ذات کے حوالے سے نہایت وقیع آراُ درج ہیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اپنی عمر کے ساٹھ کی دہائی کے آخری حصے میں پہنچ کر چھ سو اکہتر صفحات پر مشتمل اتنی ضخیم کتاب کس جذبہ و شوق کے تحت لکھ ڈالی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں جوں جوں کتاب پڑھتا گیا توں توں میرے سامنے جانے پہچانے کردار اور واقعات کی کہکشائیں اور جہانِ معنی کی پرتیں کھُلتی چلی گئیں۔

وقار بن الٰہی نے بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ وہ اب تک دو سو کے قریب افسانے سپردِ قلم کر چکا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اُن کی تخلیقی قوت کا سرچشمہ تا حال رواں ہے جس کی زندہ مثال یہ معرکہ آرا ضخیم کتاب ہے اور اِس کا نام بھی بڑا پیراڈوکسیکل (Paradoxical) ہے یعنی جو شخص اِتنی ضخیم کتاب لِکھ سکتا ہے یقیناً تھکا ہوا نہیں ہوسکتا' وہ بڑی تخلیقی توانائیوں کا حامل ہے۔ یوں تو ہر مصنف کی تصنیف میں اسکی زندگی کا کوئی نہ کوئی گوشہ منعکس ہوتا ہے لیکن سوانح حیات میں تو مصنف کی شخصیت کا بھرپور انعکاس ہوتا ہے۔ اِس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ یہ وقار بن الٰہی کی اپنی داستانِ حیات ہے لیکن یہ اُردو ادب کا ایک عظیم اور حسین فن پارہ ہے۔ گفتگو کے بے تکلف اندازِ بیان کی وجہ سے کتاب میں بڑی ریڈیبلیٹی پیدا ہوگئی ہے اور قاری کو پڑھتے ہوئے ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھئے وہ کس بے تکلفی کے ساتھ اپنے والدِ گرامی کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں: ''میرے والد چونکہ دو تین بچوں کی ولادت کے بعد پیدا ہوئے تھے اِس لئے اللہ کو رشوت دیتے ہوئے اُن کا نام کرم الٰہی رکھا گیا۔'' وقار نے اپنے نام کے ساتھ بن الٰہی کا لاحقہ اپنے والدِ گرامی کے نام سے ہی لگایا ہے جبکہ وقار اپنے چھوٹے بھائی کے نام سے لیا ہے۔ مختار احمد کا نام اُن کے تایا جان نے رکھا تھا جسے اُنہوں نے اپنا حقِ خود اختیاری استعمال کرتے ہوئے افسانے کی دیوی کے عشق میں قربان کر دیا اور یوں دنیائے افسانہ میں بلند نام و مرتبہ حاصل کیا۔ اُنہوں نے جس بے تکلفی سے اپنے والدِ گرامی کا ذکر کیا' اسی بے تکلفی کے ساتھ اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں۔ ''گورہ قبرستان کے پہلو میں بنے گھر کے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں' میں ۲۳ستمبر۱۹۳۶ء کو پیدا ہوا (نہ بھی ہوا ہوتا' تو کون سا قیامت ٹوٹ پڑنا تھی، غالبِ خستہ کے بغیر تو یقین کیجئے ڈھیروں کام اور محکمے بند ہو ہو جانے تھے لیکن میرے بغیر اِس کارخانے کا کاروبار زیادہ عمدگی سے چل سکتا تھا)'' لیکن میرا خیال ہے کہ اگر وقار بن الٰہی اِس جہانِ رنگ و بو میں نہ آئے ہوتے تو ہمیں نہ تو دو سو افسانے دستیاب ہوتے اور نہ یہ سندر کتھا پڑھنے کو ملتی۔

اِس کتاب میں حقیقی کرداروں کی ایک دلکش کہکشاں ہے جس میں اُن کے دادا پردادا' ماں باپ' بہن بھائی' عزیز و اقارب' سکول اور کالج کے اساتذہ' کلاس فیلوز' ادیب و شاعر' دفتروں کے اہلِ کار' آفیسرز اور دوست احباب جگمگا رہے ہیں۔ حُسنِ اتفاق ہے کہ اِن میں سے کئی ایک ایسے کردار بھی ہیں

جنہیں میں بھی جانتا ہوں۔ جب اُنہوں نے فارسی کے پروفیسر انور بخشی مرحوم کو تنگ کرنے کا واقعہ بیان کیا تو مجھے بھی وہ یاد آ گئے کیونکہ اسی کالج میں مجھے چوبیس سال انگریزی پڑھانے کا شرف حاصل ہوا اور بخشی مرحوم سے میرے گہرے مراسم تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے وقار کی جان چھڑائی۔ ڈاکٹر صفدر حسین ڈرامہ کے رسیا تھے اور وقار نے کسی ڈرامہ میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہوں گے۔ پروفیسر فیض مرحوم جو وقار کو گورنمنٹ کالج کیمبلپور میں معاشیات پڑھاتے تھے وہ بھکر میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہو کر آئے۔ بھکر میں بطور لیکچرار میری پہلی تعیناتی تھی۔ یوں اِس طرح متعدد کرداروں سے نہ صرف ازسرِ نو ملاقات ہو گئی بلکہ واقعات کی بازیافت بھی ہو گئی۔ اور تو اور اِس ظالم نے اُن جگھوں کا ذکر بھی اِس نفاست سے کیا جن سے میری جذباتی اور روحانی وابستگی تھی۔ میری مُراد انبالہ سے ہے جس کے ریلوے اسٹیشن پر اُنہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کا دن گذارا جہاں سوگواری کا احساس پھیلا ہوا تھا۔ انبالہ کے نام سے میں اشکبار ہو گیا کیونکہ یہ میری جنم بھومی تھی جس سے بچھڑے مجھے کئی عشرے بیت گئے۔ وقار بلا شبہ منجھا ہوا ادیب ہے' وہ ہمیں کہیں ہنساتا ہے' کہیں رُلاتا ہے' کہیں سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور کہیں موثر منظر نگاری سے ہمارے تخیل کو مہمیز لگاتا ہے۔ دیکھیئے وہ کس نفاست کے ساتھ چند جملوں میں ایک منظر اور اپنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں ''سامنے کا منظر غضب کا تھا۔ دو وقت کی روٹی مل جائے (دو وقت کی روٹی ہی تو نہیں ملتی) تو انسان سارے کام چھوڑ کر ساری زندگی اِس منظر کو ہی دیکھتا رہے۔ سامنے دریا کا گہرا نیلا پانی' دو تین حصوں میں بٹ کر بہتا ہوا' درمیان میں پہاڑ جتنا بڑا اور اونچا پتھر' پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ۔۔۔۔ فضا میں نمی اور ہلکا سا دھواں۔۔۔''

کتاب پڑھتے ہوئے دو تین مرتبہ غم سے میری آنکھیں پُرنم ہوئیں۔ وہ بہت محبت کرنے والے شفیق باپ ہیں۔ جب اُن کا اکلوتا بیٹا بیرونِ مُلک تعلیم کے لئے جاتا ہے تو جس درد و غم کے ساتھ وہ اپنے بیٹے کا مستقبل سنوارنے کے لئے اُسے باہر بھیجتے ہیں' وہ منظر رُلا دینے والا ہے۔ بیٹا نوجوان ہے' باہر جانے پر بیحد خوش ہے۔ ماں باپ بچے کی جُدائی سے غم زدہ ہیں۔ وقار اِس صورتِ حال کو اِس طرح بیان کرتا ہے::

''اب یہ زیادتی تھی کہ میں اُس کی اِس اُبلتی ہوئی خوشی میں شریک نہ ہوتا۔ سارے کام چھوڑ کر گھر پہنچا تو بیگم صاحبہ جو بہت بہادر بنتی تھیں' چُپ چاپ گُم سُم بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھیں' مجھے دیکھ کر آنکھوں سے وہ سیلاب بہہ نکلا جو پُشتے کے ٹوٹنے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ ہم دونوں اُلوؤں کی طرح بیٹھے پہلے خلاؤں میں گھورتے رہے اور پھر وہ گھڑی' وہ دن یاد کرنے لگے جس دن وہ اِس دنیا میں آیا تھا اور اِنکیوبیٹر میں لیٹا اسپتال کا گندا کمبل چبا رہا تھا۔ آج اُس نے تعلیم کے لئے امریکہ جانا تھا۔ وہ ہم سے ہمارے ہی جسم کے ٹکڑے کاٹ کر لئے جا رہا تھا۔'' یہ آخری جُملہ ''وہ ہم سے ہمارے ہی جسم کے ٹکڑے کاٹ کر لئے جا رہا تھا'' تڑپا دینے والا ہے۔ اِس سے بہتر شدتِ غم کا اِظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ وقار جس شدت سے اپنے بیٹے سے پیار کرتا ہے' اُس سے کہیں زیادہ وہ اپنی ماں سے پیار کرتا ہے۔ ماں قریب المرگ ہے اور ڈاکٹر اپنی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اِس دِلگداز منظر کو وقار اِس طرح بیان کرتا ہے:

''اُنہوں نے مزید دوائیں تجویز کیں۔ میں وہ دوائیں لینے لپکا اور واپس آیا تو میری دنیا لُٹ چکی تھی''۔ یہ لائن پڑھ کر دِل بھر آتا ہے۔ اِسی طرح جب وقار نیپال کے ایک علاقے میں ایڈز میں مبتلا اُن خواتین کا ذکر کرتا ہے جنہیں ایک بستی تک رہنے میں محدود کر دیا جاتا ہے تو قاری اِن بدبخت نفوس پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ جہاں ہمیں رُلاتا ہے' وہاں اپنی شگفتہ تحریر سے ہنساتا بھی ہے۔ حج کے موقع پر جب حجاجِ کرام جمرات کو کنکریاں مارنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو اکثر اوقات وہاں بھگدڑ مچ جاتی ہے اور کئی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اِس بدقسمتی سے بچنے کے لئے ایک دوست نے جو مشورہ دیا' یہ ہے: ''اور سب کچھ کرنا' بس بھا افضل کی بات نہ ماننا'' حیرت ہوئی کہ کون صاحب ہیں' کسی کتاب میں تو اُن کا ذکر نہیں پڑھا۔ عرض کیا' ''جی میں سمجھا نہیں'' ''بھائی' ہر کتاب میں لکھا ہے کہ فلاں کام فلاں وقت سے پہلے کرنا افضل ہے' خُدا کے لئے اُن کے پیچھے نہ جانا' ورنہ مارے جاؤ گے۔'' اِس بات کا اندازہ جمرات پہنچ کر ہی ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ افضل کے چکر میں پھنس کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

میں جب اِس کتاب کا مطالعہ ختم کر چکا تو پہلا تاثر مجھ پر یہ تھا کہ یہ ایک ایسے صاحبِ کردار' فرض شناس شخص کی کہانی ہے جس میں پورے معاشرے کی رو بزوال تصویر نظر آتی ہے۔ وہ جب بحیثیت اُستاد کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتا ہے تو اپنے شاگردوں کے اذہان کو علم کے نور سے منور کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کالج کے غیر تدریسی دفتری امور کو بھی اتنی ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے نبھاتا ہے کہ ہر پرنسپل ان پر پورا بھروسہ کرتا ہے۔ وہ جس جس کالج میں گئے اُن کے کام کا شہرہ یا بقول اُن کے ''دلدل میں پھنسنے'' کا شوق اُن کے ساتھ گیا۔ وہ جب کیمبلپور کالج سے اِسلام آباد کے ایچ۔۹ کالج میں تعینات ہوتے ہیں تو پرنسپل ڈاکٹر احسن الاسلام (مرحوم) کی نظرِ اِنتخاب اُن پر پڑتی ہے۔ پرنسپل صاحب نے کالج کے خودسر ہیڈ کلرک سے جان چھڑا کر سب کام خود کرنا شروع کر دیا تھا لہٰذا انہیں وقار میں کام کرنے کے تمام جوہر نظر آئے۔ اب اِس کہانی کو وقار کی زبانی سُنئے اور مزا لیجئے: ''جانے کس نے ڈاکٹر احسن کو یہ بتا دیا کہ میں کیمبلپور کالج سے کیوں بھاگا یا وہاں میں کیا کرتا تھا۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ پیار سے مجھے رام کرنا شروع کیا۔ اب ظاہر ہے کہ ملازمت تو میں نے کرنا ہی تھی اور میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر احسن جیسے آدمی کی بات کو ٹال دیتا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار

پھر اُسی دلدل میں دھنستا چلا گیا جس سے جان چھڑا کر آیا تھا۔ مجھے کام کرنے میں لُطف تو آتا تھا بلکہ وہ تو میرے جین میں شامل تھا البتہ دوسروں کی چخ چخ سے مجھے شدید نفرت تھی۔''

وقار خواہ ہری پور کالج میں رہے ہوں یا گوجر خان کالج میں ہر جگہ اُنہوں نے محنت اور لگن سے کام کیا۔ کام کرنے کا شوق جیسا کہ اُنہوں نے خود ہی کہا ہے اُن کے جینز میں شامل تھا۔ جس چیز سے وہ نفرت کرتے تھے وہ دوسروں کی چخ چخ تھی۔ ہمارے لوگوں میں چند ایک ایسی تکلیف دہ قابلِ نفرت بیماریاں ہیں جنہوں نے ہمیں مثبت ترقی کرنے سے روک رکھا ہے۔ حسد' بُغض' کینہ کے علاوہ سیڈ اِزم (Sadism) یعنی دوسروں کو اذیت میں مبتلا کرنا اور اُنہیں اِبتلا میں دیکھ کر لذت لینا۔ وہ نہ خود کام کرتے ہیں نہ دوسروں کو کام کرتا دیکھنا پسند کرتے ہیں اور محنتی اور کام کرنے والے شخص کے خلاف غیبت اور بکواس کرتے رہتے ہیں۔ بس یہی وہ چخ چخ ہے جس کو وقار نفرت سے دیکھتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ جہاں اپنے فرائضِ منصبی خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے وہاں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لاتے رہے اور کم و بیش افسانے سُپرد ِقلم کرتے رہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ یہ اُن کے تخلیقی جوہر ہی کا نتیجہ تھا کہ ہری پور کالج میں ہوتے ہوئے جب اُن کا ایک افسانہ اُن کے نام اور پتہ کے ساتھ شائع ہوا تو ملک کے نامور شاعر حضرتِ قتیل شفائی بہ نفسِ نفیس اُن سے ملنے کے لئے کالج پہنچ گئے۔ یقیناً وقار کے لئے یہ بڑا اعزاز تھا۔

وہ جب تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر وزارتِ تعلیم میں بطورِ افسر جاتے ہیں تو اپنی خُداداد قابلیت' صداقت' محنت اور لگن کی وجہ سے افسرانِ بالا کی نظر میں ایسے ہی آ جاتے ہیں جیسے اسلام آباد ایچ۔۹ کے پرنسپل ڈاکٹر احسن کی نظر میں آئے تھے اور ویسی ہی دوسروں کی چخ چخ کا سامنا کرنا پڑا جیسا کہ اُنہیں دیگر کالجوں میں کرنا پڑا تھا۔ اپنی آپ بیتی میں جس طرح اُنہوں نے کالج کے مختلف پرنسپلوں اور اساتذہ کی فرائض سے غفلت اور لاپرواہی کا ذکر کیا ہے اِسی طرح اُنہوں نے سیکریٹریٹ کی زندگی کے پہلوؤں پر سے نقاب کشائی کی ہے۔ یہاں اُنہوں نے ہوس' حسد' لالچ' خود غرضی' نفس پرستی کے جو دِلخراش مناظر دیکھے اُنہیں نہایت شائستگی اور ہُنر وری کے ساتھ قلمبند کیا۔ وہ چونکہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں لہذا اُن کی ایکس رے لینے والی نظر سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی تھی۔ اُنہوں نے عامتہ الناس کی اپنے رُکے ہوئے کام کے سلسلے میں دفتروں کے چکر لگانے کی تکلیف دہ صورتِ حال کو اور بڑے بڑے عہدوں پر فائض حضرات کی حُبِ جاہ اور حُبِ مال کی خواہشِ بیکراں کو دیکھا اور بڑے قرینے سے ضبطِ تحریر کیا۔ خواندگی کمشن کے چیئرمین نے اپنی کرسی سنبھالتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ دو کمروں کی اندرونی دیوار توڑ اور کمرہ وسیع کر کے اپنا دفتر شاندار بنوالیا۔ اپنی شان کے مطابق باتھ روم کو مزین کیا۔ آرائش و زیبائش کے لئے پرانے فرنیچر کی جگہ نئے فرنیچر سے اپنے دفتر کی زینت کو دوبالا کیا۔ وقار چونکہ طبعی طور پر قوم کا درد رکھنے والے استاذ' افسانہ نگار اور افسر تھے لہذا مشورہ دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اِس مشورہ کی کہانی اُن کی زبانی سُنئے: ''مجھ جیسے بے وقوف کا خیال تھا کہ پرانے فرنیچر کو رنگ روغن اور پالش کرالیا جائے تو رنگ روپ نکھر جائے گا لیکن مجھے اِس کا علم نہ تھا کہ وہ پہلی بار صاحب بنے ہیں' حکومت کا مزہ ابھی چکھ رہے ہیں۔ اُنہوں نے میری تجویز کو جو کمال محبت اور خلوص سے اُن کی خدمت میں پیش کی گئی تھی' ٹھکرا دیا اور نئے ساز و سامان کا آرڈر تیار ہونے لگا۔'' اسے کہتے ہیں' عرفِ عام میں بھولے بادشاہ۔ مزید برآں صاحب بہادر نے پُرانی پجیرو کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے پندرہ لاکھ روپے کے لگ بھگ کی زیرو میٹر پجیرو خرید ڈالی۔ اِس بات کو وقار خاص افسانوی اور انشائی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں: ''ایک روز اور گذرا تو وہی لش لش کرتی گاڑی دفتر کے پورچ میں آن رُکی۔ دفتر کو چار چاند لگ گئے۔ آخر چیئرمین کا دفتر تھا کسی نتھو خیرے کا نہیں۔'' جب صاحب نے چھوٹے کمرے کے برعکس بڑے کمرے کو ترجیح دی تو اِس پر وقار اس طرح تبصرہ کرتے ہیں: ''پتہ نہیں نئے نئے صاحب بننے والے لوگوں کو کمرے کیوں اتنے بڑے درکار ہوتے ہیں' شاید اِرادہ کُشتی کھیلنے یا کھلانے کا ہوتا ہو''۔ اِس چیئرمین نے تو حد کر دی۔ وہ کون سی چیز تھی جسے اُس نے اپنے دفتر کے لئے خرید نہیں ڈالا۔ مہمانوں کی دیکھ بھال کے لئے گریڈ اٹھارہ میں ایک ایف۔اے پاس خاتون کو ملازم رکھا' نئی کراکری اور نیا ساز و سامان پہنچ گیا۔ کولڈ ڈرنکس کا اِنتظام ہوا' عمدہ بیکری سے مطلوبہ خورد و نوش روز آنے لگے۔ یہ اُس غریب نواز پارٹی کے کردار کا ذکر ہے جو غریبوں کے کپڑے' مکان اور روٹی کی فکر میں شاہانہ آسائشوں کے طلبگار تھے۔ مجھے یہاں جارج اورویل کا ناول 'اینیمل فارم یاد آ رہا ہے کہ کس طرح سؤر چھوٹے جانوروں کا جمہوریت کے نام پر استحصال کر کے پُرعیش زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسے متعدد منفی کردار اِس کتاب میں نمودار ہوتے ہیں۔ خواندگی کمشن نے تعلیم کا جو حشر نشر کیا' اُس کا تو ذکر ہی کیا البتہ افراتفری اور لوٹ مار کا بازار خوب گرم رہا۔

وقار نے اگرچہ اِس کتاب کو بطور مورخ نہیں لکھا لیکن ہمارے معاشرے کی سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کے خد و خال اِس میں ضرور منعکس ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے اِرد گرد کی دنیا کو آئینہ دکھایا ہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ساری سیاسی جماعتیں مل کر تحریک چلا رہی تھیں' اُس وقت بھٹو نے اپنی ٹیلی وژن کی تقریر میں بڑے تکبر سے کُرسی کے بازو پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔ ''یہ کُرسی بڑی مضبوط ہے۔'' تو اُس وقت میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ اب بھٹو صاحب گئے۔ دیکھئے' اِس واقعہ کو وقار بحیثیت افسانہ نگار کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ ''جس دن اُنہوں نے کُرسی کے بازو پر ہاتھ مار کر اعلان کیا کہ یہ کُرسی بڑی مضبوط ہے' یار لوگ سمجھ گئے' اُن کا زوال شروع ہو گیا ہے۔'' عجیب اِتفاق ہے کہ جتنے بھی پاکستان میں آمر آئے اُن کے ساتھ

اِس قسم کے چند ایک واقعات ضرور منسلک ہیں۔فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی حکومت کا دس سالہ جشن منایا تو اُس وقت بھی یار لوگ سمجھ گئے کہ آخری گھڑی ہے۔اِسی طرح جنرل محمد ضیاالحق نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ''ہم آسانی سے جانے والے نہیں ہیں۔'' قدرت نے کس طرح اُنہیں آسمان کی بلندیوں میں تباہ کر دیا۔مگر بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی بھی آمر تاریخ سے سبق نہیں سیکھتا۔اقتدار کا نشہ ہی ایسا ہے۔ہمیں اِس کتاب میں پورے معاشرے کی زیریں سطح پر روبزوال تاریخ ملتی ہے۔منفی کرداروں کا از روئے شرافت انہوں نے نام نہیں لیا لیکن اُن کی بداعمالیوں کو بے نقاب کر کے اُنہوں نے معاشرے کو آئینہ دِکھایا ہے۔وزارتِ تعلیم میں کس طرح لوگوں نے وطنِ عزیز کو ناقابلِ یقین نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہے ہیں۔مثبت کرداروں کا ذکر وہ اُن کے نام کے ساتھ کرتے ہیں اور اُن کے کام کو سراہتے ہیں۔اگرچہ بحیثیت افسانہ نگار وہ اپنی تخلیقات میں بیشتر کرداروں اور اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کو یقیناً لا چکے ہیں لیکن وہ اپنی داستانِ حیات میں نہ صرف عام قاری کو شریک کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُن عزیز و اقارب اور دوستوں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں جن کی یادیں جگنوؤں کی طرح اُن کے ذہن میں جگمگا رہی ہیں۔وہ اُن لوگوں کو جو اُن کی زندگی میں ناقابلِ فراموش یاد بن کر آئے' یاد کر کے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے تاریخ کا حصہ بنانے کی آرزو رکھتے ہیں اور یوں قلم کا قرض چکانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔دیکھئے وہ کس محبت سے کہتے ہیں: ''اگر دینے والے نے آپ کو قلم کی قوت عطا کی ہے تو اُن لوگوں کا ذکر ضرور کیجئے جن کا آپ کے ساتھ واسطہ رہا ہے یا دو گھڑی آپ کے ساتھ بیٹھے اور اُٹھ کر چل دیئے' شاید آپ کی تحریر کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کے نام بھی دو چار برس زندہ رہ جائیں۔''

حقیقت میں یہ ایک صاحبِ کردار شخص کی اپنی کتھا ہے جس کی زندگی میں ایسے ناقابلِ فراموش کردار اور واقعات آئے کہ جن کا ذکر وہ نہ کرتا تو منوں بوجھ اُس کے دِل پر رہتا۔اُن کے صاحبِ کردار ہونے کے جگہ جگہ اِس کتاب میں واقعات ملتے ہیں۔اُنہوں نے کرپشن کے پراگندہ ماحول میں اپنے دامن کو بچاتے ہوئے نہایت ہمت' استقلال' دانشمندی اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔یہاں ایک دو واقعات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ایک مرتبہ اُن کے دفتر میں ایک صاحب آئے اور اُن سے کہا: ''اگر آپ مہربانی کریں اور ایوارڈ لیٹر' ٹکٹ اور دوسرے کاغذات وغیرہ مجھے دے دیں تو احسان مند ہوں گا۔'' وقار نے اُن سے کہا: ''اِس میں احسان مند ہونے کی کیا بات ہے۔آپ کے کاغذات مکمل ہیں۔آپ ایسا کیجئے' کل اِسی وقت آ جایئے' آپ کو لیٹر وغیرہ مل جائے گا۔'' وہ صاحب فکر مند ہوئے اور کہنے لگے۔''میں تو یہاں بالکل انجان ہوں اور ٹھہرنے کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔'' وہ شخص بنوں سے رات بھر سفر کر کے آیا تھا اور کسی اور کو دفتر میں جانتا بھی نہیں تھا۔اِس پر وقار نے اُس سے کہا۔''لیٹر کی سولہ کاپیاں تیار ہونی ہیں' ٹائپ کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے' وہ دو بجے آ کر اپنا ایوارڈ لیٹر لے جائے۔'' وقار نے اُسی وقت اپنے اسٹینو اور اکاؤنٹنٹ کو بُلا کر اُن سے درخواست کی کہ سارے کام چھوڑ کر یہ ایوارڈ لیٹر تیار کر دیں۔یہ بات اُس شخص نے بھی سُنی اور سر جھکا کر چلا گیا۔لیٹر اور ضروری کاغذات دو بجے سے پہلے ہی تیار ہو گئے۔اب وہ صاحب آئے اور اپنے کاغذات لے کر چلے گئے۔کوئی دس منٹ بعد اکاؤنٹنٹ وقار کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ خان صاحب پھر آ گئے اور کہتے ہیں کہ وہ سب کو چائے پلانا چاہتے ہیں۔وقار ہنس دیئے اور بولے کہ اُن سے کہو کہ چائے پلانے کا حق ہمارا ہے' وہ ہمارے مہمان ہیں۔لہٰذا خان صاحب کی چائے سے تواضع کی گئی۔جب وہ چائے پی چکے تو فکر مند ہو کر اکاؤنٹنٹ سے پوچھنے لگے ''یہ دفتر اصلی ہے یا جعلی کہ تم نے کام بھی کر دیا' اُس پر چائے بھی پلائی ہے اور اب کہتے ہو کہ جاؤ۔چلا تو میں جاتا ہوں لیکن سچ سچ بتاؤ یہ لیٹر وغیرہ اصلی ہے یا نہیں۔'' اکاؤنٹنٹ نے اُسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو' یہ دفتر اور لیٹر وغیرہ اصلی ہیں۔وہ کہنے لگا کہ جب تمہارے صاحب نے یہ کہا کہ سارے کام چھوڑ کر یہ لیٹر ٹائپ کر دو تو میری ٹانگیں کانپ گئیں کہ ایک تو یہ مرکزی وزارت کا دفتر ہے' دوسرے مجھے وہ لیٹر ملے گا جس کے بل بوتے پر میں پانچ برس امریکہ میں حکومتِ پاکستان کے خرچ پر تعلیم حاصل کروں گا۔اِس پر سارے کام چھوڑ کر میرا کام کر رہے ہو۔۔۔تو۔۔۔یہاں تو معاملہ بہت اونچا ہو گا کیونکہ صرف درخواست آگے بھیجنے کے میرے چھ ہزار خرچ ہوئے تھے تو۔۔۔یہاں پتہ نہیں کتنا مانگیں گے جب کہ میری جیب میں تو صرف چار ہزار رہی ہیں۔'' وقار یہ بات سن کر پہلے تو ہنسے پھر آزردہ خاطر ہو کر سوچنے لگے کہ ''جی چاہا' روؤں' ہماری شہرت اب اِس منزل پر ہے۔'' وقار نے ایک ناواقف شخص کا جینوئن کام کر کے اپنے فرائضِ منصبی پورے کئے جنہیں وہ ہمیشہ پورا کرتے رہے لیکن اِس کے برعکس وقار کو اپنے بارے میں جن اِلزامات کا سامنا کرنا پڑا' اُن میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی کا کام نہیں کرتے اور جب یہی بات اُن کے برادرِ خورد نے اپنے کسی ملنے والے سے کہہ دی تو وقار کو اُنہیں ٹوکنا پڑا کہ جب کوئی اُنہیں غلط کام کرنے کو کہے گا' وہ یہ کام نہیں کریں گے۔اس پر اُن کے بھائی نے اُنہیں جواب دیا: ''آپ کام کر دیں' یہ مت دیکھیں کہ غلط ہے یا صحیح۔۔'' اِس پر وقار اُنہیں کیا جواب دیتے کیوں کہ غرض مندوں کو بے بس ہو کر افواہ پھیلانے کی ضرورت پیش آتی ہی ہے۔۔۔

دراصل وقار کی شخصیت میں افسانہ نویس' پروفیسر اور بیوروکریٹ کا حسین اِمتزاج ہے۔وہ جب وزارتِ تعلیم میں بطور آفیسر گئے تو اپنے ساتھ تہذیبی روایات' اخلاقی اقدار' ثقافتی وراثت' تدریسی کردار اور تخلیقی صلاحیت بھی لے کر گئے اور ایک لحہ کے لئے بھی اُنہوں نے اپنے فن سے وابستگی کو فراموش نہیں کیا۔ادیب ہونے کے ناطے اُن کا نظریہ یہ ہے کہ ''ایک اچھے ادیب اور اچھے عالم کو ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہئیے۔'' اپنے اِس اصول کو اُنہوں نے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا اور اپنے تئیں بھرپور کوشش کی کہ خواندگی کے معاملے میں

ملک میں تعلیم کا بول بالا ہو۔امتحانات میں نقل مافیا ختم ہو،پرچے آؤٹ نہ ہوں۔نقل کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے اُنہوں نے متعدد بار شمالی علاقہ جات کے سفر بھی کئے اور اِس عظیم کام میں بعض اوقات انہیں ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔یہاں تک کہ تھک ہار کر نڈھال ہو گئے اور بے اختیار پکار اُٹھے۔''ماں،میں تھک گیا ہوں'' یہ ایک چیخ ہے جو اُن کے حلق سے نکلی اور کتاب کی شکل میں ڈھل گئی۔اس کتاب میں ہمیں جگہ جگہ افسانے کا سا وحدتِ تاثر،ناول کا سا فلسفہ حیات اور پلاٹ اور کردار نگاری اور ڈرامے کے سے انتظار یہ لمحات ملتے ہیں۔اس پر مستزاد ان کا انشائی اسلوب نگارش ہے جس میں کشادگی اور غیر رسمی اندازِ تکلم ہوتا ہے۔جس طرح انہوں نے اپنے والدِ گرامی اور اپنی پیدائش کا ذکر کیا وہ بالکل انشائی انداز میں بے تکلفانہ ہے یہی وجہ ہے کہ ساری کتاب میں دوستانہ فضا کا غلبہ ہے جس سے قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔افسانوی وحدتِ تاثر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں:''میں نے سیکریٹریٹ ڈی بلاک کی کھڑکی سے باہر املتاس کے درخت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔جب میں اِس عمارت میں وارد ہوا تھا(تقریباً تیس برس پہلے)تو یہی درخت میری توجہ کا مرکز بنے تھے۔برسات کا موسم گذر چکا تھا اور درختوں پر سبزہ ہی سبزہ تھا البتہ ٹہنیوں اور شاخوں پر املتاس کی یہی پھلیاں لٹک رہی تھیں۔۔اِتنا عرصہ گذر گیا،کئی بہاریں آئیں اور چلی گئیں،کتنی بار روشوں پر پھول کھلے اور مرجھا کر کیاری کا ہی کھاجا بن گئے لیکن۔۔۔۔درخت آج بھی اُسی شد و مد سے پھلیاں لٹکائے تھے البتہ خود تھوڑے سے بوڑھے لگ رہے تھے۔''اور اب ایک جھلک کردار نگاری کی دیکھئے:''اماں بلا کی قناعت پسند تھیں،جو ملا پہن لیا،جو سامنے رکھا کھا لیا،کوئی پسند نہیں،کوئی تقاضا نہیں۔لیکن اُس دور میں جب ہمیں ابھی پر نہیں لگے تھے اور رہم ایک اُسی چولہے کے طلب گار تھے تو میں نے انہیں کبھی ڈھنگ سے بیٹھ کر کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔دوپہر سے بھی پہلے وہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر دوپہر کے کھانے کا اِنتظام کرنا شروع کرتیں تو ہم سب ایک ایک کر کے بھوکے بھیڑیوں کی طرح گھر میں اُترنا شروع کر دیتے۔اماں وہیں اپنے پاس باورچی خانے میں بُلا لیتیں اور سب کو باری باری کھانا کھلاتی رہتیں۔ہم کہتے تو ایک ہی جواب ملتا،وہ تمہارے ابا کے ساتھ،لیکن ہم نے انہیں ابا کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر کھاتے نہیں دیکھا۔اُن کا کھانا اُن ایک ایک دو دو لقموں تک محدود تھا جو ہمارے ساتھ اُٹھا لیا کرتی تھیں۔۔۔''اب ایک جھلک اُن کے اِنشائی اندازِ تفکر کی ملاحظہ کیجئے:''ایک روز شام کے وقت تھوڑی بہت چہل قدمی کے بعد واپس آیا تو راستے میں بے شمار گرے ہوئے پتے دیکھے،خیال آیا،خزاں کی آمد آمد ہے(عمر جوں جوں بڑھتی ہے،موسموں کے آنے جانے اور تبدیلی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہونے لگتا ہے،پہچان بھی ہو جاتی ہے)ایک موسم اپنی بساط لپیٹ رہا ہے اور دوسرا اپنی آمد کا اعلان کر رہا ہے۔پھر ایک دن آئے گا جب دوسرا موسم بھی اپنا سب کچھ اِس کائنات کے حوالے کر کے رُخصت ہو جائے گا اور اُس کی جگہ ایک اور۔۔۔۔۔پھر اِس کی جگہ ایک نیا موسم۔۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے،وقار نے ساری زندگی سفر کرتے گزار دی۔یہ سفر اُنہوں نے اپنے باطن میں بھی کیا اور خارج میں بھی۔یہ کتاب اِس طرح اُن کے سفر در سفر کی کہانی بھی ہے۔یہ سفر اُنہوں نے بچپن میں بھی کیا اور جوانی میں بھی اور اب بڑھاپے میں بھی کر رہے ہیں۔دورانِ ملازمت اُنہوں نے نہ صرف اپنے ملک کے تمام صوبوں کے سفر کئے بلکہ بیرونِ ملک بھی قیام کیا۔چین میں ریڈیو بیجنگ سے منسلک ہو کر دو سال گزارے اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کا بھرپور مطالعہ کیا۔سوویٹ یونین میں ثقافتی تبادلوں کے سلسلے میں چند روز قیام کیا اور وہاں اِشتراکی زندگی کا مشاہدہ کیا۔نیپال کے مختصر سفر میں وہاں کے معاشرتی ماحول کو دیکھا۔امریکہ،فرانس اور انگلینڈ کے سفروں کے دوران یورپی تہذیب و تمدن کا مشاہدہ کیا،حج و عمرہ کی سعادت حاصل کی اور روحانی برکات سے فیض یاب ہوئے۔جس شخص نے اپنی عمرِ عزیز میں اتنے سفر کئے ہوں اُس کی ذہنی ترفع کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔اِس کتاب میں اُنہوں نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ پیش کر کے قلم کا حق ادا کر دیا ہے۔میری دانست میں یہ کتاب نہ صرف ایک ادبی شاہکار ہے بلکہ مصنف کے ذاتی مشاہدات و علمی تجربات،قلبی کیفیات،اِصلاحی خیالات اور فکری تاثرات کی دستاویز ہے۔۔

۔ وبائے جان ۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی ایک تہائی آبادی سے زیادہ لوگ سگریٹ نوشی کی لت میں گرفتار ہیں۔اس سے بھی زیادہ فکرمندی کی بات یہ ہے کہ اس تعداد میں ہر روز ایک لاکھ نئے سگریٹ نوشوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔عالمی ادارہ صحت کے مطابق کثرتِ سگریٹ نوشی کے باعث گلے،چھاتی،معدہ،آنتوں اور گردے کے امراض میں مبتلا ہو کر ہر سال موت کا شکار ہونے والے انسانوں کی تعداد 60 لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔سگریٹ نوشی کے خلاف جلد کوئی موثر اور مربوط تحریک نہ چلائی گئی تو موجودہ صدی کے اختتام تک سگریٹ نوشی سے مرنے والوں کی تعداد ایک ارب تک پہنچنے کا خدشہ ہے۔یاد رہے سگریٹ نوشی پر ہر سال قریب پانچ سو ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رقم اس کے علاج پر خرچ ہوتی ہے۔

''عروج وزوال کی داستان''

احمد جاوید
(اسلام آباد)

وقار بن الٰہی کے افسانوں کے دو مجموعے ایک ہی برس ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔''کس سے کہے وہ'' میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء کے دوران لکھے گئے افسانے شامل ہیں جب کہ ''اُتر نا دریا میں'' کی کہانیاں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔۔یہ محض اتفاق ہے یا اس کا کوئی جواز بھی ممکن ہے کہ جو زمانی تقسیم ان مجموعوں میں روا رکھی گئی ہے وہ ہمارے ہاں ایک مخصوص سیاسی پس منظر کے ادوار کی بھی تقسیم ہے۔۔۔۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء کا زمانہ ایک سابق صدرِ پاکستان ایوب خان کے فوجی آئین کے آغاز اور انجام کا زمانہ ہے۔یہ وہی عہد ہے جب قریباً ایک صدی پر محیط سیاسی تحرک سکوت کا شکار ہوا۔معاشرتی اقدار کے اِظہاری وسیلے ناپید ہوئے اور کوئی طوفان اندر ہی اندر پرورش پانے لگا۔جبکہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان کا عرصہ اپنے پہلے دور کے برعکس اپنے ساتھ زیادہ متشدد رویئے اور انتہا درجے کی سیاسی حرکت پذیری لے کر آیا جس نے اقدار کو باہم متصادم کیا اور طاقت کے عروج وزوال کی نت نئی داستانیں رقم کیں۔

اگر سیاسی بحث کو درمیان سے نکال بھی دیا جائے تب بھی یہ حقیقت پیشِ نظر رکھی جاسکتی ہے کہ ہمارے ہاں ۱۹۷۰ء سے قبل اور بعد کے دور میں کم از کم معاشرتی اقدار اور اسلوبِ حیات کے حوالے سے ہی سہی ایک خطِ امتیاز ضرور موجود ہے جس نے ہمارے ملک کے آدمی کو ہر سطح پر متاثر کیا۔وقار بن الٰہی کے افسانوں میں اس خطِ امتیاز کو کسی قدر واضح اور نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

وقار بن الٰہی کے افسانے کا سفر نیم دیہی؍نیم قصباتی ماحول سے شروع ہوتا ہے اور اِبتدأ میں ایسے گرے پڑے اور بچھڑے ہوئے کردار سامنے آتے ہیں جو اپنے ہی محدود دائرے کے اندر اپنے ہی جذبوں میں گھرے ہوئے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بڑے بڑے دُکھوں میں بدلتا دیکھتے ہیں اور بے بسی اور بیچارگی سے ہاتھ مل کر رہ جاتے ہیں۔یہ وقت کی گردش اور تقدیر کے کھیل کا زمانہ ہے۔جو اُفتاد پڑتی ہے نا قابلِ فہم ہے اور دنیا حیرت کدہ ہے۔

اس زمانے میں وقار صاحب کے لئے کرداروں کی اہمیت زیادہ ہے۔وہ وقوعوں سے کہانی نہیں بناتے زیادہ تر کردار سازی پر توجہ دیتے ہیں۔یہ بات ایک اعتبار سے کسی سماج میں فرد کی فردیت کی اہمیت پر کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔شاید اِسی لئے انسانی رشتوں کا آپس میں ربط اور پھر شکست وریخت پہلے مجموعے کا محبوب موضوع رہا ہے۔۔مگر پھر زمانہ بدلتا ہے اور اِسی کے ساتھ ہی اُن کے افسانوں کا سفر بھی ایک نئی سمت کو مُڑ جاتا ہے۔اب وہ نیم دیہی اور نیم قصباتی ماحول سے نکل کر صنعتی اور شہری ماحول میں داخل ہوتے ہیں جہاں زندگی آپا دھاپی اور نفسانفسی کا شکار ہے۔جذبے پر عقل کی فرمانروائی ہے اور عقلیت زدہ ماحول میں اقدار کی صورت شناخت کرنا دشوار ہو گیا ہے۔یہ ایک دوسرا زمانہ ہے۔

اس دوسرے دور میں وقار صاحب کی توجہ کرداروں کی بجائے ماحول کی طرف مرکوز ہوئی ہے۔اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسے زمانے میں داخل ہوئے ہیں جب فرد اپنی اہمیت کھو رہا ہے اور اجتماع کا غوغا بڑھ رہا ہے۔۔موضوعات تبدیل ہو رہے ہیں؛اسلوبِ حیات بدل رہا ہے۔جب زندگی کا چلن بدلتا ہو تو پھر ہر شعبے کی ہیئت میں تبدیلی آتی ہے۔ایسے میں فن کیوں جامد رہے گا جبکہ موضوعات بھی بدل گئے ہیں۔

وقار بن الٰہی نے ۱۹۶۹ء تک حقیقت نگاری سے اپنا تعلق مستحکم رکھا ہے مگر ۱۹۷۰ء کے بعد اُن کے موضوعات کو کچھ اور بھی وسعت درکار ہوئی۔۔۔ستر کی دہائی ہمارے ادب میں نئے تکنیکی تجربوں اور نئی نئی جہتوں کی تلاش کی دہائی بھی ہے۔خصوصیت کے ساتھ اُردو افسانے نے علامت کا جو سفر ۱۹۶۰ء میں ڈرتے ڈرتے شروع کیا تھا وہ ستر میں پورے جوبن پر تھا۔۔وقار کے افسانے نے اس جوبن کو بھی دیکھا ہے۔سو وہ ایک سوال کہ ان دو مجموعوں میں جو زمانی تقسیم روا رکھی گئی وہ اپنے اندر کیا معانی رکھتی ہے؛مجھ پر یوں کھلی ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ وقار بن الٰہی کا فن جو گذشتہ نصف صدی پر محیط ہے اور جو ان دو مجموعوں کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے؛اُس کے ایک ایسے سفر کی داستان ہے جو جذبے سے احساس کی طرف' کردار سے وقوعے کی طرف اور حقیقت سے علامت کی طرف ارتقاً کرتا ہے اور اس طرح ایک اعتبار سے یہ داستان اس کے افسانے کی ہی نہیں ہمارے ہمارے معاشرے کی بھی ہے۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء کے دوران لکھے گئے افسانوں پر مشتمل اُن کے مجموعے ''کس سے کہے وہ'' میں اُنیس افسانے شامل ہیں۔۔یہ عجیب اتفاق ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی زیادہ تر کہانیاں فنی اعتبار سے کرداری کہانیاں ہی کہے جانے کی مستحق ہیں۔ان افسانوں میں وقار صاحب کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ کسی ایک فرد کی کہانی بیان کرتے ہیں اور پھر اُس پر گذرنے والی بپتا کی مدد سے اُسے ایک قالب سے دوسرے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔

یہ معاشرے کے عام طور پر غیر اہم لوگ ہیں اور اُن کا اثاثہ کوئی

ایک رشتہ ہے۔اسی اعتبار کے سہارے وہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی سے ہی اُن کی شناخت وابستہ ہوتی ہے۔شناخت کے کھو جانے اور گم ہو جانے کا المیہ جن جن صورتوں میں ظاہر ہواُ ہے'افسانہ بنا ہے۔''انتظار''،''اپنا گھر'اپنی آگ''،''کس سے کہے وہ''،''اکیلا''،''دوآنکھ مندگئیں''،''دُکھ کے سپنے''،اور''طوفانِ خوابیدہ''سب ایسے کرداروں کی کہانی ہے جو کسی ان دیکھے جبر کا شکار ہیں اور بلا شُبہ ہمدردی کے طالب ہیں۔

ہمدردی کے طالب ان کرداروں میں ''دیقا''،''کالے خان''، ''خالق''،''نواز''،''شرفو''،اور''زیدی'' سبھی شامل ہیں جنہیں اپنی طمانیت کے لئے بہت تھوڑی سی خوشی درکار ہے اور اِس تھوڑی سی خوشی کے لئے وہ اپنا کچھ بھی قربان کرنے کو آمادہ رہتے ہیں لیکن زندگی کو تو عجب کھیل کھیلنے کا لپکا ہے جس کے باعث یہ سادہ دل لوگ کبھی کبھی خود کو تلاش کرتے ہوئے اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ خود اُنہیں اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے۔مگر اہم بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں اس اپنے آپ میں مگن دنیا میں زندگی کرنے کی کوئی چھوٹی سی راہداری مل جاتی ہے'طمانیت کا سامان ہو جاتا ہے۔

''کس سے کہے وہ'' کے بیشتر افسانوں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔اس مجموعے میں ایسی کہانیاں بہتات سے ملتی ہیں جن میں عورت ہم پر اپنے کئی پہلو آشکار کرتی ہے۔تلذذ پسند'عیش پسند'منتقم مزاج' کمزور'طاقت ور۔۔غرض وقار بن الٰہی نے اپنے معاشرے کی عورت کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔'انتظار' کی مجی جو اپنے محبوب شوہر سے اِس لئے طلاق لیتی ہے کہ اُسے ایک طویل عرصہ انتظار کا یارا نہیں۔'اپنا گھر اپنی آگ' کی چاندنی جو اپنے سسر کے پہلو میں سوتی ہے اور اُس پر شرمسار بھی نہیں جبکہ 'کس سے کہے وہ' کی عورت کو یہی مسئلہ درپیش ہواُ تو وہ اتنی کمزور نکلی کہ کسی سے اپنا دُکھ کہنے کے قابل بھی نہ رہی اور 'کالی عورت' کی عورت نے اس طاقت کا مظاہرہ کیا کہ بے وفائی کے جرم کے انتقام میں اپنے محبوب کو اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاک کر دیا۔۔'طوفانِ خوابیدہ'، 'دکھ کے سپنے'، 'مانگ کا سیندور'مردوں کے اس معاشرے میں سب عورت کے مختلف روپ ہیں۔۔۔کہیں زندگی اُن کو مات دے دیتی ہے' کبھی خود اُن کے ہاتھوں مات کھا جاتی ہے۔

اردو میں مقصدی ادب کی روایت اب نہ صرف قدیمی ہے بلکہ بوجوہ مستحکم بھی ہے۔سر سید احمد خاں' پھر پریم چند اور بعد میں ترقی پسند تحریک اس کے استحکام کا باعث بنے ہیں۔۔۔کچھ اِس روایت کے سبب اور کچھ اِس خطے کے مخصوص حالات۔یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں اِصلاح پسندی اور انقلاب پسندی کا رویہ زیادہ پختہ ہواُ جس سے موضوعات کی حد بندی سی ہو گئی ہے۔ہر فرد اور ہر واقعہ اہم نہیں رہا تاوقتیکہ وہ کسی نظریاتی یا فکری فریم میں نہ آتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں کرداروں اور واقعات میں اپنے مخصوص موضوعات کے زیرِ اثر انتخاب کرنے کا رویہ پروان چڑھا ہے۔

وقار بن الٰہی کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں کیا جانا چاہیے جو انتخاب کے مخمصے میں پھنس کر محدود نہیں ہوتے بلکہ زندگی کو متنوع دیکھتے ہیں اور اس طرح ہر کردار اور ہر واقعے میں کہانی تلاش کر لیتے ہیں۔

''کس سے کہے وہ'موضوعات کے اعتبار سے اپنے اندر تنوع کا حامل مجموعہ ہے۔ہر کردار اپنی انفرادیت اور اپنی شناخت کے ساتھ زندگی کرنے کی خواہش کرتا یا جدوجہد کرتا دکھائی دیتا ہے۔یہ ہمارے معاشرے کے مختلف روپ ہیں اور یہ اس دنیا کے مختلف رنگ ہیں۔

مختلف رنگ سمیٹتے ہوئے وقار بن الٰہی کو کسی ایک جگہ رُکنا نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں'ہمیں اُن کے آنے والے دور کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔۔''پرایا دوزخ''،''اکیلا''،''پاگل مودی''،''ڈولی ڈارلنگ''۔۔۔یہ وہ چند کہانیاں ہیں جن کا براہِ راست تعلق معاشرتی اقدار سے ہے۔اُن اقدار سے جنہیں آگے چل کر اور بھی غیر مانوس شکل اِختیار کرنا تھی۔سو اِس طرح اُن کا بنیادی تفکر درحقیقت اِنہی کہانیوں کی مدد سے ہم تک پہنچا ہے۔

''جس معاشرے میں آج میں زندہ ہوں' یہ میرا تخلیق کردہ نہیں ہے لیکن اس دوزخ میں مجھے زندگی بھر جلنا پڑا ہے۔۔اسی دوزخ میں تمہیں بھی جلنا ہوگا' گو یہ دوزخ تمنے نہیں بھڑکایا لیکن جلنا ضرور پڑیگا۔۔اور اِسی کا تو مجھے دُکھ ہے۔۔''

(پرایا دوزخ)

یہ ایک باپ کی اپنے بیٹے سے گفتگو ہے جو اُس کے مستقبل میں نہیں اُس کے معاشرے کے مستقبل میں بھی جھانک رہا ہے۔

ہمارے معاشرے نے جب کروٹ لی تو ایک دوسری سمت کا اُسے سامنا تھا۔سیاسی اور سماجی سطح پر نئے مسائل درپیش تھے اور اقدار کی شکست و ریخت اپنے اِنتہا پر تھی۔بدترین آمریتیں' سیاسی انتشار' طبقاتی بُعد ان سب نے مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس کی اخلاقیات کو ابھی تک کوئی اچھا سا نام نہیں مل سکا ہے۔وقار بن الٰہی کا دوسرا مجموعہ (جسے وہ تیسرا کہتے ہیں) اِسی نئے عہد کے رویوں کی کہانی سناتا ہے۔

''اُترنا دریا میں'' کے افسانوی کینوس پر وقار بن الٰہی محض ایسے داستان گو کی صورت نہیں ہے جو صرف دوسروں کی بپتا بیان کرتا ہو بلکہ یہاں اُن کے وسیع تر تجربات نے اُنہیں نقاد کا رویہ بھی عطا کیا ہے۔۔۔ایک بر خود غلط معاشرے میں رہتے ہوئے فنکار کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔انہوں نے اپنے پہلے مجموعے میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی نہیں کی اور سماج جس صورت میں بھی ہے اُسے بلا کم و کاست بیان کیا ہے۔مگر اب اُن کے لہجے میں طنز بھی شامل ہواُ ہے۔گویا اب وہ اس مقام پر ہیں جہاں اپنی بدلتی ہوئی اقدار پر گہرا تفکر کرنا لازم ہواُ ہے۔وہ بڑے کرب سے دیکھتے ہیں اور ملال کرتے ہیں کہ یہ اس

زمانے کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔اُن کی مشکل یہ ہے کہ لالچ' ہوس اور مفاد پرستی کے بڑھتے آتے عفریت کے سامنے اُن کے کرداروں کا عزت سادات بچانا مشکل ہو گیا ہے۔

ہمارا شمار اُن قوموں میں ہوتا ہے جو کسی مرکزی فکر سے عاری ہوتی ہیں۔قومی حیات کے پیچھے کوئی فلسفہ کام نہیں کرتا۔صرف لمحہ موجود سے غرض ہوتی ہے' ماضی اور مستقبل سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔۔دفتری کلچر کے پس منظر میں لکھی ہوئی اُن کی کہانیاں ''بوڑھوں کا سال'' اور ''اتنی سی بات'' اس ملمع کاری پر ایک گہرا طنز ہے۔۔مگر یہ طنز اُس وقت اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب ہم ''زندگی کی رمق'' اور ''یہ عالم شوق کا'' جیسی نہایت بلیغ علامتی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

''یہ عالم شوق کا'' میں آدمی کی مثال اُن چوہوں کی سی ہے جنہیں تقدیر نے چینی سے بھرا ہوا گودام عطا کر دیا۔اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اِس سے اُن کی بھوک کو قرار آ جاتا مگر ہوا یہ کہ اُن کی ہوس نے ایک اور ہی راستہ اختیار کر لیا۔پھر اگلی صبح اُن کی لالچ کا انجام لے کر آئی۔اُنہوں نے بوریوں کو تو کُتر ڈالا مگر خود آپس میں لڑ بھڑ کر اپنی ہی نخوت کا شکار ہو گئے۔۔تو یہ منزل ہے گم گشتہ کارواں کی۔

''زندگی کی رمق'' میں ہماری مثال گِدھوں کی سی ہے' گِدھ اگر مُردار خور ہوتے ہیں تو اِس میں عجب کیا ہے کہ یہی اُن کی فطرت ہے لیکن اگر وہ زندہ لوگوں پر جھپٹنا شروع کر دیں تو سمجھئے وقتِ دعا آ پہنچا۔وقار بن الٰہی کا یہ افسانہ ہمارے عہد کی ایک ایسی نمائندہ کہانی ہے جسے تاریخ کے طالب علم کو بھی ضرور پڑھنا چاہئے۔یہ اُن کی داستان ہے جو ہوس پرستی میں زندہ اور مردہ کی شناخت کھو بیٹھتے ہیں:

> ''ہم تو مردار کا گوشت کھانے والے ہیں لیکن بھوک نے ہمیں اندھا کر دیا ہے' دیکھتے نہیں' جس کا گوشت تم ابھی نوچ کر آئے ہو' اُس کی آنکھوں میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے۔۔۔''

یہ ایک بوڑھے گِدھ کا بیان ہے جسے اپنے ساتھیوں کو اپنی فطرت کے خلاف ایک زندہ جانور پر جھپٹتے دیکھ کر قدرے شرمندگی محسوس ہوئی ہے۔

وقار بن الٰہی کا علامت کی طرف رجوع اُن کے موضوعات کے سبب ہوا' اور یہی صائب بھی تھا۔ساٹھ اور ستر کی دہائی کے افسانہ نگار جب غیر روائتی افسانہ لکھنے میں مصروف ہوئے تھے تو اُنہیں بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال اور اپنی شناخت سے ہٹتے ہوئے کردار جس مخمصے کا اظہار کر رہے تھے وہ محض حقیقت نگاری سے گرفت میں آنے والے نہیں تھے۔نئے سوالات کو نئے اسالیب کی ضرورت تھی' ایک نیا لحن درکار تھا۔

یوں تو ''اُتر نا دریا میں'' کی بیشتر کہانیوں میں علامت کا التزام رکھا گیا ہے مگر چند کہانیاں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جس سے ہمیں اُن کے سنجیدہ موضوعات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔دو کی مثال تو پہلے بیان ہوئی علاوہ ازیں ''سانپ کی موت''، ''اپنی اپنی صلیب''، ''نئی زندگی'' اور ''بٹوارہ'' بھی اپنی فکر کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہیں؛

ان سب کہانیوں کے مرکز میں طاقت کے کھیل کی کارفرمائی ہے۔سب کو بقاٗ کی جنگ درپیش ہے۔۔جس سے دنیا ایک عجیب طرح کی اُتھل پتھل کا شکار ہو گئی ہے۔۔

> ''وہ جو آگے جا رہا تھا' اب سب سے پیچھے رہ گیا ہے۔پہلے اُس کی ایک پہچان تھی کہ وہ سب سے آگے ہے۔اب اُس کی کوئی پہچان نہیں کہ وہ سب سے پیچھے ہے۔پیچھے رہ جانے والوں کو بھلا کون پہچانتا ہے۔۔'' (اپنی اپنی صلیب)

وقار بن الٰہی تیزی سے پھیلتے ہوئے صنعتی شہری ماحول میں جو تنہائی محسوس کرتے ہیں وہ SPIRITUAL ISOLATION کے شکار ہر انٹلکچوئل کی تنہائی ہے۔اُنہوں نے اپنے سامنے زمانے کو اپنا چہرہ بدلتے دیکھا' قدروں کو پامال ہوتے برداشت کیا۔۔شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں رشتوں کی بڑی اہمیت ہے وہ رشتے جو محبت کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔اسی میں انسان کی بقاٗ ہے اور اسی لئے وہ ملول تو ہوتے ہیں مگر انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوتے۔

یہ بات اہم ہے کہ اپنے پہلے مجموعے میں رشتوں کی جو اہمیت اُنہوں نے اپنی ذات سے باہر دیکھی تھی اب اس دوسرے مجموعے میں خود اُن کے اپنے تجربے کا حصہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔''اُتر نا دریا میں'' اور ''بے بسی'' ایسی دو کہانیاں ہیں جن میں گوشت سے ناخن کے جدا ہونے کا عمل پوشیدہ ہے۔یہ ذات کے اپنے ہی اندر گم ہونے کا عمل ہے اور پھر ایک گہری چُپ ہے جو پورے وجود پر پھیل جاتی ہے۔۔یہ ایک طرح کی کہانیاں ہیں مگر اِسی ضمن میں دوسری طرح کی کہانیوں میں ایک اور جذبہ جنم لیتا ہے اور ایک نئی جہت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''دیسی صابن کی بُو'' اور ''میں کیا ہوں'' کی طرح کی کہانیوں میں کردار اپنی ذات سے دوبارہ پھوٹتے ہیں اور زندگی کے تسلسل کے جاری رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔

وقار بن الٰہی نے ۱۹۵۵ء میں لکھنے کا آغاز کیا تھا یعنی قریب قریب اسی وقت جب اُردو افسانے کا ایک زریں عہد کہ جس کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک بھی تھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا اور محمد حسن عسکری افسانے کے زوال کا اعلان کر رہے تھے۔اس زوال کے اعلان کے اسباب کیا تھے' اسے تو کسی ثقہ نقاد کے لئے چھوڑیئے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی عہد کے معدودے چند افسانہ نگاروں نے آگے چل کر نئے رجحانات اور نئے رویوں سے اردو افسانے کو مالا مال کیا۔۔۔بلاشُبہ وقار بن الٰہی کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے افسانے کو زوال سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔۔

پنکھڑی کا گداز

حمید شاہد
(اسلام آباد)

اِنتظار حسین نے حال ہی میں گزشتہ صدی کے اہم جاپانی افسانہ نگار اور ناول نگار یونی چیروتانی زاکی کی جو کہانی ''مکڑی کا جال'' کے عنوان سے ترجمہ کی ہے اُس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ گزر چکی صدی کے آغاز میں لکھی گئی تھی' لگ بھگ اسی عرصے میں جب اُردو افسانہ پنجوں کے بل چل رہا تھا۔ یہ جاپانی کہانی ایک نوجوان گودنے کے گرد گھومتی ہے۔ یکتائے روزگار گودیا سٹی کیچی جو یوں بدن گودتا تھا کہ سارے نقوش گداز اور ندرت کے طلسم سے جاگ اُٹھتے تھے۔

ایک صدی کی معقول عمر پالینے والی ہماری کہانی کا بدن بھی کچھ ایسے ہی گداز اور ندرت کا متمنی رہا ہے۔ بخت کی یاوری دیکھئے کہ یہ سب اس کا مقدر بنا بھی' تبھی تو اس میں زندگی کی گونج باقی اصناف کے مقابلے میں ذرا زیادہ توانا ہے اور قدرے صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے باوصف یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ وقت کے کچھ مخصوص اور محدود ٹکڑوں میں کہانی کے بدن پر نقش ہی نقش گونجنے لگے' لذت منہا ہو گئی یا پھر لذت ہی لذت رہ گئی۔۔ زبان کی لذت' بیان کی لذت یا باطنی آشوب کی لذت۔۔ رہے کہانی کے سارے نقوش تو وہ ادبدا کر گڈ مڈ ہو گئے۔

وقار بن الٰہی کے وہ اکاون افسانے جو تین مختلف مجموعوں ''اُترنا دریا میں'' (1992) ' ''کس سے کہے وہ'' (1992) اور ''چاہ درپیش'' (2000) میں جگہ پا کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں' زماں کی اسی ہنگامہ خیز بھُلکی میں تخلیق ہوئے ہیں۔ زیادہ تر افسانوں کا زمانہ ماضی قریب کا وہ عرصہ ہے جس کے بارے میں اپنی جانب سے کچھ کہوں گا تو لائق گرفت ٹھہروں گا۔ لہٰذا ''نیا پاکستانی افسانہ' نئے دستخط'' کے نام سے ۱۹۸۳ء میں دہلی سے چھپنے والے انتخابات کے پیش لفظ سے چند جُملے پڑھ لیجئے:

''جب برساتی خس و خاشاک دم توڑتی ہوئی لہروں کے ساتھ اپنے اپنے کناروں تک جاتے ہیں اور صاف نتھرے ہوئے پانی میں کنول اور کر یموا کھلنے لگتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس دور میں گاڑا پاٹ پودے بھی پیدا ہوتے ہیں' جو آہستہ آہستہ زمین کو بلند کرتے جاتے ہیں اور پانی کم سے کم ہوتا جاتا ہے لیکن یہ عمل سالہا سال کے عمل دخل کے بعد ہوتا ہے۔ فی الوقت اُردو کی صورتِ حال یہی ہے کہ شور شرابہ تقریباً ختم ہو چکا ہے' یعنی اب راتوں رات شہرت کا امکان نہیں کے برابر ہے۔''

طُرفہ تماشا دیکھئے کہ جب شہرت بٹ رہی تھی تو وقار بن الٰہی نے اُدھر دھیان نہیں دیا اور جب مشہور ہونے کا زمانہ لد گیا تو وہ یکے بعد دیگرے چار کتابیں اور ایسی کتابیں دے چکا ہے جن میں نہ تو جنسی کشاکش ہے' نہ کہانیوں سے برگشتی باطنی اُلجھاؤ وں کا مجرد نوحہ۔۔۔ اور حیرت یہ ہے کہ کہانی کے وجود پر تین حرف بھی نہیں بھیجے گئے ہیں اور نہ ہی گزر چکے وقت پر ملامت کی گئی ہے۔۔ عام' بے ضرر سی کہانیاں جو کہیں بھی مشتعل نہیں کرتیں اور عین ایسے زمانے میں لے آنا کہ راتوں رات شہرت ہتھیانے کا زمانہ بھی بیت چکا ہو' مجھے یہ باور کرانے کے لئے کیا کافی نہیں ہے کہ وقار بن الٰہی ہونہ ہو اپنے ہم عصروں سے بچھڑا ہوا افسانہ نگار ہے۔

جن دنوں یونی چیروتانی زاکی کی کہانی کا گودیا سولہ سترہ برس کی حسین لڑکی کے خوبصورت پاؤں دیکھ کر اُسے بتا رہا تھا کہ یہ پاؤں اُس نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے' عین اُسی عرصے میں ہمارے ہاں کا کہانی کار داستان' قصے' کہانی اور تمثیل کے پائچوں سے جھانکتے کہانی کے وہ ننگے قدم دیکھ رہا تھا جو ادھر برطانیہ' فرانس' روس' امریکہ' جرمنی میں گداز قالینوں پر چلتی رہی تھی۔ یہ جو کہانی کے پاؤں دیکھنے کا عمل ہے' پا پرستی' عضو پرستی اور اشیأ پرستی یعنی Fetishism کی حد تک پاؤں دیکھنے کا عمل۔۔ یہ تین دہائیوں سے بھی کچھ زیادہ ہی عرصے پر محیط رہا' متی کے بھاری پائچوں سے جھانکتے قدم کچھ اور باہر نکل کر پٹخنے لگے' چنگاریاں اُڑیں' انگارے دہکے' لذت کا چٹخارہ نعرہ بن گیا۔۔ ایسا نعرہ جو آجکل کی Feminism کا پھریرا اُڑاتی عورت اپنے ہی حُسن سے باغی ہو کر لگاتی ہے۔ جب اندر کچھ نہ رہا اور سب کچھ بقول ممتاز مفتی حلوائی کی دکان کی طرح باہر تھالوں میں سج گیا تو وہ نسل اُٹھی جس نے اپنے تیئں باہر کی تندی خالی ہو کر سبک ہو چکے اندر کی سمت موڑ دی۔ ملامت' استعارہ' تجرید' نئی حقیقت نگاری' تشکیک' باطن' ہیجان اور ارتکاز جیسے الفاظ لُغت سے نکل کر قلم اور زبان کی انیوں پر ناچنے لگے۔۔ یوں کہ بوبئے میں بند کہانی کی کمر' سینہ' پنڈلیاں ماپنے کا کوئی رائج پیمانہ مستند نہ رہا۔ کہاں آغاز ہے' کہاں وسط اور کہاں انجام' کسے ہوش تھا کہ تلاش کر کے فیتے لگاتا' سبھی اس میں بہہ گئے تھے۔ تعجب ہے وقار بن الٰہی کیسے بچ گیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اس کسان کی طرح ہے جو آسمان سے مکمل وابستگی کو جزو ایمان بلکہ عین ایمان جان کر بادلوں کی چال دیکھتا ہے' زمین پر ہل چلا کر پہاڑوں کی اوک بناتا ہے' دعا کی صورت آسمان کی سمت اُٹھی اوک میں اُمید اور بیج ایک ساتھ رکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ جو اُس کا فرض تھا' اُس نے پورا کیا۔

طویل اِنتظار کے زائچے کھینچنے والا یا پھر کہہ لیں کہ تبدیلی سے بدکا ہوا یہ شخص' یوں لگتا ہے جیسے وقت کے دھارے سے باہر پڑا ہے۔ اس کہانی کی اٹھلا لئے ہوئے جو اسے 1955ء میں پہلی بار ملی تھی۔ اپنے آغاز' وسط اور انجام سے مربوط رنگ اور آواز میں نمی قبول کر چکی پڑاتے کی گوٹ جیسی ذات والی بھی قائم بالذات بھی' قدرے ہٹ دھرم اور کج ہریز۔

یہ جو میں نے وقار بن الٰہی کی کہانیوں کو رنگ میں پڑاتے کی گوٹ جیسی کہہ دیا ہے تو معاف کیجئے گا کہ آپ کو اس میں سارے رنگ نہیں ملیں گے' جنس کا رنگ ایسا ہے کہ اُسے تو آپ منہا ہی سمجھیں۔ کہیں یہ ملعون جو اپنے سینے کے زور سے کہانی میں در بھی آئی ہے تو اس گھس بیٹھی کا ذکر یوں ہوتا ہے جیسے بادلِ ناخواستہ ہو رہا ہو۔ اپنی گفتگو کو ''چاہ در پیش'' تک محدود کرتے ہوئے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے سات افسانے آبِ زم زم سے دھلے ہوئے ہیں۔ آٹھویں افسانے ''کڑی سزا'' میں جب ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی نمودار ہوئی تھی تو وقار بن الٰہی کے پھسلنے کی اُمید بندھی تھی' مگر دیکھئے تو وہ کیسے صاف بچ نکلا۔ لڑکی کو جھٹکے سے اُٹھایا' کاؤنٹر پر ہتھیلیاں ٹکانے دیں' قدرے اور جھکا دیا' آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈال دیں۔ وہ جس قدر مسکرا سکتی تھی مسکرائی' حتیٰ کہ ''یس پلیز'' کے الفاظ سنتے ہوئے افسانہ نگار کی نظریں گریبان تک پہنچ گئیں مگر اگلے ہی جملے میں اطلاعِ عام کا اشتہار کہہ رہا تھا کہ گریبان تو اندر سے خود افسانہ نگار کو جھانک رہا تھا جب کہ افسانہ نگار بیچارہ تو اس شے لذیذ کو یوں پرے دھکیل رہا تھا جیسے شوگر کا مریض چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے چینی دان کو پوروں سے دھکیل کر تسکین پا لیتا ہے۔

مگر لطف تو یہ ہے کہ یوں دھکیل دی جانے والی مردود جنس افسانہ ''بھوک'' میں عجب طمطراق سے آتی ہے۔ پرتھ کے ہوائی اڈے پر ایک کانفرنس کے مندوب کی حیثیت سے اُترنے والے پانچ دوستوں کی شوخیوں کے بیچ جنم لینے والی اس کہانی میں جہاں انفرادی کرداروں کا خوبصورت مطالعہ ملتا ہے وہیں راندہ درگاہ ہو چکی کٹھل جنس کا ایک دلچسپ پہلو عجب ذائقہ دے جاتا ہے۔ جوشی' پرکاش' حسام الدین' ترپاٹھی اور خود اپنے کرداروں کے جس قدر اور جیسے خدوخال افسانہ نگار نے اُبھارے ہیں' سب افسانے میں یوں سج گئے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔۔ حتیٰ کہ راہ چلتی ان عورتوں کا سراپا بھی لذیذ ہو گیا ہے جنہیں افسانہ نگار یوں دیکھتا ہے جیسے نظروں سے پرے دھکیل رہا ہو۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے دیہاتوں کے وہ بزرگ جو بچوں کو پیار بھی دھپا لگانے کے بعد کرتے ہیں۔ اس کہانی میں ترپاٹھی کے اندر سے اس ٹھاٹھیں مارتی جنس کو سراغ لگا کر برآمد کیا گیا ہے جو جسم دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے' اس کی خوشبو سونگھنا چاہتی ہے' اس کے تذکرے سے نطق کو معطر کرتی ہے مگر اتنی سکت نہیں رکھتی کہ اسے برت سکے۔

''نام لیوا'' اور وہ افسانہ جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں یعنی ''کڑی سزا''' ''بھوک'' کی طرح سفرنامے کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ نام لیوا کی کہانی اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتی ہے کہ ایمان کی مہک ریاستی جبر اور تہذیبی اُکھاڑ پچھاڑ کے باوصف اندر ہی اندر' شریانوں میں' سانسوں میں اور روح میں نسل در نسل سفر کرتی ہے۔ تاشقند کے حسین اور فصیح مناظر دکھاتی کہانی کا رخ جب شہر سے مضافات کی طرف مڑتا ہے تو جھریوں بھرے چہرے' جلی ہوئی رنگت اور چیتھڑوں میں ملبوس قزاخ کسان سامنے کی میز پھلانگ کر دوسری جانب آتا ہے اور ''السلام علیکم'' کہہ کر سُرخ موٹے انار انہیں محض اس لئے پیش کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں' اس مذہب سے متعلق جو نسلوں سے ان کے اندر سے بے دردی کے ساتھ تقریباً کھرچ ہی دیا گیا تھا' تو میرا دل جذبوں کی حدت سے لبالب ہو جاتا ہے۔

افسانہ ''کڑی سزا'' میں بھی جذبوں کی یہی بہتات ہے۔ کہانی میں ایک باپ ہے جعفری جو واشنگٹن میں بس کر مسٹر جیفرے بن گیا ہے۔ اس نے واشنگٹن میں ایک کامیاب شخص کی طرح سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔ ذاتی مکان' گاڑی' دولت' بیوی اور بچیاں مگر حادثہ یہ ہوا ہے کہ بچیاں جوان ہو گئی ہیں۔ مغرب کی عورت کو مغربی بن جانے والے مرد کے گھر سے مشرق کی بو آنے لگتی ہے' لہٰذا وہ چھوڑ گئی ہے۔ لڑکیاں چکنی جلد والی مچھلیوں کی طرح باپ کے ہاتھوں سے پھسلے جا رہی ہیں اور انہیں مغربی تہذیب کا مگرمچھ قسط در قسط نگل رہا ہے۔ یہی وہ کڑی سزا ہے جو اپنی تہذیب' اپنی زمین' اپنی ماں' اپنے لوگوں' اپنے روحانی اور فکری اثاثے پر دولت' مادی آسائشوں اور بے جہت روشن خیالی کو ترجیح دیتے ہیں۔

افسانہ ''پہچان'' میں افسانہ نگار کا اکل کھرا اپنا آپ پوری طرح سما گیا ہے۔ اسلام آباد جیسے مصنوعی شہروں کے مکیں ایک مرحلے پر اکیلے ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ''مہلت'' کا آخری جملہ اسی اکیلے رہ جانے والے کے کرب کی تفہیم رکھنے والے کے قلم سے نکلا ہے۔۔۔ تھوڑی سی مہلت بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے' تھوڑی سی مہلت ان کو پھلتا پھولتا دیکھنے کے لئے۔۔۔ اور آخر میں تھوڑی سی مہلت کہ وہ اکیلی نہ رہ جائے جو ساتھ والی چارپائی پر بولتے بولتے تھک کر سو گئی ہے اور اب خراٹے لئے جاتی ہے۔ ایک معصوم مگر شدید خواہش کہ کہیں وہ اکیلی نہ رہ جائے۔

'''' ڈیڑھ صدی انگاروں پر'' میں بھی یہی اکیلے رہ جانے والے ماں باپ ہیں اور جذبوں کا وہ سمندر جو ان کے سینوں میں موجزن ہے۔ ماں دلگیر ہے' ماں سے زیادہ باپ کا دل دُکھی ہے مگر اُسے اپنی بیوی کو دلاسا دینا ہے لہٰذا جبر کرتا ہے' یوں کہ ضبط کرنے والے کے اپنے آنسو نکل آتے ہیں۔ افسانہ ''بڑی ماں'' بھی سچے اور کھرے جذبوں سے بنایا گیا ہے۔ کہانی میں ایک ماں ہے جو بیٹے کی جدائی میں تڑپ رہی ہے۔ ایک باپ ہے جو جذبوں کے آگے روک باندھتا ہے حتیٰ کہ وہ مرحلہ آ جاتا ہے ایک ماں ایک بیوی سے شکست کھا جاتی ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے بیچ محبت کی تکون بناتی ساری کہانیوں میں افسانہ نگار خود نہ صرف پیار سے دھپا مار کر منہ چومنے والے بزرگ کی طرح جلوہ دکھاتا رہتا ہے' ہمیں وہ تہذیب اور جذبے بھی دکھاتا ہے جو رفتہ رفتہ متروک ہو رہے ہیں یا جنہیں ہم نادانی میں متروک کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اب کچھ تذکرہ ان کہانیوں کا جن میں دفتری ماحول کا خاکہ کھینچا گیا ہے دفاتر کی بوباس سے تکمیل پانے والی ان کہانیوں کو اتنی عمدگی سے بُنا گیا ہے

باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ کیجیے

ایک شخص، کئی کہانیاں

احسان بن مجید

(اٹک)

چاند طلوع ہو تو چاندنی کہاں تک نہیں پہنچتی، دشت وصحرا، پہاڑ اور ویرانے چاندنی میں نہا جاتے ہیں لیکن چاندنی غاروں کے اندر نہیں جاسکتی، جی ہاں! غاروں کے اندر جہاں صرف تاریکی رقص کرتی ہے۔ چاند طلوع ہو یا نہ ہو غاروں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اثر وہاں پڑتا ہے جہاں اندھیرے میں دم گھٹنے لگے، حبس کا عالم ہو، ایسے میں چاندنی خاص تاثیر رکھتی ہے۔

وقار بن الٰہی کی سوانح پر مبنی کتاب ''ماں، میں تھک گیا ہوں'' کا چرچا مارکیٹ میں آنے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ میرا انتظار، بے قراری میں اور صبر، بے صبری میں ڈھل گئے تھے۔ ۱۸ جون ۲۰۰۶ء اتوار کا دن تھا اور میں اپنی عادت سے مجبور کتابوں کی دکانیں سونگھتا ہوا اُٹک پاتھ پر جا رہا تھا کہ آواز آئی۔

''احسان۔۔۔'' میں نے ایک لمحے کے لئے مُڑ کر دیکھا، کوئی نہیں تھا، میں سمجھا، میرے کان بج رہے ہیں۔ آگے چل دیا کہ آٹھ دس قدموں کے فاصلے پر کتابوں کی ایک اور دکان تھی لیکن بمشکل دو چار قدم اُٹھائے ہوں گے کہ ایک ہاتھ نے میرا کندھا پکڑ لیا، مُڑ کر اچھا خاصا سر اُٹھا کر اس ہاتھ رکھنے والے شخص کا چہرہ دیکھا۔ سفید زلفیں، سفید رنگ، سفید داڑھی، ابرو بھی سفید حتیٰ کہ پلکیں بھی جیسے دودھ میں ڈبو کر نکالی گئی ہوں، مجھے سکتہ ہو گیا۔

''احسان تمہارا نام ہے۔؟'' سماعت کام کر رہی تھی، اِسی لئے سن لیا تھا۔

''جی۔۔'' مجھے اِس کے علاوہ کچھ سوجھا ہی نہیں۔

''تو پھر میں تمہیں ہی بُلا رہا ہوں۔'' لہجے کی درشتی میں اپنائیت بھی گھُلی ہوئی تھی۔

''جی اچھا۔'' اور میں اُن کے ساتھ واپس ہو لیا۔ بے دھیانی میں میری نظر اُن کے پاؤں پہ جا پڑی، وہ کتب خانہ سے برہنہ پا اُٹھ آئے تھے۔ شاید حُلیہ بتانے سے کام نہ چلے، اِس لئے بتاتا ہوں کہ اٹک بھر کے اہلِ قلم کو آبِ علم سے سیراب کرنے والے جناب نذر صابری تھے، میرا جی چاہا اُن کے پاؤں اپنے شانوں پہ رکھ لوں۔

کتب خانے پہنچ کر وہ پہلے خود بیٹھے، پھر میرے لئے اسٹول منگوایا، میں بھی بیٹھ گیا لیکن دل میں بے چینی کی لہریں اُٹھتی بیٹھتی رہیں۔ میں چند لمحے سوچتا رہا، جانے کیوں بلایا ہے، پہلے تو کبھی اِتنا التفات نہیں رہا، شناسا تو تھے، چند مشاعرے بھی ایک ساتھ پڑھ چکے تھے بلکہ ایک مشاعرے میں، میں غزل پڑھ کر آیا تو صابری صاحب بالکل میرے برابر اگلی نشست پر بیٹھے تھے مڑ کر کہنے لگے۔

''شعر کی رُ گرا دی۔'' میں نے شکریہ ادا کیا اور بس۔

''تمہیں پتہ ہے، وقار کی سوانح کی کتاب آ گئی ہے۔'' مجھ سے جیسے سوال کیا گیا۔

''جی سن رکھا ہے، آنے والی ہے۔'' میں اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اِختصار کا موقع تھا، میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''آ چکی ہے۔ یہ لو۔'' صابری صاحب نے کتاب میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ سرورق دیکھا، دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔۔تین تصویریں، ایک شخص تین روپ۔۔بچپن، اگر اب ایسے ہوتے تو ایک دم بغل میں دبا لیتا۔ نوجوانی، اگر اِس سمے ایسے ہوتے تو کہتا، ''چھوڑو یار! روز کیا فلم دیکھنی۔۔اور اگلی تصویر دیکھتے ہی میری نظریں احترام سے خود بخود جھک جاتی ہیں، عقیدتوں کا ایک ریلا مجھے ایک ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔۔پیاس پر جولانی ہو اور سامنے ٹھنڈا اور میٹھا دریا بہہ رہا ہو تو کون پاگل ساحل پہ بیٹھ کے کلیاں کرتا رہے، کیوں نہ جی بھر کے پانی پیئے اور اندر کی آگ بجھائے۔۔ٹھان لی کتاب خرید کر پڑھوں گا اور ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے کتاب کی قیمت دیکھی، یقین کیجئے، مجھے اپنی جیب میں پڑے سارے روپے یاد آئے جن سے میں گھر کے لئے آدھا کلو دہی اور اپنی ایک آدھ ضرورت پوری کر سکتا تھا، کتاب گود میں رکھ کر بیٹھ گیا۔ صابری صاحب نے کچھ کہا جو میں نہیں سُن سکا، دھیان ہوتا تو سنتا، میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ چند ثانئے توقف کے بعد صابری صاحب نے میرے کان میں ایک بات کہی۔ شاید وہ بھانپ گئے تھے، مجھے کتاب کی اشد ضرورت ہے یا میرے ارادے کی مستجابی کا لمحہ تھا، گود میں پڑی کتاب میری ملکیت ہو چکی تھی۔ میں وہاں سے اُٹھا، صابری صاحب سے مصافحہ کیا اور بغیر وقت ضائع کئے گھر پہنچا۔

''ابو جی، نئی کتاب لائے ہیں۔'' بیٹی نے دیکھتے ہی پوچھ لیا۔

''ہاں بیٹا۔'' تعارف نہیں کرایا ورنہ کتاب مجھ سے چھِن جاتی۔ اللہ کا نام لے کر کتاب پڑھنا شروع کی۔ پڑھتا گیا، پڑھتا گیا، ساتھ اپنا تیل پانی بھی پورا کرتا رہا۔ ایک گھنٹے کے دوران جتنے صفحے پڑھ سکتا تھا، پڑھے۔ پھر گھر میں لنچ بریک ہو گئی۔

کتاب کا پہلا باب مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ لگا جیسے میں یہ سب کچھ پہلے سے جانتا تھا حالانکہ یہ تمام واقعات میرے جنم سے بھی پہلے کے ہیں البتہ چند ایک ایسے لوگوں کا ذکر ہے جنہیں میں نے اپنے ہوش میں دیکھا، اُن سے باتیں کیں، سنیں۔ مثال کے طور پر وقار کے دادا، تایا، احمد وحید اختر، دادی، نانی۔۔۔یہ سب لوگ دنیا کے رنجگوں سے تنگ آ کر اپنی اپنی قبروں میں نیند

پوری کر رہے ہیں' آپ کے والدِ محترم' وہی پاٹ دار آواز اور لہجہ فوجی افسروں جیسا۔۔

وقار بن الٰہی نے سوانح میں بھی اپنا روائتی اسلوب قائم رکھا۔آپ افسانہ لکھتے وقت قاری کو اپنے ساتھ بٹھا کر ایک کتھا سُنا رہے ہوتے ہیں اور قاری ہمہ تن گوش ہوتا ہے کہ آپ کہانی چھوڑ کر براہِ راست قاری سے مخاطب ہو لیتے ہیں (افسانہ' یہی زندگی ہے' سہ ماہی سیپ ۵۷' کراچی)۔آپ گہری سوچ میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ گھنٹی ایسے چونکا دیتی ہے جیسے آپ کے پڑوس میں آگ لگ گئی ہو اور اگر آپ چھلانگ لگا کر باہر نہ نکلے تو آگ سب سے پہلے آپ کا ہی حال پوچھے گی۔''اس پیراگراف میں چار بار ''آپ'' کہہ کر قاری کو پوری طرح متوجہ کرتے ہوئے کہانی کی سچوئشن سمجھانے کی سعی کی ہے۔ظاہر ہے' نصف صدی پر محیط یہ انداز اب کیسے بدل جاتا۔یہی انداز آپ اور آپ کے افسانے کی پہچان ہے۔یوں تو سوانح کی اس کتاب میں کئی ایک ایسے موضوعات ہیں جن پر اچھا خاصا لکھا جا سکتا ہے لیکن انفرادیت آپ کے اندازِ مزاح میں ہے مثلاً گلو ماسٹر کا نقشہ کھینچنے کے بعد جب مانیٹر آپ کو پکڑ کر ماسٹر کے پاس لے جاتا ہے تو ''گھن آنس'' کا بے ساختہ تخاطب قاری (اگر وہ خالص کیمبل پوری ہو) تو وہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا بالکل ایسے جیسے میں' میں بھی ہنسا نہیں' قہقہہ مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا قہقہہ بھی عجیب گہنایا ہوا تھا' پھیپھڑوں میں سے چرچریں کی آواز کے ساتھ جھٹکے لگے تھے۔

قیامِ پاکستان کے وقت آپ انبالہ میں زیرِ تعلیم تھے لیکن آپ کو واپس آنا پڑا۔ہندو مسلم فسادات اور ایک خوف کے عالم سے آپ کو بھی گزرنا پڑا۔یہ داستان بالخصوص قابلِ مطالعہ ہے کہ یہی ہماری تاریخ ہے' کتنی عصمتیں لُٹیں' کتنے گبھرو شہید ہوئے اور کیسے کیسے ظلم نہ ڈھائے گئے۔سکھوں کا ایک عورت کے جسم کو کرپانوں سے کاٹ کاٹ کر الگ کرنا' لرزا کر رکھ دیتا ہے۔پاکستان صرف باتوں یا کاغذی کاروائی سے معرضِ وجود میں نہیں آیا۔۔۔اس کے لئے قربانیوں کی لمبی قطار ہے۔

دورانِ کتاب مصنف اپنی تعلیم اور دوستوں کا ذکر چھیڑتے ہیں۔کلاس سے غیر حاضر ہونا یا جاری کلاس سے چپکے سے کھسک جانا' یہ عادت تو آغازِ تعلیم سے ہی آپ کے ساتھ پل بڑھ رہی تھی لیکن آپ کے نام اچھا فال یہ نکلا کہ مطالعہ کا چسکا پڑ گیا اور پھر مطالعے کا یہ عالم کہ نصابی کتب سے زیادہ رسائل اہم ہونے لگے' لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ نصابی کتب کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی تھی اگر ایسا ہوتا تو وہ ایم۔اے اُردو میں اوّل پوزیشن اور گولڈ میڈل حاصل نہ کر سکتے جس کا اُنہوں نے پوری کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا (البتہ میں اپنے مضمون ''کیمبل پور کا ادبی اثاثہ' وقار بن الٰہی'' مطبوعہ ادبی صفحہ روزنامہ 'نوائے وقت' اسلام آباد میں انکشاف کر چکا ہوں) معلوم نہیں' اس میں کون سی مصلحت تھی۔۔۔آپ کے بچپن کے دوستوں میں مالک تانگے والا بھی میرا دیکھا بھالا ہے' وہ دمہ کا مریض تھا اور کچھ ہی عرصہ پہلے قبر میں اُترا ہے۔نوجوانی اور کالج کے زمانے کے ایک دوست شیخو کا حوالہ بھی ہے۔میں اگر بھولتا نہیں تو شیخو' مختار صدیقی' ہیں جو کیمبل پور کالج میں معاشیات کے پروفیسر تھے' بعد ازاں فتح جنگ کالج کے پرنسپل ہوئے۔سینیئر ساتھیوں میں پروفیسر فتح محمد ملک کا نام بھی ملتا ہے جواب اِسلامک یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں۔

ادب سے منسلک اپنے شاگردوں کی بات کرتے ہوئے آپ نے صرف تین ناموں پر اکتفا کیا ہے۔ایک پروین ملک جو ایک حکومتی پرچے کی مدیرِ اعلیٰ تھیں اور پنجابی افسانوں کے دو مجموعے ''کیہہ جاناں میں کون'' اور ''نکے نکے دُکھ'' منظرِ عام پر لا چکی ہیں۔دوسرے احمد جاوید ہیں' اُن کے اِکا دُکا افسانے میری نظروں سے گذرے ہیں اور تیسرا بلکہ آخری نام احسان بن مجید (راقم الحروف) کا ہے جس نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے' بہر حال میرے لئے یہ بھی اعزاز سے کم نہیں۔

رسالوں کے مدیروں کا ذکر بھی آپ نے خوب کیا۔مرزا ادیب سے ملاقات کا ذکر خاصا دلچسپ ہے۔آپ لکھتے ہیں' ایک خاتون مرزا صاحب سے ملنے آئی' مرزا صاحب اُس کے سامنے یوں بچھے جا رہے تھے جیسے ابھی سجدے میں چلے جائیں گے۔کتنا لطیف لہجہ ہے وقار کا لیکن با ذوق قاری کے لئے تحت اللفظ پڑھنے والے اس لہجے' اس چاشنی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ہر لکھاری کے ساتھ یہ المیہ ضرور ہے کہ وہ اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اُس کے قاری کا مزاج کیسا ہے' ذوق کیسا ہے۔میں نے تو آپ کے پڑھانے کے انداز سے یہی سیکھا ہے کہ اُردو کیسے پڑھنی چاہیئے' لکھنا ثانوی بات ہے۔اسی سے متاثر ہو کر میں نے ''تخلیق کار اور ادبی جبر'' کے عنوان سے ایک مضمون روزنامہ 'نوائے وقت' کے ادبی صفحہ میں لکھا تھا۔معاف کیجئے' میں اپنے مضامین کا حوالہ کسی تشہیر کی خاطر نہیں دے رہا' میں کیا لکھوں گا' من آنم کہ من دانم لیکن یہ ضرور ہے کہ اُردو کا ہر جملہ اپنی ساخت خود وضع کرتا ہے اور پڑھنے والے سے اسی انداز کا تقاضا کرتا ہے ورنہ جملہ مصرع بن جاتا ہے اور مصرع جملہ اور یوں دونوں اصناف کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔

وقار بن الٰہی صرف افسانہ نگار ہی نہیں ایک گھر کے سربراہ بھی ہیں۔گھریلو ذمہ داریاں جن میں اولاد کی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں' سے بھی عہدہ برآ ہونے کے لئے وقت نکالتے ہیں۔اولاد میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا (لوہکا لدسویلے آیعنی تھوڑا لاد وا اور جلدی گھر آؤ)۔ایک پنجابی کہاوت ہے۔اولاد کے فرائض سے فارغ البال ہو چکے ہیں۔اب افسانوں کی خیر نہیں۔

وزارتوں میں کام کرنے کے دوران ملک ملک گھومے اور جہاں بھی گئے داستان ساتھ لائے اور یہ داستان پڑھتے ہوئے قاری (میں بھی آپ کا قاری ہوں) یہ محسوس کرتا ہے کہ آگے آپ کسی غیر ملکی اسٹور میں داخل ہوئے' قاری آپ کے پیچھے' آپ دفتر میں جا بیٹھے' قاری آپ کی کرسی کے پیچھے

کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ایک منجھے ہوئے کھلاڑی میں یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے فلم کی طرح قاری کی نظروں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ایک قلم کار قاری کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔وزارتوں میں سوائے چند ایک دوستوں اور colleagues کے سب سے شاکی ہیں۔کیوں نہ ہوں۔آپ خود ایک فرض شناس افسر تھے(جب وزارت میں تھے) ظاہر ہے وہ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے لیکن جب ایسا نہیں ہو پاتا تھا تو کسی بھی اقدام کے صلے میں آپ کی کرسی بدل جایا کرتی تھی لیکن آپ نے کبھی اس کی پروا نہیں کی اور دیانتداری کو پلے باندھے رکھا۔مجھے آپ پر فخر ہے کاش حکومت بھی آپ پر فخر کرتی۔آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔حجازِ مقدس کی کہانی بیان کرتے ہیں تو آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ماں جس سے مخاطب ہونے کے لئے فریاد کرنے کے لئے ممتا سمیٹنے کے لئے اس کتاب کا تردد کیا گیا شاید وقار سے زیادہ تھک گئی تھیں اِس لئے کتاب آنے سے بہت پہلے آخری سانس لی اور ایک کنبے کو سوگوار چھوڑ کر جنت مکیں بن گئیں۔۱۷۶ صفحات پر پھیلی یہ کتاب چونکہ سوانح ہے اس لئے اِس میں درج ہر سانحہ کسی نہ کسی طرح آپ کی ذات سے منسلک ہے۔دراصل عمر کے سترھویں سال میں انسان جب پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے تو دنیا ہی بدل چکی ہوتی ہے۔چند ایک واقعات ذہن میں اتنے گرد آلود ہو چکے ہوتے ہیں کہ تنہائی میں یاد کرنے کے باوجود اُن کے نقوش نہیں اُبھر پاتے۔وقار بن الٰہی اِس حوالے سے ماشااللہ خاصے چاک و چوبند ہیں کوئی معمولی سا واقعہ بھی نظر انداز نہیں کر پائے۔لکھنے کا وہی انداز ہے جو آپ کے افسانوں میں ملتا ہے۔کتاب میں جا بجا آپ نے تب اور اب کا موازنہ بڑے دُکھی انداز میں کیا ہے۔ماضی میں اساتذہ کیسے تھے اب کیسے ہیں۔معیارِ تعلیم کیسا تھا اب کیسا ہے۔دوست کیسے تھے اب کیسے ہیں۔قدریں کیسی تھیں اب کیسی ہیں۔افسر کیسے تھے اب کیسے ہیں۔جائز و ناجائز (جس کی تفریق اب مٹ چکی ہے) پر بھی دُکھ کا اِظہار کیا ہے۔کتاب کے باہر لکھی آرا میں سے حمید شاہد کی بات حقیقت کے قریب ہے۔

''ماں میں تھک گیا ہوں'' پر اتنا کچھ لکھنے کے باوجود مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے بہت کچھ چھوڑ گیا ہوں لیکن یہ یقین بھی ہے کہ وہ مجھے چار رعائتی نمبر دے کر پاس کر دیں گے۔اُن کی سوانح عمری کے حوالے سے اپنی ایک غزل کے دو شعر اب لگتا ہے جیسے یہ شعر میں نے اِسی کتاب کے لئے لکھے تھے:

بچپن اور جوانی جیسے کل کی بات
ساری رام کہانی جیسے کل کی بات
ہر اک بات ہمیشہ تازہ رہتی ہے
ہر اک بات پرانی جیسے کل کی بات

☆

بقیہ: پنکھڑی کا گداز

کہ یہ قاری کے تجسس کو گرفت میں لئے رکھتی ہیں۔ان کہانیوں میں بھی متروک اور معدوم ہوتی تہذیب کے کرداروں کا المیہ جھلک دے جاتا ہے۔افسانہ ''بس غلطی ہو گئی'' کا اسٹنٹ اِفتخار اور ''انا کا نشہ'' کے تین بیوروکریٹ دوستوں میں سے سب سے پیچھے رہ جانے والا کردار ''حکیم'' اسی معدوم اور متروک ہوتے معاشرے کے اجزا ہیں جو اکا دُکا جہاں تہاں نظر آتے ہیں اپنی انا اور احساس کے مبارک بوجھ تلے کراہتے نظر آتے ہیں۔

افسر شوہر کی موت کے بعد بیوہ ہو جانے والی تین ننھی منی بچیوں کی جواں سال ماں افسانہ ''شکل وصورت عذاب'' میں فرسودہ اور غیر واجب ہو جاتی ہے تو سوال اُٹھتا ہے کہ کیا انسان خود انسانوں کے اس معاشرے میں کبھی اہم اور واجب ہو بھی سکے گا یا یوںہی اپنے آپ کو کچلتا روندتا اور رسوا کرتا رہے گا۔''اب میں کیا کروں'' اور ''شاہ خرچی'' ایسے ہی المیوں کی شرحیں ہیں۔

آخر میں مجھے اس کہانی کا تذکرہ کرنا ہے جو اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔''چاہ درپیش'' یہی کتاب کا عنوان بھی ہے۔اس کہانی کے مرکزی کردار آہیر کی کلائی پر گھڑی بندھی ہے۔کئی کئی سیڑھیاں پھلانگ کر بلندیاں پانے والا یہ سرکاری افسر جب پہلی بار افسانے میں داخل ہوتا ہے تو کلائی پر اندر کو کھسک جانے والی گھڑی کو باہر نکالتا ہے اور جب اسی افسانے کے آخر میں آہیر کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ اندر کھسکی گھڑی کو باہر لانے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا ہے ایک ٹھیٹھ بے ضرر جیسے مزاج کے حقیقت نگار کے ہاں وقت کے بہاؤ کی اتنی بلیغ علامت مجھے بہت لطف دیتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں جہاں اپنی ہی دُھن میں مگن اور اپنی ہی ڈگر پر رواں کہانی میں ایسے پر لطف مقامات آئے ہیں مجھے یوں لگا ہے جیسے یونی چیروتانی زا کی کی کہانی کا گودیا جواں سال حسینہ کی شفاف جلد پر ایک نئی پنکھڑی کا گداز اور رنگ گودنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔متروک ہوتی تہذیب کی جھلک کے ہمراہ کہیں کہیں سے طلوع ہونے والے اسی گداز اور رنگ کی لپک نے ان کہانیوں کو اہم بنا دیا ہے۔۔۔

☆

چاہ درپیش

وقار بن الٰہی

کمرے میں داخل ہوتے ہی آہیر کے قدم رُک گئے۔ پہلے سے کئی لوگ بیٹھے وزیر صاحب کے حکم طلبی کا انتظار کر رہے تھے۔اُس نے سب کی طرف ہلکی سی مُسکراہٹ اُچھالی' کلائی پر اندر کی طرف کِھسک گئی ہوئی گھڑی کو جھٹکے سے اپنی جگہ پر لانے کی ناکام کوشش کی' کھڑے کھڑے سر جھٹکا کر اپنے سراپا کا جائزہ لیا' بغل میں دبائی فائلوں کو اور مضبوطی سے دبا لیا' دو قدم اُٹھائے' جیسے دیواروں سے مخاطب ہوا:''مجھے وزیر صاحب نے بُلایا ہے۔۔۔'' دو قدم اور اُٹھائے' سراپا کا پھر جائزہ لیا' خالی منہ کو ایک دوبار چلایا تو بیچ بیچ کی آوازیں سب نے سنیں۔اُس نے رک کے قدرے جھجکتے ہوئے دروازے پر مُڑی اُنگلی کی نمایاں ہڈی سے دستک دی۔دروازے کا ہینڈل نہایت احتیاط سے نیچے دبایا اور جب کلِک کی آواز آئی تو دروازہ اپنی طرف کھینچ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ سننے کا منتظر ہو۔وہ گردوپیش سے بے نیاز ہو چکا تھا اور اُس کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئی تھیں۔تھوڑا سا جھجک کر اُس نے سلام کیا' جسے باہر بیٹھے سب لوگوں نے سُنا' لیکن وزیر صاحب نے جواب دیا یا کیا کہا' کوئی نہ سُن سکا۔آہیر نے آگے بڑھ کر رُخ بدلے بغیر اپنی پُشت پر دروازے کا ہینڈل ٹٹولا' دروازے کو نہایت آہستگی' ادب اور احترام سے اپنی طرف کھینچا اور جب کلِک کی آواز آئی تو باہر بیٹھے سب لوگوں کو جیسے زبان مل گئی۔

ایک بولا۔''لو پھر پہنچ گیا ہے۔۔''

دوسرے نے رائے دی۔''ہم صبح سے یہاں بیٹھے طلبی کے منتظر ہیں اور یہ۔۔۔۔۔اس کے لئے کوئی روک نہیں۔۔۔۔۔''

''جانے اب کس کس کی شامت آنے والی ہے۔۔۔'' تیسرے نے دُکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا تو سب سر جھٹکا کر سوچوں کے اپنے اپنے سمندر میں ڈوب گئے۔

تیسرے کے خدشات کچھ ایسے غلط اور بے بنیاد بھی نہ تھے۔ پی۔اے کے کمرے میں بیٹھے یہ سب لوگ اس کے ساتھی تھے اور سال ہا سال اُن کے سامنے کھُلے پڑے تھے۔اُنہیں یاد پڑتا تھا کہ آہیر بھی کوئی پندرہ بیس برس پہلے کمشن سے منتخب ہو کر اس وزارت میں آیا تھا۔انہیں یاد تھا' اِس انتخاب میں بھی اس وقت کے کسی ایم۔این۔اے کی سفارش کا رنگ زیادہ تھا لیکن انتخاب بہرحال کمشن کا تھا جس پر اُنگلی اُٹھانے کی گنجائش نہ تھی۔آتے ہی وہ وزارت کے سب لوگوں سے باری باری ملا۔یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو اُس کا حلیہ تک یاد تھا: دُبلا پتلا چھریرا بدن' چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت بے قرار اور عجیب حرکات میں مصروف۔چہرے پر اگر کوئی نمایاں چیز تھی تو وہ اوپر کے سامنے کے دانت تھے جو بہت زیادہ باہر نکلے ہوئے اور ہنسی کے دوران تو جیسے باہر لپک آتے تھے۔چلتا وہ لہرا کر تھا' لیکن سر جھٹکا کر۔۔افسروں کی وہ بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا اور ساتھیوں کی باتوں پر بس مسکرا کے رہ جاتا۔

پہلے چند ماہ جیسے کام کا' ماحول کا' لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔اس عرصے میں وہ صرف اپنے افسر کے کمرے میں ہی جاتا رہا۔بیشتر وقت اپنی کُرسی سے چمٹا رہتا۔اسٹینو کو لمبے لمبے نوٹ لکھاتا۔ٹائپ ہو جاتے تو ان میں اتنی کانٹ چھانٹ کرتا کہ اصل غائب ہو جاتا۔اُس پر طُرہ یہ کہ اُس کا خط اتنا شکستہ اور گھسیٹو تھا کہ اسٹینو لاکھ اندازوں کے باوجود نہ پڑھ پاتا۔اس عرصے میں وہ تمام دن ٹیلی فون پر جانے کس کس کی خیریت پوچھتا اور جانے کس کس کو چائے کی دعوت دے ڈالتا۔۔۔۔لیکن یہ ساری صورتِ حال بس چند ماہ ہی رہی۔اُس نے دیکھ لیا کہ وزارت میں کن کی سُنی جاتی ہے یا کون کسی کا کچھ بگاڑ سکتے اور کچھ دے دِلا سکتے ہیں' چنانچہ اُسے اپنے معمولات بدلنے میں دیر نہ لگی۔

اب اُس نے اپنے افسر کے پاس بیٹھنا چھوڑ دیا۔اُس نے اپنے کمرے میں بھی بیٹھنا چھوڑ دیا۔اب وہ اپنے ایک دو ساتھیوں کے پاس بیٹھتا تھا جن کی بڑے افسر تک رسائی تھی۔بڑا افسر چند ہی روز پہلے اس بڑے عہدے پر فائز ہوا تھا' اور قصہ یہ تھا کہ اس بیچارے کو نہ دفتر کا پتہ تھا نہ دفتری کام کی شُد بُد تھی۔نچلے افسر جو اس کے پاس جا کے بیٹھتے تھے' وہ بھی پیدل تھے۔وہ خوشامد تو کر سکتے تھے واہ واہ کا شور تو برپا کر سکتے تھے لیکن عہدے کی ذمہ داریاں نمٹانے میں بڑے افسر کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔آہیر کی بن آئی۔پہلے وہ دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتا' لمبے لمبے نوٹ' سمریاں' مضمون ٹائپ کراتا لیکن ساتھ ہی موقع کی تلاش میں رہتا' کب بڑے صاحب کے منہ سے نکلے اور وہ اپنا ٹانکا جوڑ کر دوسروں کا پتّا کاٹ سکے۔ایسے مواقع کی بھلا کبھی کمی ہوئی ہے؟ آہیر کو پتا چلا' صاحب کو گھر کی تلاش ہے۔پہلے اُس نے ایک ہم پلہ صاحب کو ساتھ لیا۔بعد میں اُسے بھی چھوڑ دیا اور تن تنہا پیدل' یا پھر مانگے تانگے کے سائیکل پر سارا شہر چھان مارا اور آرام اُسی وقت کیا جب بڑے صاحب نئے نویلے عمدہ گھر میں شفٹ ہو گئے۔اب اُس نے اسکولوں اور کالجوں کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔بچوں کے داخلے ہو گئے تو اُس نے بیگم صاحبہ کو گاڑی بھجوانے یا مختلف بازاروں یا انہیں درزیوں کے پاس لے جانے میں عجلت برتنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔تھوڑے ہی دنوں میں بڑے صاحب کے پورے خاندان کی زبان پر آہیر ہی کا نام تھا۔آہیر اب ساتھیوں کے پاس کم ہی جاتا تھا' صرف اِتنا کہ وہ مُٹھی میں رہیں' کون جانے کون سا مہرہ کب اور کس وقت کام آ جائے۔

ان ساری کوششوں کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلا کرتا ہے۔بڑے صاحب نے آہیر کو علیحدہ قالین بچھا کمرہ دلوا دیا۔جب دوسروں نے دیکھا کہ وہ بڑے

صاحب کا خاص آدمی ہے تو ٹیلی فون سمیت دیگر لوازمات بھی فوراً مہیا کر دیئے۔کون جانے وہ بڑے صاحب سے کس کے بارے میں کیا کہہ دے؟ اُس نے کمرے کے باہر نام کی تختی نہیں لگوائی کہ عہدے کا لکھا جانا ضروری تھا جب کہ اُس کے عہدے میں عملاً زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ بڑے صاحب جب اپنی نجی محفلوں میں اُسے مدعو کرنے یا اس کا ذکر کرنے لگے تو جاننے یا نہ جاننے والوں کے اسے عام فون آنے لگے۔ وہ ہر ایک کے سامنے حامی بھر لیتا۔ کسی نے پیچھا کیا تو اس کا کام کرا دیا' کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا تو وہ بھی گول کر گیا۔ اب وہ صبح سویرے پہلے بڑے صاحب کے سلام کو جاتا۔ ان سے ذاتی کاموں پر زیادہ اور دفتری امور پر کم تبادلہ خیال ہوتا۔ واپس آ کر پہلے وہ ذاتی کام نمٹاتا اس کے بعد سرکاری کاموں پر توجہ دیتا۔ دو تین برسوں میں اُس نے ایک عادت پختہ کر لی تھی کہ رات کو دو گھنٹے مطالعہ ضرور کرتا۔ مختلف ہینڈ آؤٹ' رسائل' نوٹ' سمریاں وغیرہ ضرور دیکھتا اور بعض پر نشان بھی لگا دیتا۔ اس کے بعد وہ انگریزی اور اُردو لُغات کا مطالعہ ضرور کرتا اور ایسے الفاظ ضرور نوٹ کر لیتا جو شیکسپیئر اور میر تقی میر کے زمانے میں رائج تھے۔ اگلی صبح دفتر آ کر وہ بڑے صاحب کی حاضری سے فارغ ہو کے نشان زدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں کراتا اور اُنہیں ایک فولڈر میں محفوظ کر لیتا۔ پھر اگر کوئی سمری یا نوٹ لکھنا ہوتا تو گزشتہ رات کے نوٹ کردہ انگریزی کے الفاظ اس میں استعمال کر ڈالتا۔ مہمان آنا شروع ہوتے تو وہ اپنی بات چیت میں اردو کے ایسے ایسے الفاظ بولتا جنہیں ترک کئے صدیاں بیت چکی ہیں۔

جہاں بڑا صاحب مہربان ہو تو چوکھے رنگ کا انتظار کون کرتا ہے؟ ہزاروں لوگ چھت کے لئے شہر میں سرگرداں تھے آہیر نے ایک ہی ماہ میں نہایت عمدہ اور کشادہ گھر پر قبضہ کر لیا۔ پھر بڑے صاحب سے قربت کے طلب گار دوسرے لوگوں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کا گھر بھر دیا اور یوں کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ بچے اعلیٰ سے اعلیٰ اسکولوں میں داخل ہو گئے۔ اب دفتر کی گاڑیاں بچوں کو اسکول لے جاتیں اور واپس لے آتیں' آہیر کو دفتر پہنچاتیں' بیگم صاحبہ کو پالک منگانا ہوتی تو گاڑی لپک کے کام کر دیتی اور عزیز و اقارب کو ریلوے اسٹیشن یا ایئر پورٹ پر پہنچانے کا کام تو جیسے ہر کسی کے لئے عین عبادت تھا۔

بڑے صاحب کو ایک دن ایک نوٹ بے حد پسند آیا کیونکہ آہیر نے بڑے مدلل انداز میں ایک نہایت اہم معاملے پر حکومت کی پالیسی پر نوٹ لکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ آہیر کو مختلف نقول میں سے ٹکڑے جوڑنے میں بڑی عرق ریزی کرنا پڑی خود بڑے صاحب کو نوٹ کے بیشتر الفاظ سمجھ میں نہ آئے۔ نہ اِتنا وقت تھا کہ لُغت دیکھی جاتی نہ اِتنا ظرف کہ اعتراف کرتے' دستخط کر کے فائل اوپر بھجوانے کے بعد دیر تک آہیر کی تعریف کرتے رہے۔ آہیر سر جھکائے ہنستا رہا اور جب دوسرے سب ساتھی اُٹھ گئے تو بولا: ''سر! اِتنے کام کا کیا فائدہ؟ میں جب دفتر سے اُٹھتا ہوں تو میرے ساتھی قیلولہ کے بعد سیر کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ میں تو اب سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ اِتنا خون کیوں جلاؤں۔ اب دوسروں کو بغیر کچھ کیے سب کچھ مل رہا ہے تو میں بھی کیوں نہ انہی کی طرح۔۔۔''

بڑے صاحب تڑپ اُٹھے۔ اُنہیں لگا' اُن کی کُرسی کی ٹانگیں دیمک چاٹ رہی ہے۔ تڑپ کر بولے۔ ''آہیر کھُل کے بات کرو۔'' وہ تو جیسے اس بات کے ہی منتظر تھے۔

''سر! اِس وقت وزارت میں میرے جیسے لگ بھگ پندرہ افسر ہوں گے' ہیں سب نالائق۔ کسی کو کچھ نہیں آتا لیکن وہ سب کے سب بڑے سینیئر ہیں۔ اب یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ نکمے تو سینیئر ہو کر ترقی پاتے جائیں لیکن جان مارنے والے بس انتظار کرتے رہ جائیں۔''

بڑے صاحب کی جان میں جان آئی اُنہوں نے آہیر کی پیٹھ ٹھونکی اور بولے: ''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور سب کچھ بھول جاؤ۔'' لیکن آہیر کو معلوم تھا کہ جس کام کو بھول گئے وہ شاید کبھی نہ ہو۔ وہ بھولا بالکل نہیں' یوں کہ بڑے صاحب شام کو گھر پہنچے تو بیگم نے ان کے سر کے گرتے اور مونچھوں کے تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں کے بارے میں بعد میں پوچھا' جواب طلبی پہلے کر لی۔

''کیوں جی' یہ اپنے آہیر کا کیا معاملہ ہے؟ وقت بے وقت وہی بیچارہ کام آتا ہے۔ آج ہم اُس کے کام نہیں آئیں گے تو پھر دوسرا کون اُس کی مدد کرے گا؟''

بڑے صاحب لاجواب ہو گئے: ''میں نے آج ہی وزارت میں بات کی ہے۔ معاملہ طے سمجھو۔''

لیکن آہیر کو علم تھا' ایک دو اور محاذ کھولنے کی ضرورت ہو گی' چنانچہ اُسی شام اُس نے وزارت کے چند بڑے بڑے صاحبوں کی دعوت کر ڈالی۔ دعوت کے اِختتام پر اُس نے کمال ہوشیاری سے اپنا مدعا بھی بیان کر دیا' یوں کہ الفاظ اس کے تھے لیکن نام بڑے صاحب کا استعمال ہوا۔۔۔۔ یہ کہ وہ چاہتے ہیں ورنہ وہ تو ان چکروں سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اگلے روز ایک دعوت اور ہوئی۔ بڑے صاحب کو چند ایک فون آئے اور بیگم نے اُنہیں گھر واپسی پر مزید ڈانٹا۔ پھر دو روز بعد ساری وزارت میں یہ افواہ گرم تھی کہ سب افسر بڑے نالائق ہیں۔ اگلے روز ہر کوئی کہہ رہا تھا کہ سب کام چور ہیں سوائے آہیر کے۔ پھر دو ہفتے بعد جو نہیں جانتے وہ بھی جان گئے کہ بڑے صاحب آہیر کو کتنا چاہتے ہیں۔ ہر کوئی گنگنا رہا تھا' وہی سہاگن' جو پیا من بھائے۔ اِدھر کھانوں کا' پاٹیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بمشکل ایک ماہ گزرا ہو گا کہ آہیر کے دو چار ہم خیال ساتھیوں نے باری باری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ صاحب وزارت میں گھُس بیٹھئے بہت ہیں' اُنہیں جونیئر کر کے کام کرنے والوں کو سینیئر کر دیا جائے۔ لیجئے ایک محاذ پر تو فتح ہو گئی کہ برسوں میں عدالت فیصلہ کرے گی نہ کسی کو فریاد کرنے کا حوصلہ ہو گا۔ دوسری طرف آہیر نے بھاگ دوڑ تیز کر دی اور ایک روشن صبح وزارت کے لوگوں کو پتہ چلا کہ پندرہ آدمیوں سے جونیئر آہیر صاحب اگلے درجے میں ترقی پا گئے ہیں۔

ترقی پانے کے بعد عہدے' ماحول' اِختیارات وغیرہ میں جو اچانک

اور اتنی بڑی تبدیلی آ گئی تو آہیر لگ بھگ چھ ماہ تک اِس سرشاری سے اُبھر نہ سکا۔ یوں بھی مبارک سلامت کا شور تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ لوگ تھے کہ جیسے روز یہ ثابت کرتے کہ وزارت صرف ایک آدمی کا نام ہے اور وہ تھا کہ ہر روز ہر کسی کو جیسے ایمان لے آنے پر کمربستہ ہو جاتا کہ اُسے اُس کا حق ملا ہے اور یہ سب خُدا کی دین ہے ورنہ وہ کس قابل ہے۔ چھ ماہ بعد یہ شور تھم گیا تو اُسے احساس ہوا' بڑے صاحب بھی کیا بڑے ہیں بس گریڈ کا فرق ہے۔ دوسرے سیاسی آدمی زیادہ ہیں' آج حکومت بدلے' کل اُن کی چھٹی ہو جائے گی۔ لیکن وہ پس وپیش میں تھا' کرے یا نہ کرے' کرے تو کیا کرے اور بڑھے تو کیسے کہ مشکل کُشا نے اُس کی یہ مشکل بھی حل کر دی کہ بڑے صاحب ایک دن اچانک تبدیل کر دیئے گئے اور اُن کی جگہ دوسرے صاحب نے آ کر چارج بھی سنبھال لیا۔ یہ سرکاری ملازمت بھی عجب شے ہے' نہ دھوپ کا یقیں نہ چھاؤں کا۔ کسی شاخ کی پائیداری کا علم نہیں کہ آشیاں بنے تو کس پر؟ طمطراق بے پناہ' لیکن پل بھر میں ڈھول ہی ڈھول! تھوڑی ہی دیر پہلے ہزاروں سلام' خوشامدیں اور تھوڑی ہی دیر بعد چائے کے لئے دودھ لانے والا کوئی نہیں۔ آہیر نے حقِ نمک ادا کیا اور بڑے صاحب کو رُخصت تو کر دیا لیکن پھر ذہن سے ایسا کھُرچا جیسے کبھی سلام دعا بھی نہ تھی۔

نئے بڑے صاحب کو مل کر آہیر کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ بھی پرانے صاحب کی نقل تھے کہ حُبِ وطن میں گوڈے گوڈے دھنسے ہوئے تھے لیکن خود تنکا توڑنے کی نہ ہمت تھی نہ جرأت نہ حوصلہ۔۔۔ اور پھر رات کے وقت ٹیبل لیمپ کے سامنے آنکھیں بند رکھے آہیر نے نہایت سنجیدگی سے سوچا' آخر اُس میں کیا کمی ہے جو وہ خود بڑا صاحب نہیں بن سکتا؟

اس کی ایما' شہ پر دائر کردہ مقدمات ابھی پیروی کے مراحل میں تھے اور اُسے اُن کی چنداں فکر بھی نہ تھی۔ وہ تو اب اُس صف میں سے نکل آیا تھا لیکن اب مزید آگے بڑھنے کے لئے تھوڑے سے صبر کی ضرورت تھی اور قدرے زمین ہموار کرنے کی۔ زمین تو وہ ہموار کر سکتا تھا' البتہ صبر والا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ بہر حال اُس کا ایمان تھا' کوشش کر لینی چاہیئے' کامیابی یا ناکامی تو اُس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ اور کوشش کے لئے اُس نے سوچا' آخری صاحب کی بجائے کیوں نہ وزیر صاحب کو قابو کیا جائے۔۔۔ آخری صاحب کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ وزارت کے سربراہ تھے' اِس لئے کسی کا داؤ چلنے دیتے نہ کانوں کے اتنے کچے تھے البتہ وزیر صاحب کے سامنے وہ بھی بے بس ہو جاتے۔ وزیر صاحب میں البتہ ایک خامی یہ تھی کہ وہ ناپائیدار بہت تھے جیسے ہانگ کانگ کی گُڑیا۔ دوسرے وہ ووٹ لے کر آتے' ووٹ کا ہی خیال کرتے اور ووٹ ووٹ چلاّتے رخصت ہو جاتے۔

آہیر یہ داؤ آزماتے آزماتے رہ گیا جیسے چھٹی حس نے خبردار کر دیا ہو کہ پردے کے پیچھے بھڑ اُڑ رہی ہے' کسی وقت بھی ڈنگ چبھو سکتی ہے' آخری صاحب بھی کام کے آدمی ہیں' اُنہیں نظر انداز کرنا درست نہیں' آخر کو اتنے بڑے افسر ہیں' اتنی بڑی وزارت کو سنبھالے بیٹھے ہیں' چنانچہ پہلے تو اس نے ان کے دفتر میں' اُن کے گھر اُن کی محفلوں میں حاضری دینا شروع کر دی اور ساتھ ہی ساتھ وزیر صاحب کی شان میں بھی قصیدہ گوئی کا آغاز کر دیا لیکن دو چار ہُلاروں کے بعد وہی ہوا' جس کا ڈر تھا۔ وزیر صاحب رات وزیر سوئے' صبح اُٹھے تو وزیر تھے نہ سفیر' امیر تھے نہ کبیر۔ آہیر نے چند ایک فون کئے چند ایک وصولے' دنیا کی بے ثباتی کا رونا رویا اور پھر سے آخری افسر کا دامن تھام لیا۔

اب وہ اپنے افسر کا زیادہ خیال کرنے لگے۔ اتفاق سے اِس آخری افسر کو اللہ نے سر بھی بڑا دیا تھا اور اُس میں کچھ رکھ بھی دیا تھا' چنانچہ اُن پر مختلف نوٹوں اور سمریوں کے تراشوں کا داؤ تو نہ چل سکتا تھا البتہ بندہ بشر تھے' اُن کے دوسرے لوزمات تو موجود تھے۔ وہ کبھی آہیر کو چند ایک ملاقاتوں میں تاڑ گئے کہ اسے کس بھاؤ بیچا جا سکتا ہے۔ کبھی وہ کہتے:: میری فلاں کوٹھی میں رنگ روغن باقی ہے۔ کبھی کہتے' کوٹھی تو بن گئی ہے بس صرف فرش ڈالنا باقی رہ گیا ہے۔ کبھی کہتے: اس کوٹھی میں بجلی کی فٹنگ ہو جائے تو وہ اُسے کرائے پر اُٹھا دیں گے۔ آہیر کسی پالتو جانور کی طرح یہ سارے احکامات سنتا' کبھی ایک پروجیکٹ کے ٹھیکیدار کو پکڑتا کبھی دوسرے کو اور یوں آخری صاحب کے صرف ہونٹ ہلانے پر کبھی ایک کوٹھی میں رنگ روغن ہو جاتا' کبھی دوسری میں فرش ڈال دیا جاتا اور کبھی تیسری میں بجلی کی فٹنگ ہو جاتی' البتہ کسی ٹھیکیدار کو کبھی کوئی ادائیگی نہیں ہوئی۔ ادائیگی کی ضرورت بھی کیا تھی؟ یہی کیا کم تھا کہ کروڑوں کا کام اسے دے دیا گیا ہے اور ایک پائی بھی وصول نہیں کی گئی۔

آہیر کو یہ خیال اچانک ہی آیا' کیوں نہ وہ یک آدھ منزل اپنی بھی بنا لے لیکن اِس پلان پر اُس نے خاصا سوچا' لوگوں کی زبانیں گز گز بھر کی ہیں' کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے۔ اسے پہلی بار بڑی احتیاط اور رازداری سے کام لینا پڑا۔ مختلف بینکوں میں بہت سے سرکاری کھاتے کھُلے ہوئے تھے جن پر بار بار یہ کہا گیا تھا کہ بند کر کے رقوم سرکاری خزانے میں رکھی جائیں' لیکن سُنتا کون تھا' سننے والے سبھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ آہیر نے بھی ایک دو بینکوں کو پکڑا' اُن سے او۔ ڈی لے کر دوسرے شہر میں زمین خریدی۔ دوسرے بینک سے بلا سود او۔ ڈی لے کر اس پر پلازا کھڑا کر دیا اور اس کی آمدن سے آہستہ آہستہ او۔ ڈی کی قسطیں ادا کرتا رہا۔

ایک بار جانے کس دِل جلے نے یہ افواہ اُڑا دی کہ آہیر کو اِس شعبے سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔ آہیر کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے' سارا سارا دن آخری افسر کے دفتر کا طواف کرتا رہتا یا وزارت کے دوسرے افسروں کے پاس بیٹھ کر اپنے کارنامے دہراتا رہتا۔ پھر اُس سے نہ رہا گیا تو چند ایک فون کرنے کی دیر تھی کہ ملاقاتیوں اور سفارشوں کا آخری افسر کے پاس تانتا بندھ گیا۔ آخری افسر نے تنگ آ کر اُسے بُلایا' کمال شفقت سے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی کہ اُس کے بغیر وہ شعبہ تو چل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وہی تھا کہ جس نے اُس کے اتنے ذاتی کام کئے تھے اور اب اُس کی چوتھی کوٹھی کے دروازے اور کھڑکیاں مہیا کرنے والا تھا۔

آہیر نے وہ کام بھی کر دیا لیکن سوچنے لگا کہ آخری افسر کو اب نظر انداز کر دینا چاہیئے'لیکن اوپر تلے دو ایسے واقعات ہو گئے کہ وہ ایسا نہ کر سکا۔ایک تو وہ سمری تھی جو مع اُس کے ساتھیوں کے اُس کی ترقی کے لئے گئی اور دوسرے آخری افسر تبدیل ہو گئے۔چند ہی ماہ میں نئے وزیر آ گئے' نئے آخری افسر آ گئے اور ساتھ ہی سمری بھی منظور ہو کر آ گئی۔دوسروں کے ساتھ وہ بھی بڑا افسر بن چکا تھا۔

بڑا افسر تو وہ بن گیا لیکن جانے کیا ہوا' اب وہ دن میں کئی بار اپنے سراپا کا جائزہ لیتا' کئی بار گھڑی کو کلائی پر اپنے مقام پر لاتا' کئی بار خالی منہ چلا کر بیچ بیچ کی آوازیں نکالتا' بیٹھے بیٹھے اچانک انگریزی میں تقریر کرنے لگ جاتا اور ایک آدھ گھنٹہ بے تکان بولے چلا جاتا۔آخری افسر سے ملنے جاتا تو گھنٹوں اُس کے پی۔اے یا اُس کے پاس بیٹھا رہتا اور افسر دنیا کے کسی موضوع پر بات کرتا' تو آہیر اس پر نوٹ یا سمری کی پیش کش کر دیتا۔البتہ ابھی وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وزیر کے ساتھ سلسلہ کیسے اور کہاں سے شروع کیا جائے۔

یہ تو خیر اُسے معلوم تھا کہ وہ آخری افسر نہیں بن سکتا لیکن کبھی کبھی اُسے خیال آتا' صرف دس برس میں وہ اٹھارہ سے بیس گریڈ میں پہنچ سکتا ہے تو آخری افسر کیوں نہیں بن سکتا۔آہستہ آہستہ اُس نے اپنے معمولات طے کر لئے۔اب وہ ان جلسوں' کانفرنسوں' سیمیناروں میں ضرور جاتا جہاں وزیر صاحب کی شرکت متوقع ہوتی اور ان کی نشست کے قریب ہی منڈلاتا رہتا۔جہاں وہ تقریر کے دوران یا کچھ پوچھنے کے لئے رکتے' اِدھر اُدھر دیکھتے' وہ جھٹ سے ایک چٹ پر مواد لکھ کر اُن کے سامنے رکھ دیتا۔یہاں سے فارغ ہو کر وہ وزیر صاحب کے دفتر میں ایک آدھ حاضری ضرور دیتا' ایک آدھ سلام آخری افسر کو کرنے بھی جاتا' اِس کے بعد وہ اپنے دفتر میں آ کر میٹنگوں میں مصروف ہو جاتا۔اُسے میٹنگ بلانے اور تقریر کرنے کا بڑا شوق تھا۔یہ کیا کم فخر کی بات ہے کہ کیا ملکی اور کیا غیر ملکی آپ کے سامنے چُپ چاپ بیٹھے آپ کی خرافات سنتے رہیں۔ان سے فارغ ہوتا تو ماتحت افسروں کی باری آ جاتی۔انہیں احکام ملنے لگتے۔کسی کو کہا جاتا' آج ہی سمری تیار کر کے لاؤ۔جسے سمری لکھنے کا کہا گیا تھا اُسے کہا جاتا details لے کر آؤ۔بعض دونوں چیزیں تیار کر کے بھجواتے' اُن سے کہا جاتا' short note لے کر آؤ۔یہ احکامات عام طور پر چھٹی کے وقت کے قریب قریب دیئے جاتے۔ماتحت جو اُن سے سینئیر تھے' کچھ سُن لیتے اور رات گئے تک بیٹھے رہتے اور کچھ اَن سُنی کر کے گھروں کی راہ لیتے۔

اپنی منزل پا لینے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔اچانک ہی دوروں کا' وہ بھی غیر ممالک کے دوروں کا جیسے ہوکا لگ گیا۔ہوا یوں کہ کسی یورپی ملک سے آخری افسر کو دورہ کرنے کی دعوت ملی۔اُنہوں نے دوسری مصروفیات کی وجہ سے خود تو معذرت کر لی لیکن آہیر کو نامزد کر دیا۔آہیر کو پہلے حیرت نے گھیرا' پھر مشکل نے آ دامن پکڑا۔وہ کیا کرے گا؟ کیا کہے گا؟؟ اِن سوالوں نے جیسے اس کی نیند حرام کر دی۔چونکہ دورہ ہی تھا کوئی کانفرنس یا سیمینار تو تھا نہیں' کچھ دوستوں نے ڈھارس بندھائی' کچھ اُس نے خود اپنے آپ کو سنبھالا اور اللہ کا نام لے کر ہوائی جہاز پر سوار ہو گیا۔آٹھ دس روز بعد اُس کی واپسی ہوئی تو جیسے شہر میں بھونچال آ گیا۔صبح سے رات گئے تک جاننے والوں کو ٹیلی فون کر کر کے پی۔اے کی انگلیاں اکڑ گئیں' صاحب کو اپنے دورے کی تفصیل ہی بتانا ہوتی تھی' آہیر کی تو دنیا ہی بدل گئی۔سرکاری مہمان کی آؤ بھگت' اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام' عمدہ کھانے' اس کے باوجود ڈالروں کی ریل پیل اور سونے پر سہاگہ وہ مضامین اور نوٹ جو باہر سے ملتے' جن کے حصے بڑے اطمینان سے یہاں نقل کئے جا سکتے تھے۔اب وہ آنے بہانے ان شعبوں میں ضرور جاتا جہاں سے کسی بھی طرح کے دعوت یا دورے کی توقع ہو سکتی تھی۔ایک ہی برس میں اُس نے لگ بھگ آدھی دنیا دیکھ ڈالی۔باتوں میں' چہرے پر' عجیب سی رعونت چھا گئی' بینک میں بھُنائے گئے ڈالروں سے خاصا بیلینس پھول گیا اور دفتر میں غیر ملکی رپورٹوں' اسکیموں' ہینڈ آؤٹس کا جیسے انبار لگ گیا اور اسٹینو بیچارے کا ٹائپ کر کر کے جیسے بھُر کس نکل گیا۔اب وہ آخری افسر کے پاس جاتا تو بے نیازی سے اور وزیر صاحب کے پاس جاتا تو قدرے اعتماد سے۔۔

سابقہ وزیر بوریا بستر باندھ کر رُخصت ہوئے تو آہیر کو بیحد دُکھ ہوا' کہ اُس نے اُنہیں شیشے میں اُتارنے' ان سے تعلق جوڑنے میں خاصی ریاضت سے کام لیا تھا۔وزیر صاحب نے بھی حد کر دی تھی کہ ایک روز غسل خانے میں لوٹا ٹوٹ گیا تو اُنہوں نے اپنا لوٹا لانے کی سعادت آہیر کو ہی بخشی۔آہیر نے یہ واقعہ سب کو سنایا اور آخری جُملہ بھی یہی ادا کیا کہ کیا کریں جی' کلاس فیلو کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔آہیر اُنہیں جلد فراموش کر دیتا' اگر نئے وزیر صاحب اتنے لئے دیئے نہ رہتے۔وہ پرانے صاحب کا ذکر چند ایک روز محفلوں میں کرتا رہا' اُن کے لئے آہیں بھرتا رہا' آخر ایک روز بیٹھ کر سوچنے لگا' نئے وزیر صاحب کو کہاں سے پکڑا جائے۔۔یہ نئے وزیر صاحب اتفاق سے کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے نکلے۔کسی سے ملتے جُلتے نہ تھے' کسی کی طلبی نہ ہوتی تھی۔بعض پیشہ ور حاضری اور سلام میں داغنے والے باہر پی۔اے کے پاس بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتے لیکن اندر سے احکام جاری نہ ہوتے۔نہ اُنہیں سمریوں کا شوق تھا اور اگر کوئی نوٹ پہنچ بھی جاتا تو اتنی مین میخ نکالتے کہ اچھے اچھے پہلوانوں کا پِتا پانی ہو جاتا لیکن آہیر کو کوئی بات بھی مشکل نہ لگی۔آخر اتنے برسوں کا تجربہ کوئی گھاس کھودنے کا تو نہ تھا۔پہلے دعا سلام سے آغاز ہوا' پھر ضروری فائلوں کے بہانے وزیر صاحب کے منع کرنے کے باوجود بار بار حاضری' پھر وزیر صاحب نے جلسوں اور فنکشنوں میں جانا شروع کیا تو وہاں حاضری اور لقمے بازی۔وزیر صاحب اس پر بھی قابو میں نہ آئے تو اُن کے دوستوں کو گھیرا گیا' پی۔اے سے کہا گیا کہ وزیر صاحب جو کام کہیں اُسے بتایا جائے۔وزیر صاحب کہاں تک بچتے یا دامن بچاتے' ایک دن چاروں شانے چت پڑے تھے۔آہیر نے وہ پھُرتی دِکھائی کہ وزیر صاحب کو سنبھلنے ہی نہ دیا۔ان پر نوٹوں' سمریوں' تقریروں' بیانوں' فائلوں'

دعوت ناموں اور جانے کس کس الا بلا کی بوچھاڑ کرا اور کروا دی' چنانچہ چند ہی مہینوں میں وزیر صاحب کے لبوں پر اُسی کا نام تھا۔ دفتر میں ہوتے تو بات بات پر مخصوص نمبر پر آہیر سے رابطہ کرتے۔ جلسوں میں ہوتے تو آہیر کو اپنے ساتھ رکھتے۔ رات نیند میں ہوتے تو خواب بھی آہیر ہی کے دیکھتے۔

اب اس نے سوچا' وقت ہے۔ آخری افسر تو وہ بن نہیں سکتا کہ اس کا فیصلہ تو ایک اور وزارت کرتی ہے' لیکن وہ اپنی ہی وزارت کے ایک ادارے کا سربراہ تو بن سکتا تھا۔ گو مالی فائدہ تو کوئی خاص نہ تھا لیکن دوسرے فوائد بے شمار تھے۔۔۔اس پہ اپنی بادشاہت' غیر ملکی دورے۔۔اس کے علاوہ پہلے اُس نے آہستہ آہستہ زمین ہموار کی' ادارے کے موجودہ سربراہ کے خلاف وزیر صاحب کے کان بھرے۔ جب دیکھا' مہم کامیاب رہی ہے تو اس نے ہولے ہولے' چپکے چپکے لاتعلقی سے اپنا نام لینا شروع کر دیا۔ پھر ایک روز پہلے جب اُس نے وزیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تو یہ ذکر بند کر دیا' دفتر واپس جا کر زودار نوٹ لکھا' ٹائپ کروا کر نہایت صاف ستھری فائل تیار کر کے مطمئن ہو گیا۔

اور آج اُس نے صبح صبح انتظامیہ کے بڑے افسر کے نوٹ پر دستخط کروائے۔ ظاہر ہے اپنے ہی قصّے پر وہ خود تو دستخط تو نہیں کر سکتا تھا۔ احتیاطاً دو چار فائلیں اور اُٹھا لیں' تا کہ لوگ اور وزیر صاحب یہ نہ سمجھیں کہ وہ اپنے جھگڑے کے لئے ہی آیا ہے۔ پھر وہ پی۔اے کے کمرے میں بیٹھے دوسروں کو مسکراہٹ پر ٹرخاتا' کلائی پر بندھی گھڑی کو اپنی جگہ لانے کی ناکام کوشش کرتا' منہ سے چچ چچ کی آوازیں نکالتا' رُکتا' جھجکتا وزیر صاحب کے دروازے کو سلام کرتا' اُن کے دفتر میں گھُس گیا۔

دوسرے لوگ باہر بیٹھے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے کہ ایک کی موجودگی میں وزیر صاحب نے کسی کو بلانا تھا نہ کسی نے اندر جانا تھا' لیکن تھوڑی ہی دیر میں آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کتنی کہانیوں کا تبادلہ ہو گیا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا تو سب کی نگاہیں دروازے پر جم گئیں۔ کلِک کی آواز آئی' پھر آہستگی سے دروازہ کھُلا' آہیر نے پی۔اے کے کمرے میں آ کر پلٹ کے دروازہ نہایت احتیاط اور احترام سے بند کیا' دو قدم اُٹھائے اور پی۔اے کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔

پی۔اے کو اس سارے قصّے کا علم تھا بلکہ اُس کی رائے بھی شامل تھی۔ اُسی نے بتایا تھا' لوہا گرم ہے' وار کر دو۔ پی۔اے نے سر جھکا کر سامنے بیٹھے آہیر کو دیکھا اور مبارک باد کو روکتے ہوئے پوچھا: "کام ہو گیا؟"

آہیر نے سر اُٹھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے سب کو دیکھا' کلائی پر لُڑھک گئی گھڑی کو اپنی جگہ لانے کی ناکام کوشش کی' پھر سر جھکا کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی' منہ سے چچ چچ کی آوازیں نکالیں اور بولا۔۔ "نہیں"۔۔

پی۔اے گُنگ رہ گیا' کیا کرے' کیا پوچھے' کیا کہے؟

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ شبیر مجھ سے پہلے ہی دستخط کروا کر لے جا چکا ہے۔"

۔ کمپیوٹر کا بادشاہ ۔

سٹیو جان پال جابز 1955ء' یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم غیر شادی شدہ جوڑے عبدالفتاح جندلی اور جوانی شمبیل کے ہاں سان فرانسسکو میں پیدا ہوئے تو اُنہیں گود لینے والوں کو پیش کر دیا گیا۔ سلیکون ویلی جو امریکی الیکٹرانکس کا گڑھ مانا جاتا ہے کہ ایک جوڑے پال اور کارلا نے اُنہیں گود لے لیا۔ مقامی ہائی اسکول کے ایک سال بعد تعلیم کو خیر باد کہہ کر جابز نے اٹاری ویڈیو گیمز کی فیکٹری میں ملازمت کا آغاز کیا۔ جابز کی پہلی ایجاد "ایپل" کو 1977 میں کیلی فورنیا کے کمپیوٹر میلے میں رکھا گیا جس کے بعد جابز نے اپنے دو دیگر دوستوں کے ہمراہ ڈھائی لاکھ ڈالر کا قرض لے کر "ایپل کمپیوٹر" کے نام سے کمپنی کی بنیاد رکھی۔ "ایپل ٹو" اپنے دور کے دوسرے کمپیوٹر کی نسبت ایک مکمل' سادہ اور آسان مشین تھی۔ 1993 میں "ایپل ٹو" کے خاتمے تک اس کے ساٹھ لاکھ سے زائد کمپیوٹر فروخت ہو چکے تھے۔ 1984 میں اختلاف کے باعث جابز نے ایپل سے علیحدگی اختیار کر لی اور "NEXT" کے نام سے کمپیوٹر بنایا۔ اس کے بعد جابز نے "اسٹار وارز" خرید لی اور کئی کامیاب فلمیں بنا کر کروڑوں ڈالر منافع کمایا۔ ایک سال بعد "ایپل" نے "NEXT" کو چالیس کروڑ ڈالر میں خرید لیا اور جابز چیف کی حیثیت میں واپس آ گئے۔ سیٹو جابز نے 2001 میں "آئی پوڈ" متعارف کرایا جس نے موسیقی کی طلب پوری کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2005 میں والٹ ڈزنی نے جابز کو سات ارب مالیت کے حصص ادا کئے جس کے بعد وہ کمپنی کے سب سے زیادہ انفرادی شیئر ہولڈر بن گئے۔ 2008 میں جابز نے انتہائی باریک کمپیوٹر "میک بک ایئر" کے نام سے متعارف کرایا۔ 2009 میں کینسر کے باعث سٹیو جابز کے جگر کا ٹرانسپلانٹ ہوا جس کے بعد اُن کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ اپریل 2011 میں جابز نے خرابیِ صحت کے باعث تعطیل پر جانے کا اعلان کر دیا۔ بالآخر کمپیوٹر کا بادشاہ اور اپنے دور کا آئن سٹائن و ایڈیسن کا لقب پانے والا سٹیو پال جابز 6 اکتوبر 2011 کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔ پال کی موت کے وقت "ایپل" کے کُل نقد اثاثے چھہتر ارب چالیس کروڑ بتلائے گئے ہیں جو حکومتِ امریکہ کے موجودہ محفوظ ذخائر تہتر ارب ستّر کروڑ کے مقابلے دو ارب اسّی کروڑ ڈالر زیادہ بنتے ہیں۔ سب سے دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی سرمایہ کار کمپنی کا اس قدر بڑا سربراہ تنخواہ کے طور پر صرف ایک ڈالر ماہانہ موصول کرتا تھا۔

’’مانوس خطوط‘‘

عطیہ سکندر علی

(سکھر)

لوگ کہتے ہیں' نام میں کیا رکھا ہے۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے نام ہی میں سب کچھ نظر آتا ہے چنانچہ اِسی خیال سے اُنہی افسانوں پر نگاہ ڈالی جن کے ناموں سے کتابیں موسوم ہیں۔ دونوں میں سچی کہانیاں انگڑائیاں لیتی' مچلتی اور بل کھاتی نظر آئیں اور کچھ ایسے تخلیقی آب و رنگ کے ساتھ کہ اب دونوں کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)

میں جن افسانوں کو عرصے سے کتابی صورت میں دیکھنے کا مشتاق تھا' وہ میری آرزو کے مطابق میرے سامنے تھیں۔ میں انہیں آہستہ آہستہ پڑھوں گا' ان کہانیوں کی بازیافت کروں گا جن کے عنوان عرصے سے ذہن پر نقش ہیں۔۔ منشا یاد کا بھی شکریہ کہ انہوں نے بالآخر آپ کو مجموعہ مرتب کرنے اور ناشرین کے ناز اُٹھانے پر مائل کر ہی لیا۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

سیدھا' سچا' کھرا اور محبت کرنے والا وقار بن الہٰی اٹک کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے اصولوں اور دیانت پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ وہ جہاں کہیں بھی رہا' جس حال میں رہا' جن لوگوں کے درمیاں شب و روز گزارے اُن سب میں اپنے کھرے اور کھر درے پن کی وجہ سے مقبول و نا مقبول' پسندیدہ و ناپسندیدہ کی چکی میں پستا رہا۔ اُس کی تازہ کتاب ’’ماں' میں تھک گیا ہوں' ‘‘ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی اور اتنی مصروف سرکاری زندگی گزارنے کے بعد اُس نے ایسی خوبصورت' دلچسپ اور دِلگداز داستان کیسے لکھ دی؟

محسن احسان (پشاور)

میری دانست میں خودنوشت، ناول سے زیادہ پڑھی جا رہی ہے کیونکہ ناول میں پھر ایک خیالی فضا کی موجودگی اور مصنف کی خواہش وچاہت کا گماں گزرتا ہے جبکہ خودنوشت میں یہ یقیں ہوتا ہے کہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں، اُس میں سچائی ہی سچائی ہے۔ اسی لئے قاری خودنوشت کو ناول سے بہتر سمجھتا اور پڑھتا ہے۔

ڈاکٹر توصیف تبسم (اسلام آباد)

کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں' جو گلدستہ تو بن جاتے ہیں لیکن جنہیں گلداں میسر نہیں ہوتا۔ پھر یہ پھول کھڑکی کی سِل پر پڑے رہنے کے باوجود نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ وقار بن الٰہی نے ’’چاہ درپیش‘‘ میں بڑی ترچھی چتون کے ساتھ تابڑتوڑ افسانے لکھے ہیں۔ جوں جوں میں ان پندرہ افسانوں میں صفحہ در صفحہ خوش طبعی کی خاطر اُترتی ' مجھے پتھر تلے سے ہاتھ نکالنا محال ہو گیا' سوچتی رہی کہ یہ افسانے اِس قدر گُپت کیوں رہے؟

میں نے دیر تک سوچا' یہ افسانے کس ذیل میں آتے ہیں۔ کیا انہیں ترقی پسند تحریک کا سادھارن مقصد دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ادب برائے فن کی دلالت کرتے ہیں؟ ؟ میں چونکہ نقاد نہیں' اِس لئے ساختیات' پس ساختیات' جدیدیت' مابعد جدیدیت' ساخت شکنی کے تحقیقاتی تجزیئے کو آلۂ کار نہیں بنا سکتی۔ ان افسانوں میں ’’ادب برائے زندگی‘‘ کی جاندار جھلکیاں وقار کی فکری صلاحیت اور انسان دوستی کا ثبوت ہیں۔ میں نے اِن افسانوں میں سراغ رسانی کی تو اِس نتیجے پر پہنچی کہ' اگر کوئی مجھ سے پوچھے' پاکستان میں جو تخم ریزی ہوئی اُس کی فصل کو کون سے کیڑے چاٹ گئے تو میں کہوں گی' وقار کی ’’چاہ درپیش‘‘ پڑھ لیجئے' آپ پر اُن لوگوں کا حال آشکارا ہو جائے گا جو اس فصل کے نگران تھے۔

وقار نے بڑی شائستگی سے' سادگی اور نرمی کے ساتھ سیل بند دفتروں کے دروازے کھول کر ایسے افسروں کے درشن کرائے ہیں جو عوام کی پہنچ سے تو دور ہوتے ہیں لیکن جن کے فیصلے' چترائیاں' چالاکیاں ان کے گھروں میں دندناتی پھرتی ہیں۔۔ اگر کبھی آپ کو تجسس اُکسائے اور آپ پاکستان کے حالات کے پس منظر اور پیش منظر کا تجزیہ کرنا چاہیں تو ایک بار اس محبِ وطن کے اُس کنوئیں میں جھانک کر دیکھ لیجئے گا جس میں وقار کی تحریر کا دل ڈوب مرنے کو چاہتا ہے۔۔

بانو قدسیہ (لاہور)

وقار بن الٰہی نے اپنی اِس کتاب میں اپنے عہد کو زندہ کر دیا ہے۔ میں نے اُن سے اور اُن کی کتاب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اِس کتاب میں ہم دونوں کی کیمبل پور کالج کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں، جب ہم پروفیسر ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کے شاگرد ہوا کرتے تھے۔

فتح محمد ملک (اسلام آباد)

میرے ذہن نے آپ کو ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے اب سے برسوں پہلے قبول کیا تھا وہ تاثر ہنوز باقی ہے۔ وہ افسانے 'فنڈ' اور مرزا ادیب کے 'ادبِ لطیف' میں پڑھا کئے تھے۔ اب وہ بھی صحیح طور پر یاد نہیں لیکن یہ حیثیت ایک متاثر کرنے والے افسانہ نگار کے آپ کی قبولیت تا حال تر و تازہ ہے۔

ہمارے ہاں تنقید' تحقیق کی طرح ایک خاص ڈھرے پر چل رہی ہے۔ اُس نے جیسے اپنا ایک چوکھٹا بنا لیا ہے۔ عام طور پر سطح پر تیراکی ہوتی ہے' غواصی شاید نہیں کے برابر! تیراکی اور غواصی بہرحال اپنے اندر فرق رکھتی ہے۔۔

ادیب سہیل (کراچی)

خودنوشت اپنے عہد کی تاریخ ہوتی ہے اور خودنوشت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج دنیا میں ناول کے بعد سب سے زیادہ خودنوشت لکھی جارہی ہے۔ وقار بن الٰہی نے سات سوصفحات پر مشتمل اپنی اس کتاب کی تیاری میں بہت لگن اور محنت سے کام لیا ہے' جسے سراہا جانا چاہئے۔

افتخار عارف (اسلام آباد)

اس عمر میں ہر انسان (میرا مطلب ہے' حساس انسان۔۔معذرت چاہتا ہوں) ماضی پرست بن جاتا ہے اور میں تو فطری طور پر ہوں ہی ماضی پرست۔ آپ کی خودنوشت پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے میں کوہ قاف پہنچ چکا ہوں' صرف پہنچا ہی نہیں' وہاں اب مجھے پریاں گود میں لئے پھر رہی ہیں۔ 'ماں' میں تھک گیا ہوں'۔۔اس خوبصورت نام کے لئے میرے پاس تعریف کے الفاظ نہیں۔ حقیقت پسندی اور رومانویت کا کیا خوبصورت امتزاج ہے۔ اِس عمر میں ایک طویل جد و جہد کے بعد۔۔۔ماں سے اِس انداز کا طرزِ تخاطب اور۔۔۔مرکزِ دُعا سے تکان کا اِظہار۔۔۔یہ تخاطب صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ کتاب کا ٹائیٹل لاجواب ہے' فیض یاد آگئے:

ایک ہی چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس خطوط
دیکھتے دیکھتے یکلخت بدل جاتے ہیں

ڈاکٹر محمد ہمایوں ہُما (مردان)

وقار بن الٰہی کے قارئین جانتے ہیں کہ وہ وطنِ عزیز کی معاشرتی خامیوں خصوصاً دفتروں کے ماحول کو' اس کی بے ضابطگیوں بلکہ بدضابطگیوں کو افسانوں میں بڑی کامیابی سے پیش کرنے میں خاص شہرت اور تخلیقی اختصاص رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں کسی اور مصنف نے اس موضوع پر اتنی کامیابی سے نہیں لکھا۔۔۔حقائق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنادینے کا ہُنر اُن کی تحریروں میں کارفرما نظر آتا ہے۔

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

ماں' میں تھک گیا ہوں'' ایک ایسے شخص کی آپ بیتی ہے جس نے اس سرزمین کو دو حصوں میں بٹتے اور پھر تقسیم کے عمل سے نکل آنے والے خون کی ندیوں کو جاری دیکھا۔ زخموں پر پھاہا رکھنے کے عمل کو جانا' سمجھا اور پھر اپنی قوت اور حیثیت کے مطابق کھرنڈ آئے زخموں کی نگہداشت کی۔ یہی سبب ہے کہ یہ آپ بیتی دوسری خودنوشتوں سے قدرے مختلف ہے۔ سراسر ذات ہی کا اِظہار نہیں بلکہ مٹی کی مہک اور مٹی پر چلنے والوں کی تصویریں بھی نمایاں ہیں۔ ہماری قومی زندگی کی المناکیوں' خود پرستیوں' خودغرضیوں اور ہوس پرستیوں کی تمام داستانیں ایک ایک کر کے سنائی دیتی ہیں۔ چھینا جھپٹی' مار دھاڑ اور بے رحمی سے بھرپور یہ کہانیاں سوچنے والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں' دیکھنے والوں کو بہت کچھ دیکھنے کا موقع دیتی ہیں۔ ہمارے ماضی' حال اور مستقبل کے عکس اس آپ بیتی میں موجود ہیں۔

کالج کی زندگی اور جوانی کے دنوں کو صرف فلمی میگزین کے شوق تک محدود رکھ کر بیان کیا گیا اور اُس زمانے کا جو خاصا ہوتا ہے اُسے کمال مہارت سے چھپا لیا۔ کتاب کے آخر میں جا کر کہیں اعتراف کیا گیا کہ ''ہاں! عشق بھی ہوا تھا مگر ماں کے سامنے ایک نہ چلی اور وہ بن دیکھی لڑکی بیاہ کر لے آئیں۔'' یہ تذکرہ بھی یہیں تک محدود ہے۔۔البتہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر دوست کی داستانِ عشق بیان کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ ضروری تو نہیں لیکن رائج خودنوشتوں کے سامنے یہاں یہ تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہے بنا چارہ نہیں کہ مصنف نے شریکِ زندگی کے لئے ''کھرُ چن'' کا لفظ استعمال کر کے ایک وسیع تر فلسفے کو بیان کیا ہے۔ یہ لفظ معنوی اعتبار سے اس قدر امیر ہے کہ کوئی اور اس کا بدل ہو ہی نہیں سکتا اور اس لفظ سے جو کام لیا گیا ہے شاید ہی کسی اور نے لیا ہو۔

خاور چوہدری (اٹک)

وقار ساری عمر نہ صرف انتہائی کھرے قسم کے شریف انسان رہے بلکہ شاید اِسی وجہ سے پبلک ریلیشنگ کے فن سے بھی ناواقف ٹھہرے۔ سرزمینِ اٹک کی سنگلاخی' درشت انداز کی پرورش' افسر شاہی کی نوکری سب نے مل کر وقار کو افسانہ لکھنے کا حوصلہ تو بخشا لیکن مزاج کی سختی اور لئے دئے رہنے کی خصوصیت نے شہرت حاصل کرنے کے فن سے نا آشنا رکھا کیونکہ افسانہ لکھنا الگ بات اور ادب میں درجات کے حصول کی کوشش بالکل مختلف صورتِ حال ہے اور اس کا متحمل ہونا وقار کے بس کی بات نہیں۔ وہ جب کبھی امتحانی ہال میں بطور ممتحن گئے تو نہ جانے کیوں امتحان دینے والے طالب علموں سے دیانت اور راستی کے طلبگار رہے جس کے نتیجے میں اُنہیں نیکی' علم دوستی اور ایمان داری کے بجائے ایک کرب' اذیت اور دُکھ کے سوا کبھی کچھ نہ ملا۔۔

انور زاہدی (اسلام آباد)

قدرت اللہ شہاب بذلہ سنجی' نکتہ طرازی اور طنز آمیزی میں اپنی مثال آپ تھے لیکن وقار بن الٰہی کی تحریر میں ان اوصاف کے ساتھ ساتھ حد درجہ اِختصار نویسی' شگفتگی اور شوخی کے علاوہ مزاح کا عنصر بھی غالب ہے جس سے دورانِ مطالعہ قاری کے لبوں پر بے اِختیار پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی ہیں۔۔

بے شمار واقعات ایسے ہیں (جن سے کتاب بھری پڑی ہے) جنہیں پڑھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ہمارے یہ بڑے کتنے چھوٹے ہیں؟ اِتنے کشادہ ایوانوں اور دفاتر میں کام کرنے والوں کے اذہان کتنے محدود ہیں' یہ پڑھے لکھے کتنے اَن پڑھ ہیں' قوم کے فیصلے کرنے والے کتنے خودغرض ہیں' بہ ظاہر یہ طبقۂ اشرافیہ اندر سے کس قماش کے ڈاکو ہیں' کیا یہی لوگ ہماری قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے کو رہ گئے ہیں۔ کاش! کوئی ایسی طاقت اللہ غیب سے بھیج دے جو اس مرکز سے یہ کالی بھیڑیں چن چن کر ہانک لے جائے اور ان کی جگہ صحیح قومی درد اور قومی سوچ رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ آ جائیں جو اس

قوم کی کشتی کو بچا کر لے جائیں۔۔
اِس داستان میں کیا کچھ نہیں' لیکن ان حقائق کو جاننے سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے' جس طرح بعض فلموں کے بارے میں مشہوری کی جاتی ہے کہ کمزور دل رکھنے والوں کے لئے یہ فلم دیکھنا ممنوع ہے' اسی طرح میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ قومی درد اور قومی سوچ رکھنے والے ذہنوں کے لئے یہ کتاب مفید اور صحتمند نہ ہوگی کہ قدم قدم پر اُن کا بلڈ پریشر بلند ہوگا۔۔لہذا حد درجہ حساس لوگ اس کا مطالعہ نہ ہی کریں' تو بہتر ہے۔۔

قیوم مروت (کوہاٹ)

یہ تخلیق (ماں' میں تھک گیا ہوں) اپنی تکنیکی جدت اور معنوی تہہ داری کے علاوہ موضوعاتی مضمرات کی وسعت و تنوع کے بموجب بھی متاثر کرتی ہے۔شہری زندگی ہو یا دیہی زندگی' طرزِ احساس میں ہونے والی تبدیلیاں اور ماحولیاتی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے رویے ہوں یا دورِ حاضر میں پنپنے والی مادیت کے نتیجے میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت ہو یا موجودہ تہذیبی بحران کے زیرِ اثر اپنی تہذیبی شناخت اور موجودہ المناک صورت حال ہو' غرض عصری زندگی کے یہ تمام تلخ حقائق مصنف نے اپنی تحریر میں ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ منعکس کئے ہیں۔

ماہ طلعت (اسلام آباد)

آپ نے اپنی کتاب میں زمانے' دور اور معاشرت کو بلکہ مخصوص وقت میں قید کر لیا ہے اور یہ کم اہم بات نہیں۔ایسی کتابوں کی خصوصیت ہی یہی ہوتی ہے کہ کسی فرد کے ذاتی حالات دوسرے کے لئے اہم ہوں یا نہ ہوں' مورخوں اور تاریخ سے شغف رکھنے والوں کے لئے بے حد اہم ہوتے ہیں۔جب بھی کوئی اس ملک کے حالات لکھنے بیٹھے گا تو اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکے گا کہ کتاب میں قید وقت اور زمانہ بڑھ چڑھ کر گواہی دیں گے۔۔

طاہر محمود (لاہور)

تم نے اپنا زندگی نامہ کمال ہنرمندی' احتیاط اور سلاست سے لکھا ہے۔کوئی تعلی نہیں' کوئی بڑھک نہیں ماری۔اپنے میدان میں کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کی' نہ رانجھا بنے ہو نہ گاما پہلوان۔یار سچ کہوں یہ کہانی تم نے بہت اونچی لکھ دی۔

پروفیسر سمیع اللہ قریشی (جھنگ)

تلاشِ بسیار کے بعد مجھے آپ کا پتہ اور فون نمبر ملا ہے۔میں اِس سے پہلے بھی آپ کے مجموعے پڑھتا رہا ہوں اور اب اس کتاب کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔آپ نے تو سب کچھ صاف صاف اور کھلا کھلا لکھ دیا ہے۔ہمارے ہاں کیا کچھ اور کیسے ہوتا ہے اور کوئی اگر ان برائیوں کی روک تھام کی کوشش کرتا ہے تو ہم اُس کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔اتنی عمدہ تحریر پر دلی مبارک باد قبول کیجئے۔

ریاض اختر (اسلام آباد)

۔ انتظار ۔

رات خاموش ہوا چُپ ہے فضا گُم سُم سی
کوئی آہٹ پسِ دیوار تھکی بیٹھی ہے
ایک مخصوص سی دستک کا گُماں رہ رہ کر
اجنبی لمحوں کا بے سمت سفر جاری ہے
کوئی پیکر کوئی سایہ نہ کوئی پرچھائیں
اپنی آواز پہ خاموشی نظر دوڑائے
نیند خوشبو کی طرح ہم سفر ہواؤں کی
ہیں مجسّم سے ہوئے سوچ کے گہرے سائے
ہر طرف جیسے اُبھرتی ہے چاپ قدموں کی
دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں لمحہ لمحہ
خامشی بڑھتی چلی جائے تیرگی کی طرف
شور راہوں کا دبا جائے ہے رفتہ رفتہ
اوس سی پڑنے لگی آس کے کہکساروں پر
اور دُھواں دینے لگے بُجھتے اُمیدوں کے چراغ
بے بسی چیر رہی ہے سراب کا سینہ
جھلک رہے ہیں بہت چشمِ منتظر کے ایاغ
وقت پہنے ہوئے زنجیر گذرتا جائے
کبھی جھنکا کوئی تو کبھی گونگی سی صدا
راہِ اُمّید میں بو جائے فصلِ مایوسی
ہچکیاں لیتی ہوئی چاند ستاروں کی ضیا

نیاز جیراجپوری
(اعظم گڑھ' بھارت)

''رحمت کی گھٹائیں''

نعت

کل خواب میں دیکھا تھا اُنہیں دیدۂ تر سے
وہ رحمتِ خالق ہیں، بلائیں گے اُدھر سے

مہکار گلابوں کی ابھی تک ہے فضا میں
گزرے تھے مدینے کی وہ جس راہ گزر سے

وہ شافعِ محشر ہیں، وہی حاصلِ ایماں
رحمت کی گھٹائیں بھی اُٹھیں گی اُسی در سے

خلاّقِ ازل یوں تو بدل دیتا ہے دل بھی
لیکن مرے آقاؐ کی دعاؤں کے اثر سے

وہ حسنِ عطا، حسنِ کرم، حسنِ نظر ہیں
دنیا ہی بدل دیتے ہیں وہ پہلی نظر سے

وہ محرمِ اسرارِ فلک، ہادیِ برحق
کب لوٹا ہے مایوس کوئی آپ کے در سے

پھر دیکھنا منظر درِ اقدس سے فلک تک
لکھو تو کوئی نعت کبھی خونِ جگر سے

اظہارِ تمنا کی بھی حاجت نہیں راحتؔ
دُھلتے ہیں جہاں دل کے غبار ایک نظر سے

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

نعت رسول مقبول ﷺ

جہاں میں جلوہ فرمانا مبارک
مبارک آپ ﷺ کا آنا مبارک

کدھر جانا، کدھر جانا نہیں ہے
وہ رستہ ہم کو دکھلانا مبارک

محبت اور اچھائی کی خوشبو
ہر اِک گوشے میں پھیلانا مبارک

سبھوں کو زیست کرنے کا سلیقہ
بتانا اور سکھلانا مبارک

محمد مصطفیٰ ﷺ کا اس جہاں میں
لباسِ نور میں آنا مبارک

گھٹا رحمت کی بن کر قریہ قریہ
برس جانا، کبھی چھانا مبارک

مکمل چاند کو دو ٹکڑے کر کے
بھری محفل میں دکھلانا مبارک

بڑی ہی خندہ پیشانی سے آقا ﷺ
ہر اک گتھی کو سلجھانا مبارک

شبِ معراج میں صابرؔ نبی ﷺ کا
سرِعرشِ بریں جانا مبارک

صابرؔ عظیم آبادی

(کراچی)

گھر

ڈاکٹر اختر آزاد
(جمشید پور،بھارت)

بوڑھے اطہر علی خاں لان میں بیٹھے یادوں کے البم سے گھر کی پرانی تصویریں نکال کر دیکھ رہے تھے کہ عین اُسی وقت اُن کا بیٹا وہاں پہنچ گیا۔اور جب اُنہوں نے بھی گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ خوشی سے پاگل ہو اُٹھے۔

''بیٹا تم نے یہ کیا کہہ دیا۔؟ اب جتنی جلدی ہو کاغذات تیّار کر لو۔ میں جلد سے جلد ہندوستان جانا چاہتا ہوں۔''

سرفراز علی آزاد ایک مشہور فکشن رائٹر تھے۔ کئی کتابیں تھیں اُن کی۔ معدّ دا ایوارڈ مل کے تھے جب وہ یونیورسیٹی سے ریٹائر ہوئے تب انہوں نے سب سے پہلے آٹو بائیوگرافی لکھنے کا منصوبہ بنایا۔لیکن جب بھی وہ لکھنے بیٹھتے۔ پریشان ہو جاتے۔ اُنہیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں سے شروع کریں۔؟ پیدائش تو ہندوستان کی ہے۔ اِس لئے وہ چاہتے تھے کہ اپنی جائے پیدائش کو دیکھیں، محسوس کریں اور تب قلم اُٹھائیں تا کہ اُن کے بیان میں سچّائی اور تحریر میں شگفتگی آسکے۔

قریب تین مہینے کے اندر تمام کاغذات تیّار ہو گئے۔ جب گھر سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے، تب اُن کا پوتا شاہنواز علی جناح بھی ان کے ساتھ تھا۔اطہر علی خاں کی آنکھوں میں اُس وقت گھر کی تصویریں ناچ رہی تھیں۔

جب ٹرین ہندوستانی سرحد میں داخل ہوئی تو اُنہیں ایک طرح کی گونا گوں راحت کا احساس ہوا۔ وہ خیالوں میں کھو گئے.....

بٹوارہ اور بٹوارے سے پیدا ہونے والے حالات کو دنیا کی تمام قوموں نے کم وبیش ایک ہی طرح سے جھیلا ہے۔ کچھ ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات سے نبرد آزما ہو کر وہ دسمبر سینتالس کی کڑکڑاتی ہوئی سردرات میں لاہور پہنچے تھے۔ جہاں رہائش کے لئے اُنہیں ایک ہندو کا گھر الاٹ کیا گیا تھا۔

آج بھی وہ دن اُنہیں اچھی طرح یاد ہیں۔ حالات ناگزیر ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ پاکستان جانے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن ایک ڈھلتی ہوئی شام کا سورج ابھی پوری طرح سے زرد ایا بھی نہیں تھا کہ اُن کا دوست ہانپتا کانپتا وہاں آیا ''اطہر میرے یار! جب سے پشاور اور لاہور سے ریل گاڑیوں میں لاشیں بھر کر آئی ہیں، تب سے یہاں کے لوگوں کے دماغ میں بارود بھر گیا ہے۔ محلّے کے سارے مسلمان پہلے ہی گھر چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ہیں۔اس لئے اچّھا ہوگا کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔رات بھر میں کہاں کیا ہو جائے گا بتانا مشکل ہے۔''

اُس وقت تک اطہر علی خاں کو بھی حالات کی سنگینی کا علم ہو چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ رات کے اندھیرے میں گُم ہوتے، بجرنگ بلی کے نعرے لگاتے ہجوم نے اُنہیں گھیر لیا، اقبال سنگھ نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اطہر علی خاں، ان کی بیوی اور بچّے کو کرپان کی دھار پر پولس اِسٹیشن تک پہنچایا۔ جہاں سے اُنہیں کیمپ میں بھیج تو دیا گیا،لیکن اقبال سنگھ کا کیا ہوا۔؟ وہ کہاں گیا۔؟ یہ اب تک ایک معمّہ بنا ہوا ہے۔

لاہور سے دہلی تک کا سفر کیسے طے ہوا۔اطہر علی خاں کو پتہ ہی نہیں چلا۔اُنہوں نے جامع مسجد کے پاس ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ پہنچتے ہی شام ہو گئی تھی۔ تھکے ہارے تھے اِس لئے دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ گھر کی تلاش میں نکلے۔ایک دو اور پھر پورے بارہ دن تک اُنہیں گھر کا کوئی سراغ نہیں ملا تیرہویں دن ہوٹل سے نکلتے ہی اطہر علی خاں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ آخری بار گھر ڈھونڈنے نکل رہے ہیں۔ کیوں کہ پندرہویں دن پاکستان لوٹ جانا تھا۔ چودھویں دن مارکیٹنگ کا پروگرام تھا۔آج وہ پورا شہر چھان مارنے کے ارادے سے نکلے تھے۔لیکن پرانی عمارتوں کی جگہ بنی عالی شان عمارتوں اور سڑکوں کے مکڑ جال نے اُن کے حوصلے پست کر دئے تھے۔ سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ آٹو رکشے پر چلتے چلتے وہ تھک گئے تھے۔ مایوسی نے اُن کے قدم جکڑنے شروع کر دئے تھے ۔اور اب وہ لوٹنے ہی والے تھے کہ یکا یک چمتکار ہو گیا۔

''مل گیا.....''

اطہر علی خاں زور سے چلّائے اور لگ بھگ رکشے سے بوڑھے پاؤں پر کود گئے۔ دونوں نے جلدی سے پکڑا۔لیکن وہ تو دوسری دنیا میں تھے۔ اِسلئے وہ بہت دیر تک حیران وششدر وہیں کھڑے رہے۔ ساٹھ سالوں میں پوری دلّی بدل گئی تھی۔لیکن اُن کا گھر آج بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا وہ چھوڑ گئے تھے سرفراز علی آزاد نے فوراً کیمرہ سنبھال لیا۔اُس وقت شاہنواز اُس گھر کو کم، اونچی اونچی عمارتوں کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔

اطہر علی خاں کے بوڑھے پاؤں میں گرماہٹ آ گئی تھی۔ وہ دونوں سے پہلے سڑک پار کر کے گھر کے قریب پہنچ گئے اور جذبہء سرشاری میں دیواروں کو چھونے لگے۔ اُس وقت اُن کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہی دیواریں، وہی لکھی ہوئی آیتیں، وہی ستون اور اُن پر بنے وہی گُل بوٹے ...... پھر دھیرے دھیرے اطہر علی خاں برآمدے کے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں بھی اُن کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے سامنے والے کمرے کا منظر پردہ سرک جانے کی وجہ سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں پلنگ پر لیٹا ہوا ایک بوڑھا وکیل سے کہہ رہا تھا۔

''یہ گھر مجھے پارٹیشن کے بعد رہنے کے لئے ملا تھا۔ یوں سمجھو کہ یہ

کرائے کا گھر ہے۔معقول کرائے کی ایک رقم تب سے لے کراب تک بینک میں جمع بھی کرتا آیا ہوں۔ چونکہ یہ گھر میرا نہیں ہے۔اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد اِس گھر کے مالک یا حقیقی وارث کو جو یقیناً پاکستان میں ہیں۔اُس کا پتہ کورٹ اپنے طور لگائے اور لیگل پروسیس کے تحت یہ گھر اُن کے حوالے کرے۔تاکہ میری آتما کو شانتی ملے''

جئے کمار کو اپنے باپ کی وصیّت کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ لیکن جب پہلی بار رام کمار کو معلوم ہوا تو وہ دل ہی دل میں دادا کو پاگل قرار دینے لگا باپ کے ڈر سے کچھ دیر خاموش رہا۔لیکن کب تک خاموش رہتا۔ یکا یک اندر کی ناراضگی اُبل پڑی۔

''دادا گھر آئی لکشمی کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔اور اس پر ستم یہ کہ آپ کرایہ بھی جمع کر رہے ہیں.....؟''

ستیہ کمار نے مسکراتے ہوئے پوتے کو اپنے پاس بٹھایا۔سر پر ہاتھ رکھا اور سمجھایا۔''جس گھر کو میں نے بنایا ہی نہیں، وہ میرا کیسے ہوسکتا ہے۔؟ جس کا ہے اگر اُسے اتنے سالوں بعد مل جائے تو اُغوا ہوئی اولاد کو پانے جیسی خوشی ملے گی۔ کتنی دعائیں دے گا وہ۔یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''لیکن دادا! بٹوارے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔جس کے پاس جو آ گیا وہ اُسی کا ہو گیا۔'' پھر کچھ رک کر طنزیہ لہجے میں۔''وہ جسے آپ نے بنایا تھا وہ کسی پاکستانی کے قبضے میں ہی ہوگا نا...؟ پہلے یہ بتایئے کہ اُس نے کبھی آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی...؟ پھر ہم کیوں لوٹائیں...؟''

بیٹے کی اِس حرکت پر جئے کمار نے اُسے ڈانٹ پلائی''جب اُن کا فیصلہ مجھے منظور ہے تو تمہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں ۔ بلکہ تمہیں تو اُن کی آئیڈیالوجی پر فخر ہونا چاہئے۔''

اطہر علی خاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ اندر کی ساری باتیں سُن چکے تھے۔اُس وقت وہ دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے اور بوڑھے سے جلد سے جلد ملنے کے لئے بے تاب تھے۔لیکن آواز دینا مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔تبھی بوڑھے کا بیٹا وکیل کو چھوڑنے باہر آیا۔اطہر علی نے اُسے اپنے بارے میں بتایا۔کچھ دیر بعد بوڑھے کو جب یہ معلوم ہوا کہ پاکستان سے اطہر علی خاں آئے ہیں تو اُن کی سانسیں تیز ہوگئیں۔بولے۔''جا کر پوچھ کہ والد کا کیا نام ہے۔؟'' جب نام بتایا گیا تو دل دھونکنی کی طرح دھڑکنے لگا۔''انہیں اندر بٹھاؤ۔'' جلدی میں انہیں چپّل بھی نہیں مل رہی تھی۔بڑی مشکل سے ملی بھی تو پیروں میں سمانے میں وقت لگا۔

وہ تینوں ہال میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔اطہر علی خاں نے دیکھا کہ طاق میں قُرآن شریف اُسی جگہ رکھا ہوا ہے جہاں انہوں نے رکھ چھوڑا تھا ۔یہ دیکھ کر ان کی بوڑھی آنکھیں بھیگ گئیں۔پاور لگے چشمے کے شیشے کو انہوں نے صاف کیا بیٹے کو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔تیس سالہ پوتا اِن باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔لیکن وہ اتنا تو سمجھ ہی رہا تھا کہ یہ گھر اب بھی دادا کے نام سے ہے۔اور اگر بٹوارہ نہیں ہوا ہوتا۔ پاکستان نہیں بنتا۔ وہ بھی اسی گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہیں رہتا۔

ہندوستانی دادا لاٹھی ٹیکتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور سیدھے پاکستانی دادا کے گلے سے لگ گئے ۔ دیر تک دونوں کی آنکھوں کے کنارے رِستے رہے۔

''کیا حال ہے بھئی میرے لاہور کا.....؟''ستیہ کمار کی آواز میں وطن چھوڑنے کا درد نمایاں تھا۔ وہ وہاں کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب تھے۔

''سب ٹھیک ہے ....'' اطہر علی خاں نے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔

''اطہر میاں! میں نے آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ ہر اُس شخص سے جو پاکستان آتا جاتا تھا، اُس سے میں تمہارا ذکر کرتا تھا۔لیکن کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔'' پھر وہ کچھ وقفے کے لئے رُکے اور اپنے پوتے سے کہا۔'' رام کمار بیٹا! ہاتھ منہ دھونے کے لئے پہلے پانی وانی لا۔اور اندر جا کر اپنی ماں سے کہہ کہ مکان مالک آئے ہیں۔ اِس لئے کچھ اچّھا اچّھا کھانا بنا۔ ورنہ پاکستان میں ہندوستانی ذائقے کی بڑی بدنامی ہوگی۔''ستیہ کمار جی! یہ کھانا وانا تو ٹھیک ہے،لیکن مکان مالک کہہ کر آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔بھئی ہم لوگ تو آپ کے مہمان ہیں۔'' پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے اُنہوں نے بیٹے کی طرف اِشارہ کیا۔''یہ ہے میرا اکلوتا بیٹا آزاد۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ رائٹر ہے ۔ سوانح عمری لکھ رہا ہے ۔ اُس کی خواہش تھی کہ اپنے ہندوستان والے گھر کو دیکھوں۔اور وہ میرا پوتا ہے۔شاہنواز علی جناح۔''

''یعنی اگر بیٹا جیونی نہیں لکھ رہا ہوتا تو آپ کبھی یہاں نہیں آتے۔؟'' ستیہ کمار نے سوال کی ایک چھوٹی سی انّی پھینکی جو سیدھے اُن کے سینے میں اُتر گئی۔

''ہاں ایسا ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ بہت سارے زخم ....'' کہتے کہتے اُنکا بوڑھا جسم کپکپانے لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور پھر بہت سارے بھیگے مناظر آنکھوں کے اِسکرین نما اسٹیج پر محوِ رقص ہوگئے۔

کیمپ کا دوسرا دن تھا۔ سامان چوری ہو گیا تھا۔ دو تین دن تک کھانا جیسے تیسے کر کے مل گیا۔لیکن جیسے جیسے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کھانے پینے میں بدنظمی آتی چلی گئی۔ جب بھی بدنظمی بڑھتی ۔ منتظمین کھانا تقسیم کرنا بند کر دیتے ۔ اِس کے بعد جو پیسہ یا زیور لے کر رسوئی جاتا ، اُسے چھپا کر کھانا دے دیا جاتا یا اندر ہی کسی کونے میں بٹھا کر کھلا دیا جاتا۔ چار ماہ کے سرفراز کو دودھ نہ ملنے کی وجہ سے اُس کا بُرا حال تھا۔ کھانے کی کمی سے بیوی کے سینے میں دودھ کے سوتے سوکھ گئے تھے ۔ اُس روز اُن کے پاس نہ پیسے تھے اور نہ زیورات ہی جسے وہ رسوئی میں آگ کی نذر کرتے ۔ گھنٹوں لوگوں کے ہاتھ

پاؤں جوڑنے کے بعد اُنہیں تھوڑا سا کھانا مل پایا تھا۔ جب وہ لوٹے تو دیکھا کہ سرفراز دودھ کے لئے تڑپ رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُن کی بیوی کسی منتظم کے ساتھ دودھ لینے کے لئے رسوئی تک گئی ہے۔ وہ بچّے کو لے کر اِدھر اُدھر دوڑتے رہے۔ لیکن اُن کی بیوی کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا دوسری صبح کیمپ کے باہر رسوئی کی دوسری جانب منتظمین کی آرام گاہ کے پچھواڑے اُس کی لاش برہنہ حالت میں پائی گئی۔ جسے شام ہوتے ہوتے ندی کے کنارے بغیر کفن کے دفن کر دیا گیا۔

اطہر علی خاں کی آنکھوں سے آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ستیہ کمار نے چپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ اِس کوشش میں کامیاب ہوئے تو اُن کی آنکھوں کے مضبوط بندھ خود بخود ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب اُنہیں بھی بہا کر دور، بہت دور ماضی کی ایک ایسی دنیا میں لے گیا، جہاں پہنچتے ہی وہ خود میں کھو سے گئے۔

جب وہ پشاور ایکسپریس میں سوار ہو کر ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے تو ان کی ٹرین کا حال کرشن چندر کی پشاور ایکسپریس جیسا ہی تھا۔ راستے میں چند شر پسند نوجوانوں نے اُن کی بیوی اور چودہ سالہ بچّی کو اُن کے سامنے گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر اُتار لیا۔ مزاحمت کرنے پر اُنہیں مار مار کر ادھ مرا کر دیا۔ وہ وہیں گر پڑے۔ لیکن کچھ دیر بعد جیسے تیسے کر کے اُٹھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو پلیٹ فارم کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ دوسرے کمپارٹمنٹ سے بھی کئی عورتیں اور لڑکیاں اُتاری گئی تھیں۔ جنہیں بے شمار بھیڑیئے چاروں طرف سے نوچ رہے تھے۔ قریب دو گھنٹے تک ٹرین وہاں رکی رہی۔ درندوں نے اُن کی بیوی کو ہوس کا شکار بنانے کے بعد بڑی بے رحمی سے اُن کے دونوں سینے کاٹ لئے تھے۔ خون سے وہ لت پت پلیٹ فارم پر تڑپ رہی تھی دوسرے پلیٹ فارم پر اُس کی کمسن بیٹی کئی ایک جوانوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اُس کی چیخ بھی سہی سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ لیکن واہ رے اُس کی ہمت کہ اُس نے کئی کو دانت کاٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔ لیکن کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ آخر میں ایک درندے نے اُس کے پھول سے بدن کے پھول سے انگ پر بھالے سے وار کیا۔ خون کا فوّارہ اُٹھا جسے دیکھنے کی تاب ستیہ کمار میں نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔

ستیہ کمار کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ اطہر علی اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ دیر تک ہال میں خاموشی سی چھائی رہی۔ پھر اُنہوں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''اطہر میاں! کیا بٹوارہ اتنا ہی ضروری تھا۔؟ تم نے اپنے جناح کو کیوں نہیں سمجھایا کہ پاکستان کی ضد چھوڑ دو۔ ورنہ دونوں طرف کے لاکھوں لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اپنے گھر سے بے گھر ہو جائیں گے۔''

''ستیہ کمار جی آج کون کس کی بات سنتا ہے۔'' اطہر علی خاں نے طنزیہ لہجے میں بات جاری رکھی۔'' گاندھی، نہرو، آزاد اور دوسرے نیتاؤں کو جب اس بات کا علم تھا کہ جناح چند ہی روز کے مہمان ہیں، تو پھر اُن رہنماؤں نے دور اندیشی سے کام کیوں نہیں لیا؟ کچھ دن کے لئے وزیرِ اعظم بنا دیتے تو ملک کا بٹوارہ تو نہیں ہوا ہوتا نا؟ اگر آج ایک ہوتے تو چاند کیا، سورج بھی ہماری مٹھی میں ہوتا۔''

''ہاں۔!'' ستیہ کمار نے اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے اُن کی باتوں پر صداقت کی مہر لگائی۔ ''لیکن جو ہو گیا، اُس کا کیا کیا جائے؟ اب سے بھی ہمارے سیاسی رہنما صدق دل سے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں تو نہ دوبارہ اکہتر کی خوں ریزی ہوگی۔ نہ کشمیریوں میں دہشت پھیلے گی۔ اور نہ کبھی کارگل ہوگا۔''

''بات تو سولہ آنے سچ کہی ہے آپ نے۔'' اطہر علی کی آنکھیں کچھ بڑی ہو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ ''لیکن اگر اکہتّر نہیں ہوا ہوتا تو کبھی کارگل نہیں ہوتا۔ چوں کہ اکہتّر ہوا ہے اور ابھی بنگلہ دیش کا زخم پاکستان کے سینے میں تازہ ہے۔ اس لئے اِس کے ردِّعمل میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے نپٹنے کے لئے ہندوستانی حکومت جتنی بھی فوجیں سرحد پر تعینات کر دیں۔ لیکن کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔''

دوپہر کے کھانے میں کئی طرح کے پکوان بنائے گئے تھے۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اطہر علی نے کھانے کی بہت تعریف کی۔ کھانے کے فوراً بعد رام کمار کے ساتھ شاہنواز 'مائی نیم از خان' دیکھنے کے لئے نکل گیا۔ وہ ہندوستانی فلموں اور خاص طور سے شاہ رخ خان کا بہت بڑا فین تھا۔ اطہر علی خاں، ستیہ کمار کے ساتھ اُن کے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔

سرفراز علی آزاد اور جئے کمار وہیں ہال میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ ایک ادیب تھا تو دوسرا آرٹسٹ۔ دونوں کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوئے ہیں، اُس ملک نے اُنہیں پناہ نہیں دی۔ دونوں کی حالت اُس وقت اُس بچّے کی طرح تھی جسے مائیں جنم دے کر دوسرے کو گود دے دیتی ہیں.....گود لئے بچّے چاہے کچھ بھی بن جائیں اُنہیں عدم تحفّظ کا احساس ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ کہیں....؟ یہ دونوں بھی ہمیشہ اندر ہی اندر ڈرے سہمے سے رہتے کہ کہیں دونوں ممالک کے درمیان جنگ نہ چھڑ جائے۔ اِس سے بچنے کے لئے دونوں ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔

''جنگ مسائل کو جنم دیتی ہے ختم نہیں کرتی.....''

''اصل میں ہم ختم کرنا نہیں چاہتے۔ اگر جغرافیائی حدود کا خیال رکھیں۔ کشمیر کی دانستہ او ور لیپنگ سے اجتناب برتیں۔ اور اپنے اپنے ملک کے نقشے کو درست کر لیں۔ تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔''

''جئے کمار جی! اِس طرح کے کئی اہم مسئلوں پر ہمارے رہنما شملہ، لاہور اور آگرہ سمجھوتے کر چکے ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی یہ مدّے اُٹھائے گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ عالمی ادارے اِس مسئلے کو سلجھا سکیں گے۔؟ جو خود کٹھ پتلی ہیں'' سرفراز علی خاں نے یہ کہہ کر عالمی امن اداروں

کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

'' آپ نے بالکل سہی کہا ہے۔'' جئے کمار نے اُن کی بات کچھ اور آگے بڑھائی۔'' ورنہ لاکھوں فلسطینیوں، لبنانیوں، افغانستانیوں اور عراقیوں کی جانیں بے موقع و محل نہیں جاتیں۔ صدّام کو پھانسی نہیں ہوتی۔''

''رام کمار اور شاہنواز جب فلم دیکھ کر لوٹے تو اُسی بائک سے جئے کمار اور سرفراز علی آزاد کتاب بازار گئے۔ سرفراز کو گیان پیٹھ اور ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ کتابیں خریدنی تھیں دونوں کے ہال سے باہر نکلتے ہی دونوں کے صاحبزادے دونوں کی جگہوں پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔

شاہنواز پالٹیکل سائنس میں پی جی تھا تو رام کمار نے شدّت پسند گیروا پارٹی جوائن کر رکھا تھا۔ اِس لئے فوراً سیاست پر گفتگو شروع ہو گئی۔ موضوعِ بحث تھا۔ فوجی حکمراں، دہشت گردی، لائن آف کنٹرول، مقبوضہ کشمیر، آئی ایس آئی، جماعت اسلامی، آر ایس ایس، اکھر دھام، لال قلعہ اور بابری مسجد.....

''اکثر تمہارے فوجی حکمراں ڈرانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں ....؟'' بات ہی بات میں رام کمار نے شاہنواز سے پوچھ ہی لیا۔

''تم جو بھی کہو۔ لیکن سچّائی یہ ہے کہ پہلے تم نے پوکھران کا دھما کہ کیا۔ ہم نے تو صرف جوابی کارروائی کر کے بتایا کہ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔''

اِس دوران جئے کمار اور سرفراز علی آزاد بازار سے لوٹ آئے تھے۔ دونوں کو سیاست پر گفتگو کرتے دیکھ کر جئے کمار بھی میدان میں کود پڑے۔

''جواب تو دونوں حکومتوں کا نہیں ہے۔ دونوں کے یہاں کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ لوگ غریبی سے مر رہے ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے پر سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے ایٹمی طاقت کو بڑھانے میں رات دن پاگل ہو رہے ہیں۔''

''اسلحے کبھی ملک کی ترقی کے ضامن نہیں ہو سکتے۔'' سرفراز علی خاں نے بھی اپنا موقّف ظاہر کیا۔'' اِس پر جتنے پیسے خرچ کئے جا رہے ہیں اگر اس کا آدھا حصّہ بھی غریبوں کے لئے مختص کر دیا جاتا تو دونوں ملکوں کی خوشحالی کا گراف آج کچھ اور کہانی بیان کر رہا ہوتا۔ لیکن افسوس...؟''

جئے کمار، سرفراز علی آزاد کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رام کمار اور شاہنواز دونوں کے ذہن میں اب بھی بہت سارے سوالات کلبلا رہے تھے۔ جیسے بابری مسجد بغیر کسی تاریخی شواہد اور عدالت کے فیصلے کے بغیر کیوں توڑ دی گئی۔؟ ہائی کورٹ کا فیصلہ آیا تو بابری مسجد اور رام جنم بھومی میں آدھا آدھا نہیں بٹ کر تین حصّے میں کیسے بٹ گیا؟ کیا مدرسے دہشت گردی کے اڈّے نہیں ہیں؟ لال مسجد میں جو ہوا وہ کیا تھا۔؟

ستیہ کمار اور اطہر علی خاں دوسرے کمرے سے لیٹے لیٹے سب کچھ سن رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ نئی نسل 'پاکستان' کا مطلب .....' دہشت گرد' اور 'ہندو' کا مطلب 'ہندوستانی مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والا' کیوں سمجھتی ہے۔؟ ایک دوسرے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے ہی کیوں دیکھتی ہے۔؟ اس پر اطہر علی خاں نے افسوس کا اِظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اِس میں قصور نئی نسل کا نہیں، حکومت کا ہے۔ ہمارے دانشوروں کا ہے۔ جنھوں نے بٹوارے کو ہندو مسلم کی نگاہ سے دیکھا اور ہندی، اردو کے لئے الگ الگ نصاب تیّار کئے۔ ہمارے پاکستان میں جو نئی نسل ہے وہ گاندھی نہرو اور آزاد کو نہیں جانتی۔ یا پھر وہ اہمیّت نہیں دیتی۔ جب کہ یہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔''

''ہمارے یہاں بھی جناح اور ان کے حمایتیوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے بڑے مسلم رہنماؤں پر ادنیٰ قسم کے رہنما کو فوقیت دی جاتی ہے۔ حامد جیسے جاں بازوں کو مثال بنا کر پیش نہیں کیا جاتا۔ جب تک نئی نسل مشترکہ کارناموں سے روشناس نہیں ہوگی، تب تک وہ حقیقت سے بعید ایک دوسرے سے نفرت کرتی رہے گی جلیاں والا باغ کے کلپرٹ مائکل اوڈائر کو قتل کرنے والے اودھم سنگھ کی باقیات کو 'پینٹن ویلے' لندن کے کوئنگ لائم یارڈ سے نکال کر سرکاری اعزاز کے ساتھ آزادی کے فوراً بعد بھارت لایا جاتا ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مغل سمراٹ بہادر شاہ ظفر کی باقیات کو آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی رنگون سے دہلی نہیں لایا جا سکا ہے۔ آخر کیوں۔؟''

دوسرے دن مارکیٹنگ کے لئے تینوں باہر نکلے۔ ڈھیر سارے تحفے تحائف رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے خریدے گئے۔ واپسی میں ہوٹل سے سامان بھی لیتے آئے۔ اُس رات کھانے کے بعد سبھی ستیہ کمار کے کمرے میں موجود تھے۔ دورانِ گفتگو ستیہ کمار نے موقع غنیمت جان کر وہ بات بھی کہہ دی جسے کہنے کے لئے وہ برسوں سے بے چین تھے۔

''اطہر میاں! زندگی اور موت کا کیا ٹھکانا۔ آج ہوں کل نہ رہوں۔ پھر نئی نسل کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب ہمیں بھول جائے۔ اِسلئے میں نے وکیل کو بلوایا تھا۔ لیکن اب جب آپ خود آ گئے ہیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں میں نے گھر کے سارے کاغذات سنبھال کر رکھے ہیں۔'' ستیہ کمار نے پلنگ کے نیچے سے زنگ آلود صندوق کھینچا۔ اسے زنجیر سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اس میں سے انہوں نے گھر کے کاغذات اور بینک کی پاس بک نکالی اور اطہر علی کی طرف بڑھا دیا۔'' جب تک میں اِسے آپ کے حوالے نہیں کرتا۔ چین سے موت بھی مجھے گلے نہیں لگاتی۔'' ستیہ کمار کی اس بات پر پہلے اطہر علی خاں مسکرائے پھر بولے۔

''میں کیا کروں گا اِسے لے کر۔؟ مجھے نہیں چاہئے یہ سب۔ کیا یہ کم ہے کہ آپ نے میرے سپنوں کو سنجو کر رکھا ہے۔ اور میں اتنے سالوں بعد اپنے اُس گھر کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ جس میں چھوڑ گیا تھا۔'' یہ کہتے ہی اطہر علی خاں کی آنکھیں شکریہ کے انداز میں جھک گئی تھیں۔

ستیہ کمار اس سے پہلے کہ کچھ کہتے شاہنواز دادا کے سامنے آ جاتا ہے۔

''دادا جان! ستیہ دادا جب خوش دلی سے آپ کو آپ کی چیز لوٹا رہے ہیں تو پھر لینے میں بُرائی کیا ہے۔؟''

دوسری طرف رام کمار کروڑوں کی جائداد کو اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر اندر ہی اندر پریشان ہو جاتا ہے اور آخر میں دادا سے کہتا ہے۔''برسوں سے جب آپ اِس گھر کی حفاظت کر رہے ہیں تو پھر آگے آپ کو کیا پریشانی ہے۔؟ میں ہوں نا آپ کی دیکھ بھال کے لئے....''

اُس وقت جئے کمار عجیب کشمکش میں پھنس گئے تھے۔اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔؟ باپ کی حمایت کریں یا بیٹے کی حرکت پر اُسے ڈانٹیں۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے نئی اور پرانی نسل کے درمیان ترازو بن کر جھول گئے۔

''پاپا! ایسا کیوں نہیں کرتے کہ گھر انکل کو دے دیں اور کرائے والی وہ رقم جو بینک میں ہے اُسے اپنے پاس رکھ لیں۔''

ستیہ کمار نے بیٹے کی طرف ترچھی نظر سے دیکھا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے ،سرفراز علی آزاد نے مسکراتے ہوئے بٹوارے کا خیر مقدم کیا ''انکل جئے کمار ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔میرے حساب سے مناسب تو یہ رہے گا کہ.....کل چونکہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔گھر تو لے جا نہیں سکتے اور نہ ہی اتنی جلدی میں کسی کو بیچ سکتے ہیں۔لیکن رقم کو آسانی سے ایکسچینج کر کے پاکستان لے جا سکتے ہیں اس لئے.....''

سرفراز کی اس بات پر اطہر علی خاں برانگیختہ ہو اُٹھتے ہیں۔''تم اتنے بڑے رائٹر ہو کر اس طرح کی گھٹیا باتیں کر رہے ہو۔ارے انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جس طرح سے اُنہوں نے میرے گھر کی حفاظت کی ہے، مجھے اس کے عوض اُنہیں انعام دینا چاہئے اور تم ہو کہ.....؟''

دادا کی اس بات پر شاہنواز نے ایک زوردار ٹھہا کا لگایا اور اندر ہی اندر کچھ بڑبڑایا۔پھر وہ کچھ دیر تک ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔سوچتا رہا کہ اُس کے دادا کتنے معصوم ہیں۔گھر آئی دولت کو لات مار رہے ہیں۔اُسے رونا آرہا تھا دوسری طرف رام کمار یہ سوچ رہا تھا: کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاکستانی دادا کا ارادہ بدل جائے۔مفت ہاتھ آجائے تو بُرا کیا ہے۔یہ تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔وہ دوسری ترکیب سوچنے لگتا ہے۔پھر جھوٹی تعریف کے پُل باندھ دیتا ہے۔

''واہ دادا واہ! آپ کے اِس فیصلے نے مجھے اپنا مُرید بنا لیا ہے۔انسان کی اگر پوجا کی جاتی تو دل کے مندر میں آپ کو بٹھا کر میں صبح وشام پوجتا رہتا۔''

''نہیں! پوجنے کے لائق تو تمہارے دادا ہیں بیٹے۔''سرفراز علی نے کہا۔ابھی ابھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سوانح عمری سے پہلے تمہارے دادا کو مرکزی کردار بنا کر ایک زبردست ناول لکھوں گا۔قسم خدا کی ایسا جیتا جاگتا کردار آج کے مطلب پرست دور میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والا۔''

سرفراز علی آزاد کو جو وقت ملا اُسی میں انہوں نے اپنی سوانح عمری کے لئے تصویریں کھینچ لیں۔ یہاں کے جغرافیائی حالات اور یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے متعلق بھی بہت ساری معلومات جمع کر لیں۔ناول کے لئے ستیہ کمار سے اُن کی زندگی کے چند اہم پہلوؤں پر گفتگو کی۔اُنہیں ہندوستانی عظمت کا گہوارہ قرار دیا۔والد کی شخصیت بھی اُن کے لئے کسی مُعمّے سے کم نہیں تھی۔کفایت شعاری اور پیسے کے پیچھے بھاگنے والا شخص انہیں اب سادھو،فقیر نظر آرہا تھا۔ناول کے ضمنی کردار بھی اُسے اس طرح گھر بیٹھے مل جائیں گے۔اس نے سوچا نہیں تھا۔وہ آج بہت خوش تھے۔

ویزا کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔آج تینوں پاکستان لوٹ رہے تھے۔لوٹنے سے پہلے اطہر علی خاں نے گھر کے ایک ایک حصّے کو اچھی طرح دیکھا تھا۔آخر میں ستیہ کمار کے کمرے میں آئے۔اپنی گاڑھی محنت سے بنی بلیک شیشم کے پلنگ کو جس میں اب بھی وہی چمک تھی ،اُسے کئی بار چھوا۔گذرے دنوں کی یادوں کو اپنے اندر محسوس کیا اس پلنگ پر ہی انہوں نے دلہن کا شرم سے گلنار چہرہ دیکھا تھا۔اُسے سونے کی انگوٹھی پہنائی تھی۔پھر یکے بعد دیگرے کئی مناظر اپنے بدن کھولنے لگے۔اُن کی آنکھیں پوری طرح سے چھلک اُٹھیں ستیہ کمار سب کچھ سمجھ رہے تھے۔لیکن خاموش تھے۔اُن کی اس خاموشی میں بھی کئی راز پنہاں تھے۔وہ بھی اطہر علی خاں کے گلے مل کر خوب روئے۔جئے کمار بھی سرفراز علی آزاد سے گلے ملتے ہی جذباتی ہو گئے تھے۔انھوں نے تحفے میں ہندوستان و پاکستان کا نیا نقشہ پیش کیا۔سرفراز نے بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔

گھر سے نکلتے وقت ستیہ کمار خود کو کمزور پاؤں پر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔عورتیں برآمدے تک آئیں۔بچّے بھی پاؤں چھونے کے لئے روڈ تک آئے۔اِس بھیڑ میں گھر کے جہاں سارے افراد تھے۔وہیں رام کمار سر درد کی وجہ سے بام لگا کر دادا کے کمرے میں سویا ہوا تھا۔

ٹیمپو میں سامان رکھا جا رہا تھا۔آس پاس کے دو چار لوگ بھی اُن سے ملنے آگئے تھے۔ستیہ کمار نے آخری بار التجا کی ''پلیز گھر کے کاغذات لیتے جائیں۔''اطہر علی کی آنکھیں اُس وقت بھیگی ہوئی تھیں۔اُنہوں نے ستیہ کمار کی طرف دیکھا۔لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ستیہ کمار بھی کچھ دیر خاموش رہے۔پھر جئے کمار سے بولے۔

''بیٹے انہیں جلدی اِسٹیشن چھوڑ آ''

اِسٹیشن پہنچتے ہی شاہنواز کو کچھ یاد آیا۔ٹرین آنے میں کچھ دیر تھی۔اُس نے اِس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔''میں نے کل پاس کی ایک دکان سے ممّی کے لئے تحفہ پسند کیا تھا۔سوچا تھا کہ جاتے وقت لے لوں گا۔بس میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

باہر نکل کر وہ ٹیمپو میں سوار ہوا۔راستہ بھر سوچتا رہا کہ ستیہ دادا سے جا

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

''محفل ہست و بود''

عذرااصغر (کراچی)

تازہ بنی ہوئی بھر بھری مٹی کی کیاری میں میں نے ٹماٹر کا پہلا پودا لگایا اور میرے اندر سے یادوں کا ٹھنڈا مہکتا ہوا ایک جھونکا نکلا اور جانے کتنے برسوں کے فاصلے پر مجھے لے اڑا۔

''بھتّو! ذرا جلدی سے جاؤ اور باہر کچن گارڈن سے تھوڑے ٹماٹر توڑلاؤ''

میری پھوپھی زاد نے لجاجت بھر لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں شام کو کرکٹ کھیلنے کے لئے بیٹ بال صاف کر رہی تھی۔

میرے پھوپھی زاد بھائی اور ایک میری ہمسن بہن مسعودہ اسکول گئے ہوئے تھے۔ اور میں جو اپنی پھوپھی کے گھر مہمان آئی ہوئی تھی اپنے وقت کو بہتر بنانے اور اکیلے پن کو کاٹنے کے مشغلے ڈھونڈ رہی تھی۔ ہم ہر شام باہر کے لان سے ملحق میدان میں کرکٹ کا میچ کھیلتے تھے اور کبھی بیڈمینٹن۔ اور پڑوس کے بنگلے میں آباد بنگالی افسر کی بیٹیاں اُولی اور جھرنا بھی ہمارے ساتھ آکر میچ میں شریک ہوتیں۔ اولی ذرا بڑی تھی اور شلوار قمیص پہنتی تھی۔ جھرنا فراک یا اسکرٹ۔ جھرنا نومی کو بہت اچھی لگتی تھی۔ نومی ہمارے مقابلے میں جھرنا کی طرفداری کرتا تھا۔ اس لئے ہم تھوڑا تھوڑا جھرنا سے لگتے ضرور تھے۔ مگر اچھی تو وہ ہم سبھی کو لگتی تھی۔ حالانکہ جھرنا کا رنگ اولی کے مقابلے میں ذرا دبتا ہوا تھا۔ لیکن وہ تھی پُرکشش۔ پھر اس کی شوخ طبیعت سب کو متوجہ کرتی تھی۔

اچھی آپا کے حکم پر بیٹ بال کو زمین پر پٹخ کر میں دوڑتی ہوئی گئی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ آپا کا حکم ٹالنے کی مجال بھلا کس میں تھی۔

میرے پھوپھا ضلع جونپور کے شہر، جس کا نام مجھے عجیب دلچسپ قسم کا لگتا تھا۔ یعنی ''مچھلی شہر'' واہ! یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا۔۔۔؟

پھوپھا جان اس شہر کے حاکم اعلیٰ تھے۔ یہ سرکاری بنگلہ اور اس کے اردگرد پھیلے قطعات، باغ، باغیچے، سرکارِ برطانیہ کے کرّوفر کو ظاہر کرتے تھے۔ یہ مرعات جو وہ اپنے افسران کو دیتے تھے پھوپھا جان کو بھی حاصل تھیں۔ بنگلے کے پچھواڑے میں سبزی کی کیاریاں تھیں۔ سب سے پہلے ٹماٹروں کا کھیت تھا۔ میرا چھوٹا سا ذہن تو اسے کھیت ہی سمجھتا تھا۔ جس کے بے شمار سرسبز پودوں پر چھوٹے، بڑے، ہرے، سرخ، گول گول ٹماٹر لدے ہوئے تھے۔ میں نے ان گول مول لال لال ٹماٹروں سے اپنے فراک سے جھولی بھری اور جلدی سے کھیت سے باہر نکل آئی۔ ٹماٹر کے پودے میرے وجود کی سرسراہٹ سے ہلے اور ایک تیز مہک میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ یہ مہک مجھے سخت ناگوار گزری اور اب جبکہ ٹماٹر کے پودے میں اپنے گھر کی کیاری میں اپنے ہاتھ سے لگا رہی تھی تو اپنی ٹماٹروں کی خوشبو مجھے بہت پیچھے لے اڑی۔ مہ و سال کے فاصلے جیسے مٹ گئے تھے۔ میرے پھوپھا جان انگریزی دور میں مچھلی شہر کے حاکم اعلیٰ تھے۔ لیکن یہ وقت ابتلا کا تھا۔ 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک زوروں پر تھی۔ کہیں کہیں سے فسادات کی خبریں بھی مل رہی تھیں۔ مسلمان سہمے ہوئے تھے اور افسران پھونک پھونک کے قدم رکھتے تھے۔ ہندو دندناتے پھرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں سے وہ بھی خوفزدہ ضرور تھے۔ شام کو جو ماسٹر صاحب میرے پھوپھی زادوں کو ٹیوشن پڑھانے آتے تھے پھوپھی اماں نے مجھے بھی عارضی طور پر ان کی تحویل میں دے دیا تھا۔

ایک دن ہم بڑے سے ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ یکایک باہر سے شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کوئی جلوس گزر رہا تھا۔ ماسٹر صاحب ہمیں حساب کا سوال سمجھا رہے تھے۔ شور سن کر چپ ہوگئے۔ پھر اٹھے اور بولے۔

''میں دیکھتا ہوں''

جانے ماسٹر صاحب نے کیا دیکھا کہ پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ مسعودہ نے کہا۔

''پتہ ہے ماسٹر صاحب۔ ہندو ہیں اور وہ ہم سے ڈر کر بھاگے ہیں''۔

''مگر ان کے سر پر چوٹی تو ہے ہیں نہیں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے پگلی! وہ فیشن ایبل ہیں نا۔'' مسعودہ مجھ سے بڑی معلومات افزا باتیں کرتیں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں پھوپھی اماں ہمارے گھر آیا کرتیں تو جیسے دادا ابّا کے اس گھر میں سارے جہان کی رونقیں سمٹ آتیں۔ ہم بچوں کا مشغلہ کھیل کود کے علاوہ مردانہ حویلی میں لگے پھلوں کے پیڑوں سے کچے پکے پھل توڑ کے کھانا ہوتا تھا۔ ایسے ہی موقع پر امرود کی ٹہنی پہ بیٹھی کالے اور سفید پروں والی ایک خوبصورت سی چڑیا کو دیکھ کر مسعودہ بولیں۔

''کاش! میں چڑیا ہوتی۔''

میں نے حیرت و اشتیاق سے لفظ ''کاش'' دھرایا اور للک کے پوچھا۔

''مسعودہ بجیا، کاش کیا ہوتا ہے۔؟''

مسعودہ میری لاعلمی سے محظوظ ہو کر مسکرائیں۔ اور اُچک کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر جا بیٹھیں۔ بولیں۔

''کاش میں حاتم طائی ہوتی''

''اے لو! ابھی کاش کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ یہ کمبخت حاتم طائی بیچ میں کود پڑا۔ اور جب میں دوسری یا تیسری جماعت میں آئی اور کاش مجھ پر آشکار ہوا اور حاتم طائی سے بھی میں متعارف ہوئی تو وقت نے ہمارے درمیان فاصلے کی کنکریٹ سے بھی زیادہ مضبوط دیوار کھڑی کر دی تھی۔ برِّ اعظم ہندوستان دو حصّوں

میں بٹ چکا تھااوراس بڑی سرزمین کاایک حصّہ پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آچکا تھااور مسعودہ بدستور ہندوستان کی باشندہ تھیں اور میں پاکستان کی۔اب میرے معاشرتی رکھ رکھاؤ میں بھی تبدیلی آگئی تھی اور میں کرکٹ کھیلنا بھول چکی تھی اوراپنے محلے میں آباد کپور تھلے کے مہاجرین بچوں کے ساتھ ''پٹھو گرم'' کھیلتی تھی۔

ٹماٹر کے سارے پودے لگ چکے تھے۔میں یادوں کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آئی۔کیّنیوں کی جڑوں سے گوڑی کرتے ہوئے میرے مالی ناصر نے کہا۔

''بیگم صاحب!اب آپ ہاتھ دھولیں۔میں ٹماٹروں میں پانی لگاتا ہوں۔ناصر نے پائپ سے میرے ہاتھ دھلائے اور میں کرسی گھسیٹ کے وہیں لان میں بیٹھ گئی۔

شام کا سورج اپنا تمام جاہ وجلال ختم کر کے آسمان کے مغربی گوشے میں سمٹتا جارہا تھااور مرگلہ کی پہاڑیاں سبز لباس اتار کر سرمئی چادر میں اپنا حسین وجود چھپارہی تھیں۔موسم میں خنکی ہو چلی تھی اور ناصر ٹماٹر کے پودوں کو سینچ رہا تھا۔فضا میں آسودگی تھی اور میرے سامنے آلوچے کی لچکیلی شاخوں پر بیٹھی بہت سی چڑیاں شور مچارہی تھیں۔میں نے سوچا۔

''کاش!میں چڑیا ہوتی اور سرحد پار جانا میرے لئے رکاوٹ نہ بنتا۔اور مجھے پتہ نہیں ہماری حویلیوں میں اب کون رہتا ہوگا؟اولی اور جھرنا شاید بنگال چلی گئی ہونگی یا شاید ہندوستان میں ہی ہوں۔ان کی بھی شادیاں ہوچکی ہونگی اوران کے بچے بھی اب بڑے ہورہے ہونگے اوران کی یادداشت سے ہمارے نام مٹ چکے ہونگے اور میرا وہ پھوپھی زاد نومی کینیڈا میں آباد ہے اوراس نے ایک گوری سے شادی کرلی ہے اور وہ سانولی سلونی جھرنا کو بھول چکا ہے۔

میں شاید پھر یادوں کے جنگل میں بھٹکنے لگی ہوں۔میرا بیٹا یکدم میرے پاس آکھڑا ہوا ہے اور مجھے روح فرسا خبر سناتا ہے جو ابھی ابھی وہ ٹی وی پر سن کر آرہا ہے۔

''مسجد میں بم دھماکہ۔دس آدمی شہید۔اور بہت سے زخمی''

مسجد جیسی متبرک جگہ بھی۔؟میں کرسی پر بیٹھی منجمد سی ہوگئی ہوں۔

بم دھماکے،خودکش حملے۔یہ سب روز کا معمول بن گئے ہیں۔

یہاں نہ ہندو ہیں اور نہ کوئی اور قوم۔مارنے والے بھی مسلمان اور مرنے والے بھی مسلمان ہیں۔جانے پھر جھگڑا کیا ہے اور فساد کس بنا پر برپا ہے؟

آلوچے کے پیڑ پر چڑیاں بدستور چہکار میں مصروف ہیں۔شاید یہ شام کی عبادت میں حمد وثناء کررہی ہیں۔میں پھر سوچتی ہوں۔

''کاش!ہم پرندے ہوتے۔کوّے یا الّو ہوتے۔جن کے لئے سرحدوں کی پابندی ہے اور نہ مذہب وملّت کی۔ہم کچھ بھی ہوتے مگر انسان نہ ہوتے۔''اشرف'' کا لفظ ہمارے ساتھ وابستہ نہ ہوتا۔کاش۔۔۔!

شام کا دھندلکا دھیرے دھیرے زمین پر اترتا آرہا ہے۔اور آلوچے کے پیڑوں پر بہار ہے۔مگر میرا دل۔۔۔۔؟

بقیہ: **گھر**

کر وہ کیا کہے گا۔؟سیدھا کہے گا کہ ابّو جان آپ کے نیک جذبات کو دیکھتے ہوئے گھر کے کاغذات لینے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔لیکن کہیں اُسی وقت انہوں نے فون لگالیا تو....؟سارا کھیل خراب ہوجائے گا۔وہ پریشان تھا۔لیکن اسی ادھیڑ بن میں راستہ طے ہوگیا۔

شاہنواز کو دیکھتے ہی ستیہ کمار کے چہرے پر وقت نے صدیوں پر محیط زندگی کا غازہ مل دیا۔وہ سمجھ گئے کہ شاہنواز کیوں آیا ہے؟پہلے مُسکرائے۔پھر بولے''بیوقوف کو میں نے اتنا سمجھایا پر نہیں مانا۔صرف قُرآن لے کر چلتا بنا۔لیکن بھگوان پر مجھے وشواس تھا۔چلو اطہر میاں نہیں آئے،کوئی بات نہیں۔میرا پوتا تو آگیا۔''

شاہنواز کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔بغیر جھوٹ بولے بات بن گئی تھی۔لیکن یکا یک اُس کی خوشیوں میں فور فورٹی کا گہن اُس وقت لگ گیا جب ستیہ کمار نے جھک کر پلنگ کے نیچے سے اُس پرانے صندوق کو کھینچا۔زنجیر ٹوٹی ہوئی تھی۔قبضے کے ساتھ تالا ایک طرف جھول رہا تھا۔اندر نہ ہی کاغذات تھے اور نہ ہی پاس بک.....

ستیہ کمار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔اندر ایک بونڈر اُٹھنے ہی والا تھا.....روح کے پرخچے اُڑنے ہی والے تھے......کہ یکا یک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''دادا میں نے صندوق توڑنے کا گناہ کیا ہے۔چیک پر جعلی دستخط کر کے کچھ پیسے بھی نکال لئے ہیں۔لیکن بینک سے نکلتے ہی آپ کے آدرشوں نے میرے منفی خیالات کے پاؤں میں پُرانی صندوق کی وہی زنجیریں ڈال دی ہیں،جسے توڑ کے میں یہاں تک آیا تھا سر درد ٹھیک ہوگیا ہے۔کیوں کہ مجھ میں بھی آپ کا ہی خون دوڑ رہا ہے۔اب یہاں سے میں سیدھے اِسٹیشن جارہا ہوں کہ سب کچھ شاہنواز کو سونپ دوں۔تاکہ کبھی ہمارا'گھر'ہمیں آواز دے تو سامنے جانے میں شرمندگی نہ ہو۔''

اُس وقت ستیہ کمار خوشیوں سے پاگل ہوا ُٹھے تھے۔شاہنواز کو دیر تک گلے سے لگائے رکھے۔پھر بولے''تو جو لینے آیا ہے،اُسے دینے کے لئے رام کمار خود اِسٹیشن گیا ہے۔جابیٹا جا.....جلدی جا......گاڑی کا وقت ہورہا ہے۔

شاہنواز چلا گیا۔

ستیہ کمار نے اُس طاق پر جو اب خالی ہو چکا تھا۔وہاں پاکستان سے لائے ہوئے'گیتا'کو رکھ دیا۔

اب یہ گھر اُنہیں اپنا لگ رہا تھا۔

بے لگام

ڈاکٹر سید سعید نقوی
(نیویارک)

دن بھر کی مسافت طے کر کے جب تھکا ہوا سورج حدِ نظر سے پرے کہیں چھپ کر آرام کرتا ہے، تو اس مٹیالے رنگ کے وکٹورین مکان کا دن بھی تمام ہوتا ہے۔ شمالی فلوریڈا کی زمین کھیتی باڑی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ شمالی فلوریڈا ہی کیا، امریکہ کی مشرقی سرحد پر واقع بیشتر ریاستیں کھیتی باڑی کے لئے بہت ذرخیز ہیں۔ شمال مشرق میں واقع میساچیوسٹس، نیو یارک، ڈیلاویئر، نیو ہمپشائر وغیرہ تو سردیوں میں صرف برف اگا سکتی ہیں، لیکن ذرا جنوب کی طرف سفر کیجیے تو شمالی اور جنوبی کیرولائنا، جارجیا، ٹینیسی اور فلوریڈا ایسی ذرخیز زمینیں ہیں کہ مرزا نے اسی علاقے کو دیکھ کر کہا ہوگا کہ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی، بن گیا روئے آب پر کائی۔

جارج شمالی فلوریڈا کے اس مٹیالے وکٹورین میں کم از کم تین نسلوں سے رہ رہا تھا۔ آئر لینڈ میں 'آلو کا قحط' پڑا تو جارج کے پردادا نے پانی کے جہاز کا رخ کیا۔ سچ ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو نئی دنیائیں ملتی ہیں، قدرت تو نوازنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے، اک ذرا ہمتِ مرداں اور روایت کی زنجیریں توڑنے کی ضرورت ہے۔ آئر لینڈ کے دارالخلافے ڈبلن سے اٹھ کر جارج کے پردادا نے فلوریڈا میں قدم ٹکائے۔ یہاں قدم ایسے جمے کہ جو نحیف اجسام آئرش قحط سے بھاگے تھے، فلوریڈا کر خوب پھلے پھولے اور توانا ہوئے۔ نسل در نسل یہ مکان اور اسکے ساتھ کی زرعی اراضی منتقل ہوتی رہی۔ اب جارج کے پاس اسّی ایکڑ کی زمین تھی جس پر سال میں دو مختلف فصلیں تیار ہوتیں۔ گھر سے متصل ایک طویلہ تھا جس میں گھوڑے بندھے رہتے۔ اسکے علاوہ کئی سُور اور گائیں زمین کو کھاد فراہم کرتیں جبکہ جارج کو دودھ اور گوشت۔ زندگی سہل نہیں تھی کہ کھیتی باڑی جسمانی مشقت اور خون پسینے کا خراج مانگتی ہے، مگر زندگی یوں فراخ ضرور تھی کہ گھر میں پیسے کی فراوانی تھی۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ شام میں جب سورج ڈھلتا اور آسمان پر قسم قسم کے رنگ بکھر جاتے تو کہیں جا کر جارج کا دن بھی تمام ہوتا۔ آخر اس کا دن بھی تو صبح تڑکے پو پھٹنے سے پہلے شروع ہو جاتا تھا۔ چاہے معاملہ پانی کھولنے کا ہو یا دودھ دوہنے کا، کسان کا دن سورج کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ جون کی اس خوبصورت شام بھی آسمان پر بہت سے رنگ سازشیں کر رہے تھے۔ جیسے طے نہ کر پا رہے ہوں کہ سورج کو شکست دینے کے لئے کون سی آمیزش بہتر ہے۔ نیلگوں آسمان پر اب سرخ اور سبز کی بہار تھی۔ جارج نے ٹریکٹر کو گیراج میں بند کیا، گھر کے صدر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور باورچی خانے کی جانب بڑھ گیا، جہاں اس کی بیوی اور بیٹی لوسی رات کے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ جیسے جیسے لوسی لڑکپن کی حدوں کو پیچھے چھوڑ رہی تھی، جارج کا کام نسبتاً آسان ہو رہا تھا۔ اب گھوڑوں کی مالش، ان کو دوڑانا لوسی کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ورنہ بیچاری ماریہ تو شادی کے دو سال بعد ہی ایسے اعصابی بیماری کا شکار ہوئی تھی کہ جارج کا کام کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔

مٹیالے وکٹورین مکان کا دن کیا تمام ہوا، ملحقہ اصطبل میں جیسے دن طلوع ہو گیا۔ چھ گھوڑوں کے اصطبل میں چار گھوڑے بندھے تھے۔

'میں بالکل کسی نئے گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں'۔ نوجوان سفید گھوڑا ہنہنایا۔ شاندار جسم، بوٹی، بوٹی الگ دیکھ لو، ایال پر سنہرے بال، لمبی گھنیری دم، بلاشبہ گھوڑے پن کا ایک عمدہ نمونہ۔۔

'کسی گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں یا اس گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں' ایک سیاہ فام گھوڑے نے طنز سے سوال کیا۔

'کیا مطلب؟'

'مطلب یہ کہ اگر کوئی سفید گھوڑا آ رہا ہوتا تو کیا تمہیں پھر بھی اتنا ہی اعتراض ہوتا' سیاہ گھوڑا خاصہ جہاندیدہ تھا۔

'ٹھیک کہہ رہے ہو، سفید گھوڑا ہوتا تو یقیناً اس سے ہمارا ہی فائدہ ہوتا، لیکن میں اس دھاریدار مخلوق کے بالکل حق میں نہیں، نجانے کس سیارے کی برآمد ہے؟'

'دھاریدار گھوڑے کی آمد سے تو ہمارے تنوع میں اضافہ ہوگا۔ اس کے تجربات سے ہمیں شاید نئی چراگاہوں کا پتہ ملے دوسرا سفید گھوڑا نسبتاً نرم خو اور کھلے دل کا تھا۔ اس دوسرے سفید گھوڑے کو ہم سفید گھوڑا نمبر دو کہہ سکتے ہیں۔

'ہمارے پاس کافی چراگاہیں ہیں، میں اپنی چراگاہوں کو کسی دھاریدار مخلوق سے آلودہ نہیں کر سکتا۔ پھر ہماری اپنی نسل کی ملاوٹ کا اندیشہ ہے' سفید گھوڑے نے دزدیدہ نظروں سے گھوڑی کی جانب دیکھا، جو سب سے کونے میں بندھی، سر نیچا کئے چارہ پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

سیاہ گھوڑے نے ہنہنا کر گویا اپنی موجودگی کی یاددہانی کرائی۔

'ہم نے پہلے کیا کم قربانی دی ہے، ماحول پہلے ہی آلودہ ہو چکا ہے، اب اس دھاری دار مخلوق کے آنے سے یہ اصطبل رہنے کے قابل نہیں رہے گا' سفید گھوڑا گویا اسپِ سیاہ پر نظر جھکائے خود کلامی کر رہا تھا۔

'ارے بھئی ہم چار ہیں، اور یہاں چھ گھوڑوں کی گنجائش ہے۔ پھر تنگی کا کیا سوال ہے؟ سفید گھوڑے نمبر ۲ نے الجھ کر پوچھا۔

'تنگی صرف زمین یا علاقے کی نہیں ہوتی' اسپِ سیاہ نے معنی خیز گرہ لگائی۔

'میں اس دھاریدار مخلوق کو مار بھگاؤں گا۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ تم دونوں میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟' سفید گھوڑے نے لفظ دونوں استعمال کر کے گویا اسپ سیاہ کو تنہا کر دیا۔

'اس کو دھاری دار مخلوق کہنا بند کرو۔ وہ ایک گھوڑا ہے ہمارے جیسا، جس کے جسم پر دھاریاں ہیں۔ اس کی بھی ایال ہے، دُم ہے، دو کان ہیں، آنکھیں ہیں، سب اعضا ہمارے جیسے ہیں۔ مجھے تو اسکی دھاری دار جلد بہت جاذبِ نظر لگتی ہے' گھوڑی نے ذرا شرما کے کہا۔

'دیکھا، دیکھا میں کیا کہتا تھا' سفید گھوڑے کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

'لیکن یہ تو سوچو ہم خود کون سا اس زمین کی پیداوار ہیں۔ جارج کے پردادا کے ساتھ پانی کے جہاز پر سفید گھوڑوں کا ایک جوڑا نہ آتا، تو یہاں کونسے ہمارے اجداد بستے تھے' سفید گھوڑا نمبر دو مصالحت کی راہ نکال رہا تھا۔

'یہ زمین ہماری ہے، ہماری رہے گی۔ اسپ سیاہ کی وجہ سے پہلے ہی ہماری نسل میں ایک گرہ لگ چکی ہے، اب مزید آلودگی میری لاش پر سے گذر کر ہوگی' سفید گھوڑے کا غصہ کم ہونے کو تیار نہ تھا۔ معاملہ اس حد تک بگڑتے دیکھا تو باقی تینوں گھوڑوں نے دم سادھ لیا، کہ خاموشی اکثر بلائیں ٹالتی ہے۔ مگر ریت میں سر دینے سے طوفان گذر جاتے تو سب صحرا میں سر دفنائے کھڑے رہتے۔ زیادتی کے سامنے اجتماعی خاموشی، بدتر از گناہ است۔

صبح ہوئی تو ہمیشہ کی طرح لوسی نے اصطبل کا دروازہ کھولا۔۔ سب گھوڑوں کو ایسے ہیلو بولے جیسے ابھی یہ سب بول ہی پڑیں گے۔ محبت سے سب کی گردنوں کو تھپتھپایا۔ اتنے میں باہر سے ٹاپوں اور ایک گھوڑا گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لوسی نے باہر جا کر آنے والے گھوڑا گاڑی کے آگے جتے گھوڑے کی لگام تھام کر اسے تھپتھپایا۔ پھر خوشی خوشی گاڑی کے پیچھے بندھے دھاری دار گھوڑے کی رسی کھولی۔ اسے پیار سے تھپتھپایا۔ گھوڑے نے بھی اپنی ناک لوسی کے بازو سے رگڑ کر اسکی بو سے مانوسیت حاصل کی۔ ایک رحم دل انسان کی خوشبو تھی۔ دھاریدار گھوڑے نے نئے مالک کے آگے سر جھکا کر گویا وفاداری کی بیعت کی۔ لوسی اس کی رسی تھامے اصطبل کی جانب بڑھی۔ عموماً اصطبل لوسی کے داخلے پر گویا نیند سے بیدار ہو جاتا تھا۔ گھوڑوں کی کلیلیں سنائی پڑتیں، اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے، گھوڑے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔ لوسی کو سب سے زیادہ پیار گھوڑی سے تھا۔ ماتھے پر ایک سیاہ داغ چال میں ایک شاہانہ مستی، دوڑنے پر آئے تو باقی تینوں اسکی دھول چاٹتے رہ جائیں۔ دھاری دار گھوڑے کی لگام تھامے لوسی خوب رو سفید گھوڑے کے سامنے سے گذری تو وہ ہنہنا کر پچھلے قدموں پر کھڑا ہو گیا، دونوں اگلے کھر فضا میں معلق، قینچی کی طرح چلنے لگے۔ لوسی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اسکی تند خوئی اور بدمزاجی سے لوسی واقف تھی۔ لیکن نئے جانور کا یہ استقبال، ابتدا کچھ اچھی نہ تھی۔ باقی دونوں گھوڑے ایسے گردن ڈالے چارہ کھانے میں مصروف رہے گویا اصطبل میں موجود ہی نہ ہوں۔ حالانکہ ان کے دیدے اس دھاریدار گھوڑے پر اس وقت سے جمے ہوئے تھے جب لوسی اسے لے کر داخل ہوئی تھی۔ اب بھی مضحکہ خیز انداز میں منہ تو چارے کی بالٹی میں تھا مگر آنکھیں ماتھے پر دھری تھیں۔ جب ان دونوں نے بھی سرک کر جگہ نہ بنائی تو لوسی آگے بڑھ گئی۔ کونے میں کھڑی گھوڑی پہلے ہی ذرا سرک کر جگہ بنا چکی تھی۔ بالٹی سے منہ نکال کر ذرا سمٹ کے اصطبل کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ لوسی نے دھاری دار گھوڑے کی لگام وہیں زمین میں گڑے کھونٹے سے باندھ دی اور گھوڑی کے سامنے کی بالٹی اس کے آگے سرکا دی۔ مڑی تو اس کی نظر اصطبل کے کونے کی چھت پر پڑی۔ بارشوں نے ترچھی کھپریل کی چھت میں رسنے کی جگہ بنا لی تھی۔ کل رات کی بارش کا پانی اصطبل کی زمین پر ابھی تک جذب نہیں ہوا تھا۔ جارج سے کہوں گی چھت ٹھیک کروانے کا وقت آ گیا ہے۔ امریکہ میں یہ نئی طرزِ گفتگو ہے کہ اکثر اولاد باپ کو اس کے اصل نام سے پکارتی ہے۔ شاید یہ یگانگت و رفاقت کی کوئی نئی حد ہے، کہ درمیاں سے ہر لقب و رشتہ کا پردہ اٹھا دیا جائے۔ مشرق ابھی اس حد کو پار نہیں کر پایا۔ لوسی خوبصورت سفید گھوڑے کے پاس سے گذری تو اسکے چاروں پاؤں اب زمین پر آ چکے تھے، ہنہنا کر لوسی کی توجہ کا طالب ہوا تو لوسی نے مایوس نہیں کیا۔ بڑھ کر اسکی گردن میں جیسے لٹک سی گئی اور اسکی پیشانی چوم لی۔ سفید گھوڑے کے جسم میں شرارے سے بھر گئے، دُم کھڑی ہو کر پشت سے آ لگی۔ اس نے بھی محبت سے لوسی کے شانے میں اپنا منہ گھسیڑ دیا۔

آج کام زیادہ تھا، اور پھر باہر بارش ہوتی رہی۔ گھوڑوں کو اصطبل سے آزاد نہیں کیا گیا۔ رات بھر اصطبل میں اودھم مچا رہا جس کی آوازیں بارش کے شور میں دب گئیں۔ لوسی اپنے نئے دھاری دار گھوڑے پر سواری کے لئے بے چین تھی۔ اسے دن بھر بارش کا افسوس رہا کہ سارا دن ضائع ہو گیا۔ نئے کھلونوں کی خوشی تو عمر کے ہر حصے میں حرارت کا باعث بنتی ہے۔ کروٹیں بدلتی ہے۔ بارش اب دن برباد کر کے رات کے سناٹے میں شور مچا رہی تھی۔ اصطبل پر چھت تنی ہوئی تھی اس لئے لوسی کو اطمینان تھا کہ اس کے گھوڑے آرام سے ہوں گے۔ چھت کے ٹوٹے حصے کا خیال آیا تو افسوس ہوا کہ جارج سے آج ہی کیوں نہ کہہ دیا۔

صبح تک بادل چھٹ گئے۔ فلوریڈا کے در و بام پھر سنہری رنگ کی دھوپ میں نہا گئے۔ رات کی برسات سے سارا ماحول نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے برسات نے سارے موجوداتِ عالم کی پیاس بجھا کر انہیں تر و تازہ کر دیا۔۔ لوسی بھی موسم کی اس تراوٹ سے آزاد نہ تھی۔ چہرے پر تازگی، آنکھوں میں چمک، چال میں تجسس لئے اصطبل کا دروازہ کھولا تو غیر معمولی خاموشی پائی۔ دھاری دھار گھوڑا اسی طرح لگام تڑا کر ٹوٹی چھت کے نیچے کھڑا تھا۔ سرخ ناک اور بھیگی ایال سے ظاہر تھا کہ ساری رات یہیں کھڑا بھیگتا رہا ہے۔

'میں نے کل ہی جارج سے کیوں نہ کہہ دیا' لوسی نے اپنے آپ کو کوسا۔ لپک کر کونے سے ایک چادر اٹھائی اور محبت سے دھاری دار گھوڑے کا بدن خشک کرنے لگی۔ اس محنت سے اس نے اس کے جسم کو رگڑا اور پونچھا۔ لوسی

کے ماتھے پر صبح کی سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔اس رگڑ سے دھاری دار گھوڑے کی کھال چمک کر عجیب شان دار ہو گئی۔ جان کے سارے مسام کھل گئے۔اس نے گردن موڑ کر لوسی کو دیکھا تو آنکھیں جذبۂ تشکر سے لبریز تھیں۔اس انہاک میں لوسی کو خوبصورت سفید گھوڑے کی آمد کا اندازہ بھی نہیں ہوا، جو نہ جانے کیسے اپنے کھونٹے سے رسی کھول کر اس کے بازو آ کھڑا ہوا۔لوسی نے ایک جسم کی گرمی اپنے نزدیک محسوس کی تو مڑ کر سفید گھوڑے کو دیکھا، مگر اپنی مصروفیت میں سوائے ایک تھپتھپی کے توجہ نہ دے سکی۔دھاری دھار گھوڑا تمام رات بارش کے نیچے کیوں کھڑا رہا، اس جگہ سے ہٹ کیوں نہ گیا۔کہیں بیمار نہ پڑ گیا ہو، پھر یہ سفید گھوڑا کیسے کھل گیا۔لوسی کے ذہن میں ہزاروں سوال گھوم رہے تھے۔

لوسی نے آج بھی دھاری دار گھوڑے پر سواری کا ارادہ ملتوی کر دیا۔' اسے آرام کی ضرورت ہے' لوسی نے سوچا۔اس نے سب گھوڑوں کو باہر چراہگاہ میں چھوڑ دیا اور اپنی سواری کے لئے اسپ سیاہ کا انتخاب کیا۔گھوڑی کی دلکی چال دھاری دار گھوڑے سے قدم ملا رہی تھی، یہ جلد ہی سرپٹ ٹاپوں میں بدل گئیں۔ اس جوڑی کے پیچھے دونوں سفید فام گھوڑے بھی دوڑ پڑے۔بظاہر نئے دھاری دار گھوڑے کو اپنے قبیل میں جگہ مل گئی تھی۔لوسی نے اطمینان کا سانس لیا۔

گھوڑے دوڑتے ہوئے میلوں نکل گئے۔دور سے دیکھیں تو لگتا تھا ایک عجیب مسابقت اور رفاقت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔دھاریدار گھوڑا اور گھوڑی آگے دوڑے جا رہے تھے۔صاف ظاہر تھا کہ دھاری دار گھوڑا ان میں سب سے تیز رفتار تھا۔بےخودی میں آگے بڑھ جاتا تو باقی جانور کوشش کے باوجود برابری نہ کر پاتے۔خود ہی اپنی رفتار آہستہ کر لیتا کہ گھوڑی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا لے۔خوبصورت سفید گھوڑے کی شریانوں میں حسد اور غصے کا آمیزہ اسکی رفتار کو اور ہوا دے رہا تھا۔وہ موقع کا منتظر رہا۔اگلے موڑ پر داہنے جانب کھائی تھی۔اگر میں اچانک بڑھ کر راستہ کاٹ دوں تو یہ دھاری دار اپنی رو میں مڑ نہیں سکے گا۔نیا جانور علاقے کے جغرافیے سے ناواقف ہے۔ناواقفیت انجانے خطرات کو جنم دیتی ہے۔خوبصورت سفید گھوڑا پوری طرح حسد کے شیطانی نرغے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا۔موڑ اب صاف سامنے نظر آ رہا تھا، اس نے پوری کوشش کر کے رفتار بڑھائی اور دھاری دار کو جالیا۔دھاری دار نے دائیں جانب کھائی دیکھی تو بائیں جانب کٹنے کی کوشش کی مگر اچانک ایک خوبصورت سفید جسم حائل تھا۔دھاری دار کی امید کے برخلاف وہ اسے جگہ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔رات کو اصطبل کی مار دھاڑ اچانک دھاری دار کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔اسے موت سامنے نظر آنے لگی۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب حسد کا پہاڑ۔اتنا وقت نہیں تھا کہ دھاری دار اپنی رفتار روک سکتا۔اچانک پیچھے سے گھوڑی نے اپنا سر سفید گھوڑے کے پیٹ پر ایسا مارا کہ وہ گر پڑا اور دھاری دار کو بچاؤ کا موقع مل گیا۔گھوڑے اصطبل میں واپس آئے تو ماحول بدل چکا تھا۔وفاداریاں اور رفاقتیں بدل چکی تھیں۔لوسی اپنی گھڑسواری سے واپس آئی تو سب گھوڑے واپس آ کر اصطبل کے باہر گھاس چر رہے تھے۔اس نے سب کو باری باری ان کے کھونٹوں سے باندھا۔چھت پر نظر کی تو جارج چھت کا پھٹا حصہ رفو کر چکا تھا۔لوسی نے اطمینان کا سانس لیا۔اصطبل سے باہر جانے سے پہلے خاص طور پر دھاری دار جانور کے پاس گئی، اسکی پیٹھ تھپتھپائی۔لگتا تھا دھاری دار گھوڑا بارش میں بھیگنے کے باوجود نزلے سے بچ گیا تھا۔کل ضرور اس پر سواری کروں گی' لوسی نے سوچا۔ویسے تو سفید خوبصورت گھوڑے کی باری تھی لیکن وہ ایک دن انتظار کر سکتا ہے۔یہ نیا جانور ہے۔اب ہر گھوڑے کی چوتھے کی بجائے پانچویں دن باری آئے گی۔

اس رات گو آسمان صاف تھا لیکن اصطبل میں شکوک کے بادل چھائے ہوئے تھے۔کیونکہ عزائم واضح ہو چکے تھے لہذا اچانک اور غیر متوقع اقدام کا وقت جا چکا تھا۔اس رات اصطبل میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔روز کی طرح لوسی اٹھی، ناشتے سے فارغ ہو کر اصطبل کا رخ کیا۔خوبصورت سفید گھوڑا آج اسکی باری تھی۔اسے لوسی کی رفاقت ایک عجیب سرخوشی میں مبتلا کر دیتی۔اس کا بس چلتا تو لوسی کا بوجھ پشت پر لادے چلتا ہی رہتا چلتا ہی رہتا۔آنکھ، کان، جسم کی ہر پور لوسی کے اشارے کی منتظر رہتی۔لگام کھینچنے، ایڑ لگانے یا چابک استعمال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔گھوڑا جیسے اپنے سوار کی ہر خواہش بھانپ لیتا تھا۔گھٹنوں تک چمڑے کے جوتے پہنے، جینز کے پائنچے لوسی نے جوتے کے اندر اڑس لئے تھے۔قمیض پتلون کے اندر کر کے، ایک چوڑی بکل والی بیلٹ۔اسکے سنہری بال ایک پونی ٹیل کی صورت میں پیچھے بندھے تھے، اور سر پر ایک کالی ٹوپی الٹی اوڑھ رکھی تھی۔لوسی اصطبل میں داخل ہوئی تو سفید گھوڑے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔لوسی اس کے قریب آئی تو اس نے محبت سے اپنا منہ لوسی کے شانے میں گڑ دیا۔لوسی اسکی گردن تھپک کر دھاری دار گھوڑے کی طرف بڑھ گئی۔پلٹ کر دیکھتی تو شاید پہلی بار کسی گھوڑے کی آنکھ نم دیکھ لیتی۔لوسی نے اپنی زین دھاری دار گھوڑے پر کسی، باقی گھوڑوں کو آزاد کر کے اصطبل سے باہر کیا اور خود دھاری دار گھوڑے پر سوار دلکی چال سے اصطبل سے باہر آئی۔سیاہ فام گھوڑا اور سفید گھوڑا نمبر دو صبح کی تازہ ہوا میں منہ اٹھائے دم بھر میں میلوں کا فاصلہ طے کر کے نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ دھاری دار گھوڑا اپنے مالک کو اپنی رفتار اور طاقت سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔جیسے بچہ کوئی نئی حکمت، نئی مہارت سیکھ کر ماں باپ کو دکھانے کے لئے بے چین رہتا ہے۔لوسی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جانور اسکے دوسرے گھوڑوں سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر جیب میں اڑس لی اور اسکے سنہری بال ہوا میں لہرانے لگے۔منظر، پھول، سبزہ تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔تازہ ہوا اور رفتار نے لوسی کو بہت مزہ دیا۔اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ایک موڑ پر پیچھے نگاہ کی تو اسے لگا جیسے خوبصورت سفید گھوڑا ابھی پیچھے بھاگا چلا آ رہا ہو، گو صاف ظاہر تھا کہ اسے دھاری دار کے برابر آنے میں دشواری ہو رہی تھی۔غیر ارادی طور پر لوسی نے اپنی ایڑھیاں دھاری دار کے پیٹ میں گڑو دیں، گویا کسی مقابلے میں حصہ لے رہی ہو۔گھوڑا اپنے سوار کا اشارہ بھانپ کر اور تیز دوڑنے لگا۔گھوڑی بھی

باقی صفحہ ۷۹ پر ملاحظہ کیجیے

''صفاتِ نو بہ نو''

سید مشکور حسین یادؔ

(لاہور)

حقائق کو سمجھنے کے لئے ہم خواب گنتے ہیں
نتائج کے عقب میں پیکراں اسباب گنتے ہیں

صفاتِ نو بہ نو سے گونجتی رہتی ہے ذات اُس کی
جبھی تو ہم بشر کے ہر گھڑی القاب گنتے ہیں

ہمیشہ رہتے ہیں ضو بار اعداد وشمار اپنے
کہ ہم تو جو بھی گنتے ہیں دُرِ نایاب گنتے ہیں

ذرا دیکھیں تو کیا کون و مکاں میں ہے مقام اپنا
عماراتِ جہاں کے منبر و محراب گنتے ہیں

بدن برق آشنا ہوتے تو ہونگے ایسی مشقوں سے
جو گنتی پر لگے ہیں اُن کے ہم اعصاب گنتے ہیں

ہماری دشمنی بھی دوستی کی ایک صورت ہے
شمار اعدا کا کیجیے آپ' ہم احباب گنتے ہیں

ہمارے ہر عمل میں دخل فرما ہیں وہ یادؔ ایسے
بجا لاتے ہیں ہم آداب وہ آداب گنتے ہیں

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

سَر میں سَودا آنکھ میں آنسو اور لبوں پر تالے
اِس دُنیا میں کتنے ہیں اس حال میں رہنے والے

شہر کی گلیوں میں جا نکلے جب تیرا دیوانہ
پتّھر ہاتھ میں لے لیتے ہیں دیکھ کے لڑکے بالے

اِک دن اپنے ہدیۂ جاں کو لے کر جاتا ہوگا
کس کی خاطر ہم نے یہ ارمان دلوں میں پالے

تُم اِن کی پرواز کا یہ انداز نہ سمجھو شاید
فرش سے اُٹھ کر عرش کے پائے چھو لیتے ہیں نالے

پھولوں سے گذرتے تھے کبھی جو نرم صبا کی صورت
خارِ مغیلاں ڈھونڈ رہے ہیں اُن پاؤں کے چھالے

خوش ہوں اپنے دشتِ جنوں میں آئیں نہ وہ سمجھانے
شہرِ خرد والوں کو کوئی ٹال سکے تو ٹالے

رُوح کا پنچھی اُڑ جاتا ہے موت کی دستک سُن کر
مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں سب رشتوں کے رکھوالے

خالق سے مخلوق کا رشتہ لاکھوں جوڑنے آئے
لیکن اِک صحرا کے نبیؐ کے تھے انداز نرالے

ہے محمودؔ ازل سے اپنا شیوہ حُسن پرستی
اِس دنیا سے کہہ دو جا کر ہم پہ نہ ڈورے ڈالے

منظرایوبی
(کراچی)

دھوم ہے فصلِ سنگ آنے کی
کیجیے فکر گھر بچانے کی

دل کو خواہش ہے تیر کھانے کی
خاک کو کیمیا بنانے کی

خلق بھوکی ہے اور پڑی ہے اُنھیں
جشنِ آسودگی منانے کی

مارا جائے گا ایک دن تو بھی
کوششیں کر نہ سر اٹھانے کی

ہم نے بھی سیکھ لی اداکاری
دوست دشمن کو آزمانے کی

فتح پانی ہے گر رقیبوں پر
چال چلئے نئے زمانے کی

ہم جو دھرتی کا بوجھ ہیں تو ہمیں
کیا ضرورت ہے گھر بنانے کی

آپ بھی کیجیے ہڑپ قرضے
ہے یہی ریت جب زمانے کی

○

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

ہم سے مل لو کہ ہیں اب ساعت رخصت والے
یوں بھی دنیا کے ہیں آثار قیامت والے

زخم دیتے ہیں تو سہلانے بھی آجاتے ہیں
اُن سے سیکھے کوئی انداز مروّت والے

ہر قدم پر جو نگاہوں کا سہارا بنتے
لوگ ملتے ہیں کہاں ایسی محبت والے

دیکھ کر جن کو بہت جینے کو جی چاہا تھا
ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ چاندسی صورت والے

اب وہی پہلوئے مسند میں چہکتے دیکھے
کل تلک جن کے روّیے تھے شکایت والے

قصرِ شاہی نے مگر ساتھ دیا ہے کس کا
شان والے بھی گئے، ساتھ ہی شوکت والے

جیسے آئے تھے تہی دست گئے بھی ویسے
کیسے نادم ہوئے پھر دنیا کی چاہت والے

آؤ اور دامنِ دل حسبِ تمنا بھر لو
ہم سے پاؤ گے نہ پھر درد کی دولت والے

گھومنا باغ میں، خاروں سے الجھنا ہر سو
اس کے انداز تو سب لگتے ہیں راحت والے

سعید قیس
(بحرین)

لبوں پہ زخم مگر شوقِ گفتگو رکھنا
جو ٹوٹ جائے دلوں میں وہ آرزو رکھنا

نہ جانے کب کوئی کس راستے سے آ جائے
دیئے جلا کے دریچے میں چار سُو رکھنا

کبھی کبھی تو سفر میں عجیب لگتا ہے
کسی درخت سے سائے کی آرزو رکھنا

کوئی مجھے مری حالت سے بے خبر کر دے
بڑا عذاب ہے ہر شے کی جستجو رکھنا

میں اپنے خون کی لالی سے سرخرو ہوں قیسؔ
مرے مزاج میں شامل ہے رنگ و بُو رکھنا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

نہیں کہ شہر کے اندر کا خواب لے جائے
ہمیں تو دور کہیں انقلاب لے جائے

اٹھا کے طاق میں جو ''درکنار'' رکھی ہے
وہ شخص آ کے مری یہ کتاب لے جائے

تمہارا عشق مجھے ساتھ لے خرابے تک
خرابِ جاں کو یہ خانہ خراب لے جائے

ہمارے دل کی تمنا یہی ہے چھلنی میں
تمہارے نینوں سے بھر کر شراب لے جائے

خزاں تو بھیجتی رہتی ہے برگِ خشک ہمیں
بہار آن کے خط کا جواب لے جائے

ہوا تو چومنے آتی ہے پر نہ ایسا ہو
تمہارے گال کے سارے گلاب لے جائے

دیارِ غیر کو ثاقبؔ چلے تو مشکل ہے
گرہ میں باندھ کے گھر کے عذاب لے جائے

○

غلام مرتضیٰ راہی

(فتح پور، بھارت)

تنگ اک تو بدن پر ترے پُوشاک بہت ہے
پھر یہ کہ گریبان ترا چاک بہت ہے

چھا جانے سے رہنے کا نہیں کوئی خلا بھی
سب کے لیے اک مشت مری خاک بہت ہے

چھت لیکے مجھے بیٹھ بھی سکتی ہے کسی دن
مَیں جس کی اماں میں ہوں وہ سفّاک بہت ہے

مدّت سے ڈوبتے ہوئے میں دیکھ رہا ہوں
دریا کے لیے ایک ہی تیراک بہت ہے

دیکھیں گے تماشائی جو قسمت میں ہوا تو
جو کھیل میں کھیلوں گا خطرناک بہت ہے

اکثر کسی ذی فہم سے مل کر ہوا محسوس
تھوڑا جو مجھے ہے وہی ادراک بہت ہے

نادانیوں پر اُس کی ہنسی آتی ہے مجھ کو
بنتا وہ مرے سامنے چالاک بہت ہے

❍

غالب عرفان

(کراچی)

مشاہدات کا ہر اعتبار لے کے چلی
زمیں جو گردشِ لیل ونہار لے کے چلی

مزاجِ آدم خاکی بدل کے رکھ ڈالا
ہوا جب اپنے سبھی اختیار لے کے چلی

عجیب مخمصے میں گھر کے اپنی آگاہی
کبھی غرور کبھی انکسار لے کے چلی

کہیں جو ٹوٹ کے بکھرے وجود کے حصّے
تو زندگی انہیں ترتیب وار لے کے چلی

کہیں پہ فکر ہی اوہام کے اثر میں رہی
کہیں دلیل ہمیں سوئے دار لے کے چلی

رُکی تو رُک گئیں احساس کی سبھی لہریں
ہماری سانس جو لمسِ بہار لے کے چلی

ٹھہر گیا جہاں موت کا فرشتہ وہیں
حیات جسموں کو دیوانہ وار لے کے چلی

اُسی فضا نے بکھیری ہے خوشبوئے عرفاںؔ
خود آگہی جسے سر پر سوار لے کے چلی

❍

پی۔پی۔سریواستورِندؔ

(نوئڈا ،بھارت)

نشاطِ درد کے موسم میں گرمی کم ہے
فضا کے برگ شفق پر بھی تازگی کم ہے

سراب بن کے خلاؤں میں گم نظارۂ سمت
مجھے لگا کہ فضاؤں میں روشنی کم ہے

عجیب لوگ ہیں کانٹوں پہ پھول رکھتے ہیں
یہ جانتے ہیں ان میں مقدّری کم ہے

میں اپنے آپ میں بکھرا ہوا ہوں مدّت سے
اگر میں خود کو سمیٹوں تو زندگی کم ہے

نہ کوئی خواب نہ یادوں کا بیکراں سا ہجوم
اداس رات کے خیمے میں دلکشی کم ہے

کھلی چھتوں پہ دپٹے ہوا میں اڑتے نہیں
تمہارے شہر میں کیا آسمان بھی کم ہے

کہاں سے لاؤ گے اے رندؔ معتبر مضمون
غزل میں جبکہ روائت کی چاشنی کم ہے

○

خیال آفاقی

(کراچی)

شاہوں کی طرح روز نکلتا ہے آفتاب
پھر یہ بھی دیکھ! کس طرح ڈھلتا ہے آفتاب

مغرب سے غرب تک کے سفر میں ہزار بار
گر گر کے ہر قدم پر سنبھلتا ہے آفتاب

اتنا ہی تشنہ لب ہے اگر سوختہ مزاج
کیوں بہتے پانیوں پہ مچلتا ہے آفتاب

یہ دھوپ ہے کہ خون پسینہ ہے وقت کا
جو لمحہ لمحہ روز پگھلتا ہے آفتاب

اک آنکھ بھی تو اس سے ملاتی نہیں نظر
پھر کیوں کسی کو دیکھ کے جلتا ہے آفتاب

ڈھلتی ہے صد ہزار شبوں کی مسافتیں
تب ایک دن کے وقت نکلتا ہے آفتاب

جس کو شبِ وصال کا رہتا ہے انتظار
اس کو ہر ایک حال میں کھلتا ہے آفتاب

ہے تاب ناک اس سے زمیں اس لئے خیالؔ
اپنی جبیں کو خاک پہ ملتا ہے آفتاب

○

شاہین فصیح ربانی
(ابوظہبی)

طلوعِ مہر بھی ہو، دہر میں سحر بھی نہ ہو
فروغِ تیرگی دنیا میں اس قدر بھی نہ ہو

ملی ہے زیست تو پھر غم بھی جھیلنے ہوں گے
یہ کیسے ہو کہ سمندر بھی ہو بھنور بھی نہ ہو

اگر ہے رشتۂ الفت تو کیسے ممکن ہے
جو حال دل کا اِدھر ہے، وہی اُدھر بھی نہ ہو

ہوائیں شور مچائیں، بگولے رقص کریں
مثالِ دشت جہاں میں کسی کا گھر بھی نہ ہو

بجھا دیئے ہیں دیئے اس نے بے قصور کئی
''ہوائے تند کو شاید کبھی خبر بھی نہ ہو''

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میرا ہمراہی
سفر بھی ساتھ کرے اور ہمسفر بھی نہ ہو

روا میانہ روی ہے تو زندگی بھی فصیح
طویل تر بھی نہ ہو اور مختصر بھی نہ ہو

○

رب نواز مائل
(کوئٹہ)

کبھی کم نہ ہستی کو سمجھا کریں ہم
جو چاہیں کہ سب اُس سے پایا کریں ہم

طلب کیا نہ دے گر یقیں اُس پہ ہو کچھ
پہ جب جھوٹوں بھی یوں نہ سوچا کریں ہم

سَوَوں حُسن بھی پائیں گے پھر اُسی سے
کہ جس پھول کو پاس پایا کریں ہم

جو آزادگی تھوڑی ہی کب یہاں ہے؟
تو کس خواب کو کل کا چہرا کریں ہم

کہ جینا ہے آساں نہ مرنا ہے آساں
یہی جیسے صدیوں سے دیکھا کریں ہم

○

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

زندگی لمحۂ گزراں ہے ذرا دیکھ کے چل
اتنا بھی سرحدِ ادراک سے باہر نہ نکل!

اس کے جانے پہ ہوئی زیست تھکن سے بوجھل
درد کا کون سا پہلو تھا نظر سے اوجھل

رحم سے تکتا ہے کیا میرے گھروندے کی طرف
یہ ہوائیں تو اڑائیں گی کئی راج محل

ذاتِ انسانی ہے یوں گم کہ کبھی تھی ہی نہیں
ایسا بیٹھا ہے زمانے پہ مشینوں کا عمل

کتنی برساتوں میں کھل جائے گا دل کا موسم
مجھ سے بن برسے ہی کیا پوچھ رہا ہے بادل

ہم اجالوں کے پجاری ہیں، اندھیروں سے نفور
ہم کو ہر دور میں دیکھو گے اٹھائے مشعل

جب کبھی خونِ صداقت کہیں ہوگا شاؔہد
روحِ انصاف میں لازم ہے پڑے گی ہلچل

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

ہو گئی ہے زندگانی اپنی طوفانی بہت
دہشت و وحشت کی ہر سو حشر سامانی بہت

بڑھ رہی ہے محفلِ یاراں میں ویرانی بہت
کیوں نہ ہو آنکھوں میں اب اشکوں کی طغیانی بہت

جانے والے جارہے ہیں سب قطار اندر قطار
صبر کر لو دوستو دنیا ہے یہ فانی بہت

صبح دم یارو پڑھو اخبار دل کو تھام کر
سُرخیوں میں ہے نمایاں خوں کی ارزانی بہت

حُسن والوں سے بھی اب تو ہوگئے مایوس ہم
حُسن محرومِ نزاکت جب ہو عُریانی بہت

جس ستم گر نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا
یاد آتا ہے ہمیں وہ ''دشمنِ جانی'' بہت

ایک بھی شاعر نہیں ایسا کہ دل میں گھر کرے
ہاں ملیں گے غالبؔ و اقبالؔ کے ثانی بہت

○

ڈاکٹر مسرور احمد زئی
(حیدرآباد، سندھ)

سامنا تھا مجھے خدائی کا
ورنہ کیا ہوتا پارسائی کا

داغِ فرقت سوال کرتے ہیں
حسنِ بینش سے آشنائی کا

تیری دیدہ وری کا پیمانہ
بن گیا راز کم نگاہی کا

اشک برسے مرے قلم سے جو
وہ خلاصہ ہے نارسائی کا

سب جسے شاہکار کہتے ہیں
قصّہ ہے تیری بے وفائی کا

زخم ملتے رہے مجھے لیکن
شوق ہے تیری ہم نوائی کا

قتل کر بھی دیا مہارت سے
پارسائی نے پارسا ئی کا

حسنِ نظّارگی کا عالم ہے
دار پر میری رونمائی کا

آج مسرورؔ نے قلم سے ایک
بت تراشہ ہے بے وفائی کا

○

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں، کشمیر)

باہر کی مشکلات کو فلحال ٹالئے
پہلے جو گھر میں سانپ ہے اُسکو نکالئے

تنہائیوں سے گھر کو بچانے کے نا م پر
عفریت کون کونسے ہم نے بُلالئے

چُن چُن کے دوستوں نے دیئے زخم جو ہمیں
گہنے سمجھ کے ہم نے بد ن پر سجا لئے

ہم نے رگوں میں زہر اُترنے ہی کیوں دیا
دُنیا جہاں کے سانپ گلے کیوں لگا لئے

اِک پیٹھ موڑنا تھا ہمارا بس اُس کے بعد
سب دوستوں نے ہاتھوں میں پتھّر اُٹھالئے

طُوفان نے ڈُبو ہی دیا تھا ہمیں مگر
موجوں کے راز ہم نے سمندر میں پالئے

یُوں کب تلک دوراہے پہ رُکیئے گا اے جناب
چُپ چاپ ایک سکّہ ہوا میں اُچھالئے

بیتابؔ شہر میں تھی جو رونق نہیں رہی
یاروں نے جب سے دشت میں خیمے لگا لئے

○

پیکدان

مراق مرزا
(ممبئی' بھارت)

لوکل بس جوہو چوپاٹی کے اسٹاپ پرآ کر رکی تو مسافر تیز رفتاری سے بس کے اگلے دروازے سے اترنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھی سے زیادہ بس خالی ہوگئی۔ جوہو بیچ ممبئی کے چند مشہور تفریح گاہوں میں سے ایک ہے جہاں ہر روز ہزاروں کی تعداد میں لوگ سیر وتفریح کے لئے آتے ہیں اور اتوار کے دن سیاحوں کی اس تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ گہرے نیلے رنگ کے ٹرینڈی جینس اور سفید شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ لگائے، کندھے پر کیمرہ لٹکائے راحت بھی اسی بس سے اترا تھا۔ اپنے اسٹائل اور appearance کی روشنی میں وہ ایک اسمارٹ سیاح لگ رہا تھا۔ جوہو چوپاٹی تک آنے والے تمام مسافر جب اتر گئے تو کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی اور بس فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

راحت نے ایک نظر بس اسٹاپ کے آس پاس لگے فلموں کے بڑے بڑے hoardings کو دیکھا پھر اس کے قدم دھیرے دھیرے بحر عرب کے ساحل کی طرف بڑھنے لگے۔ سمندر میں ہائی ٹائڈ کے باعث ڈائنا سور کی مانند اچھلتی موجیں سڑک سے ہی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں عنقریب غروب ہو جانے کا کرب لئے شام کا سورج دھیمی رفتار میں اپنی منزل کی سمت گامزن تھا۔ راحت جب ساحل کے قریب پہنچا تو معاً اس کی نگاہ ایک دوشیزہ پر ٹھہر گئی جو چند ہی قدموں کے فاصلے پر واقع ایک بھیل پوری کے اسٹال کے پاس کھڑی پانی پوری کھا رہی تھی۔ اس دوشیزہ کو دیکھتے ہی راحت کا چہرہ کچھ اس طرح کِھل اٹھا جیسے وہ اسے پہلے سے جانتا ہو۔

درحقیقت راحت اس دوشیزہ سے مل چکا تھا جسے وہ سواتی کے نام سے جانتا تھا اور اپنے بہت سے خواب اس کی ذات سے منسوب کر چکا تھا۔ کوئی ایک ہفتہ قبل وہ اس سے ٹرین میں ٹکرائی تھی جب وہ بذریعے کلکتہ میل کلکتہ سے ممبئی آ رہا تھا۔ اتفاق سے دونوں کی نشستیں آمنے سامنے تھیں۔ وہ بھی کلکتہ سے ممبئی آ رہی تھی۔ دورانِ سفر دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے پھر پُر تکلف بات چیت فرینڈلی گفتگو میں تبدیل ہوگئی۔ ڈنر دونوں نے ساتھ ہی لیا تھا جس کے پیسے راحت نے دئے تھے۔ کبھی کبھی فکری مماثلت کے سبب دو اجنبی ایک ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے ہیں مانو انکے درمیان کوئی حیاتِ گزشتہ کا رشتہ ہو۔ راحت اور سواتی کا mental wavelenght بھی ایک دوسرے سے بہت حد تک ہم آہنگ تھا جس کے باعث دونوں گہرے دوست کی طرح behave کرنے لگے تھے۔ پھر رات کا دوسرا پہر گزرا تو زیادہ تر مسافر اپنی اپنی seats اور berths پر محوِ خواب ہو گئے اور ماحول انسانی آوازوں کے Pollution سے پاک ہوگیا۔ ٹرین سنّاٹے کی دیواروں کو گراتی ہوئی طوفانی رفتار میں دوڑ رہی تھی۔ گھنٹوں کی گفتگو کے بعد دونوں قدرے تھک سے گئے تھے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر دونوں اپنے اپنے برتھ پر لیٹ گئے اور نیند کی دیوی نے انھیں دھیرے دھیرے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔

صبح کے آٹھ بجے ٹرین چھترپتی شواجی ٹرمینس پر آ کر رکی تو راحت کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پلٹ کر سامنے والے برتھ کی طرف دیکھا جو کہ خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر قدرے حیرانی رینگنے لگی۔ پھر یہ سوچتے ہوئے کہ ممکن ہے سواتی فریش ہونے کے لئے واش روم گئی ہو، اس نے اپنا سامان اُپری برتھ سے اتار کر نیچے رکھا مگر دوسرے ہی پل اسے احساس ہوا کہ سواتی کا سوٹ کیس اور ایئر بیگ بھی اس کے برتھ پر موجود نہیں تھا چنانچہ اب اس کے ذہن نے یہ تسلیم کر لیا کہ سواتی اسے بتائے بغیر جا چکی تھی اور یہ بات اس کے لئے بے حد پریشان کن تھی۔ دورانِ سفر وہ نہ صرف اس کے پرکشش خدوخال، بھرپور جسم اور قابلِ توجہ حسن بلکہ طرزِ گفتار اور فکر وخیال سے بھی متاثر ہوا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں سواتی کے تعلق سے اس نے بہت سے ایسے خواب سجا لئے تھے جو دانشمندانہ نہ تھے مگر انسان دل کے آگے مجبور ہوتا ہے۔

''ہائی! اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو تم سواتی ہو؟!''
راحت نے قریب جا کر اس سے سوال کیا تو وہ نہ گھبرائی نہ اس کے چہرے کا رنگ بولا بلکہ استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا۔

''یو آر رائٹ۔۔۔ میں سواتی ہی ہوں'' یہ کہہ کہ اس نے راحت سے کچھ Snacks یا کولڈ ڈرنک لینے کے لئے اصرار کیا مگر راحت نے Casually کچھ لینے سے انکار کرتے ہوئے اپنی بات شروع کر دی۔

''ٹرین میں تمہارا ملنا۔۔۔ ایک ہی ملاقات میں دوست بن جانا۔ پھر مجھے بتائے بغیر چلے آنا۔۔۔ ان باتوں سے جڑے کئی سوال مجھے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ انکا جواب تو تم ہی دے سکتی ہو۔''

''آؤ بیچ پر چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' سواتی بے حد شائستہ انداز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولی۔ پھر چند یارڈ کی مسافت طے کر کے دونوں بیچ پر ایسی جگہ آ گئے جہاں بھیڑ کم تھی تا ہم تھوڑے ہی فاصلے پر ہوٹل سی ویو کی دیوار سے لگ کر قریب دس بارہ عاشق جوڑے اپنے گردونواح کی دنیا سے بے نیاز بوس وکنار میں مصروف مغربی تہذیب کے روشن نمائندے بنے ہوئے تھے۔ دور اُفق کی گود میں سورج آج کے دن کا سفر تمام کرنے کے درپہ تھا۔ شام کی مدھم دھوپ

سے ساحل کا ماحول نہایت پرکیف اور رومانی نظر آ رہا تھا۔

''تمہارے اندر جو احساس جنم لے چکا تھا اُسے میں تمہاری آنکھوں میں پڑھ چکی تھی۔ اور تمہیں کوئی جذباتی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی تھی اس لئے کچھ بتائے بغیر تمہیں سی۔ ایس۔ ٹی اسٹیشن پر چھوڑ کر چلی آئی!''

ڈوبتے سورج کی طرف blankly دیکھتے ہوئے سواتی نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''میرا اصلی نام سواتی نہیں ہے''۔ اس کی اس بات پر راحت تھوڑا چونکا اور قدرے غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا حقیقی نام ذکیہ ہے۔ ذکیہ چودھری۔ Originally میں بنگلہ دیشی ہوں۔ ہائی اسکول تک پڑھی ہوں۔ غربت نے ماں باپ کا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ سولہ سال کی عمر میں ڈھاکہ سے کلکتہ لائی گئی۔ کلکتہ کے سوناگاچھی میں میری Virginity کا سودا ہوا اور میں کلی سے پھول بنا دی گئی۔ کئی برس تک کلکتہ کے ہی جسم کی منڈی میں بکتی رہی۔ بعد میں آگرہ بنارس اور دلی کے بازار سے ہوتی ہوئی ممبئی آ گئی۔ میری اصلی پہچان کلکتہ کے سوناگاچھی میں ہی کھو گئی تھی جب مجھے پہلی بار سجا سنوار کر نتھ اترائی کے لئے ایک بزنس مین کے بستر پر پیش کیا گیا تھا اُسی دن مجھے یہ نیا نام سواتی دیا گیا تھا۔ جب سے لفظ آتنکوادی مسلمانوں کی پہچان بن گیا ہے لوگ مسلم ویشیاؤں سے بھی نفرت کرتے ہیں اس لئے بازارِ جسم میں زیادہ تر مسلم رنڈیوں کے نام بدل دئے جاتے ہیں!!''

راحت خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور وہ بالکل سپاٹ لہجے میں اپنی کتابِ حیات کے اوراق پلٹتی جا رہی تھی۔ نہ زمانے سے کوئی شکایت نہ کسی درد کا احساس۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی روبوٹ محوِ کلام ہو۔

''تمہاری آنکھوں میں ایک خوبصورت دنیا دکھائی دے رہی تھی مجھے۔۔۔ مگر بدقسمتی سے اس دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس لئے ٹرین کی کہانی کو وہیں بھول کر میں تم سے دور ہو گئی۔ میری زندگی کا ایک کڑوا سچ یہ بھی ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔''

ایک بار پھر راحت کو فکری جھٹکا لگا مگر اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ اس کے پاس سوال کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سواتی نے اپنے ماضی کے مزید اوراق پلٹنے شروع کئے۔

''میرا ایک اپاہج شوہر ہے جو پہلے میری ہی دلالی کرتا تھا پھر پتہ نہیں کیوں اسے مجھ سے محبت ہو گئی اور اس نے مجھے اپنی شریکِ زندگی بنا کر اس غلاظت بھری زندگی سے نجات دلانے کی کوشش کی لیکن تقدیر کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ لوکل ٹرین سے گرنے کے سبب اس کے دونوں پیر کچھ اس طرح ٹوٹ گئے کہ انہیں کاٹ کر جسم سے الگ کرنا پڑا اور وہ زندگی بھر کے لئے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اس طرح تقدیر نے مجھے دوبارہ جسم کی منڈی میں دھکیل دیا۔ جب کرشنا سے کریم شیخ بن کر اس نے سچے دل سے اسلام قبول کیا تھا اور میرے ساتھ نکاح کیا تھا اس دن میں اپنے بیتے دنوں کے سارے دکھ درد بھول گئی تھی اور اسے ساتھ لیکر حاجی علی کی درگاہ گئی تھی اور درگاہ پر چادر چڑھائی تھی۔ مگر اب میں درگاہ درگاہ پر نہیں جاتی، کسی پیر ویر کو بھی نہیں مانتی۔ کریم کو پھر سے کرشنا کہہ کر پکارنے لگی ہوں۔ وہ بھی بھگوان وگوان کو نہیں مانتا''۔

اگرچہ وہ اپنی بات کسی کرب کے اظہار کے بغیر بے حد سادہ لہجے میں کہے جا رہی تھی مگر راحت اس کی آنکھوں میں غم کی بے شمار تصویریں دیکھ رہا تھا اور شاید اس کے اندر دبے غموں کی شدت کو محسوس بھی کر رہا تھا۔

''بس اسٹاپ سے دائیں طرف جو راستہ جاتا ہے وہ جوہو تارہ روڑ کہلاتا ہے۔ میں ہر رات سات بجے سے دو تین بجے تک اسی روڈ پر دھندہ کرتی ہوں۔ اس روڈ پر تین چار ایسے ہوٹل ہیں جنہیں ممبئی کی زبان میں چدّر بدلو ہوٹل کہا جاتا ہے۔ سڑک کے کنارے گاہک سے سودا طے کر کے میں انہیں انہی میں سے کسی ہوٹل میں لے جاتی ہوں۔ روز ڈھائی تین ہزار روپے کما لیتی ہوں۔ زندگی مزے سے گزر رہی ہے نہ اپنے آپ سے کوئی شکوہ ہے نہ دنیا سے کوئی گلہ''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ چند ساعتیں یونہی خاموشی کی نذر ہو گئیں اور راحت نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' میرا مطلب ہے financially اگر میں تمہیں اس دلدل سے نکال سکا تو مجھے بے حد خوشی ہوگی''۔

''تم مجھے بہت دیر سے ملے۔ اب یہ ممکن نہیں۔ میں اپنے آپ سے بہت مطمئن ہوں۔ اپنے بزنس سے بے حد خوش ہوں۔ اپنی پہچان سے اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ جس طرح ڈوم چمار اور مہتر اپنے اپنے کام خوشی سے انجام دیتے ہیں اسی طرح ایک ویشیا کی حیثیت سے اپنی پہچان کو میں دل سے قبول کر چکی ہوں۔ اور اپنا کام بڑے سکون سے کر رہی ہوں۔ اب مجھے ہر رات کئی کئی مردوں کے ساتھ ہم بستر ہونے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے جس طرح ایک مہتر مَیلا اٹھانے میں شرم محسوس نہیں کرتا اسی طرح ایک رنڈی کو بھی اپنے گراہک کے ساتھ سونے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرنی چاہیے''

اب اس کے لہجے میں تھوڑی تیزابیت جھلکنے لگی تھی۔ حالانکہ راحت سے گفتگو کے دوران اس نے بڑے احتیاط سے اپنے اندر کے زخموں کو چھپائے رکھا تھا مگر جذبات پر ایک حد تک ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ اب اس کے جذبات اس کی گرفت سے باہر ہونے لگے تھے اور آنکھوں کے دریچے پر کچھ نمی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ شاید درد کا ایک طوفان اس کے وجود میں مچلنے لگا تھا۔ اپنے احساس کو دبانے کے لئے اس نے پرس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا پھر سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بولی۔

''یہ تو صدیوں پرانا بزنس ہے! عورت ہر زمانے میں بکتی رہی ہے۔ آج بھی بک رہی ہے۔ اس میں نیا کیا ہے، کچھ نہیں!! میں اس حقیقت کو سمجھ چکی ہوں کہ ایک بار رنڈی بن جانے کے بعد سماج سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جاتا

باقی صفحہ ۱۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

عیدگاہ سے واپسی

اسلم جمشید پوری
(میرٹھ، بھارت)

پریم چند کا ننھا حامد ستر سال کا بزرگ میاں حامد ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بچپن کا ہر واقعہ یاد تھا۔ اُسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بچپن میں عید کی نماز کے لیے گیا تھا تو واپسی میں تین پیسے کا چمٹا خرید کر لایا تھا۔ اُس وقت اس کے دوستوں نے اس کا مذاق بنایا تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کے خریدے کھلونے یکے بعد دیگرے میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ اس کے چمٹے کی ایک ضرب نے سب کو بے کار کر دیا تھا۔ گھر آنے پر اس کی دادی پہلے اس سے ناراض ہوئی تھیں اور پھر اُسے خوب پیار کیا اور دعائیں دی تھیں۔ اس کے والدین بچپن ہی میں اللہ کے یہاں چلے گئے تھے، اُسے ان کی صورتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بعد میں دادی نے اُسے غریبی، مجبوری، بے بسی اور لاچاری کے لقمے کھلا کھلا کر پالا تھا۔ اس کا بچپن دوسرے بچوں سے مختلف تھا۔ دونوں دادی پوتے ایک دوسرے کی کائنات تھے۔ اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب قیامت صغریٰ نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایک رات جب وہ سو رہا تھا۔ بہت تیز آندھی آئی تھی۔ ہوا اور پانی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہت سے پیڑ، پھوس کی چھتیں، کچی دیواریں اور جھونپڑے زمین سے اپنا رشتہ ختم کر چکے تھے۔ ایسے میں اس کی دادی جو گھر کے اسارے میں محو خواب تھیں، چھان گرنے سے دب کر اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ دادی دادی کرتا روتا رہ گیا تھا۔ گاؤں کے ہی لوگوں نے دفن وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ اس کا حال ایسا تھا گویا زندگی کی دوڑ میں تنہا رہ گیا ہو۔ اس کا اس بھری پری دنیا میں دادی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد پڑوس کے بابا سکھ دیو نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گئے اور اُسے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ گاؤں کے اسکول سے پانچویں تک پڑھنے کے بعد اُس نے پاس کے ایک چینی مل میں مزدوری کا کام شروع کر دیا تھا۔

''بابا...... بابا...... مجھے بیلون لینا ہے''

اس کے آٹھ سالہ پوتے ساجد نے ایک غبارے والے کو دیکھ کر اسے ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ ماضی کے صحرا میں چلتے چلتے اچانک رک گیا تھا، ماضی کے واقعات بھی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اکلوتے پوتے کے ساتھ عید گاہ جا رہا تھا۔ عیدیں تو ہر سال آتی رہتی ہیں اور ہر سال وہ عید کی نماز ادا کرتا تھا لیکن اس بار وہ اپنے پوتے کے ساتھ پہلی بار عید گاہ جا رہا تھا۔

''بیٹا ابھی نہیں، واپسی پر لینا۔ ابھی نماز کے لیے جا رہے ہیں۔''

اس کے گاؤں سے عید گاہ تقریباً 5 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اس کا اپنا گاؤں ہندو اکثریتی گاؤں تھا وہاں مسجد نہیں تھی پاس کے گاؤں میں مسجد تھی۔ اکثر مسلمان جمعہ اور عید، بقرعید کی نمازوں کے لیے وہیں چلے جاتے تھے۔ حامد کو عید گاہ میں ہی عید کی نماز پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن کبھی موسم کی خرابی، کبھی وقت کی تنگی اور کبھی کام کی فراوانی کے باعث وہ ہر سال عید گاہ نہیں جا پاتا تھا۔ اس بار وہ کافی عرصے بعد عید گاہ کے لیے اپنے پوتے ساجد کے ہمراہ نکلا تھا۔ گاؤں سے نماز کے لیے ایک ٹولہ روانہ ہوا۔ کچھ نوجوان اسکوٹر اور بائیک سے نکلے تھے۔ کچھ پیدل ہی چل رہے تھے۔ کتنی خوشی اور رونق تھی ان کے چہروں پر۔ واقعی عید اللہ کا انعام ہے۔ ایک ماہ کے روزے رکھنے کے بعد، عید کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کی محنت، صبر، لگن اور للّٰہیت کے بدلے عید کے دن ان کے گناہ بخش دیتا ہے۔ میاں حامد نے رمضان کے پورے روزے رکھے تھے۔ گھر میں اس کی بہو بھی روزے کی پابندی کرتی تھی۔ ایک پوتا اور ایک پوتی..... بس یہی کائنات تھی اس کی۔ بیٹا واحد..... گذشتہ دنوں ہونے والے ہندو مسلم فساد کی نذر ہو گیا تھا۔ بیٹے کی یاد آتے ہی اچانک ذہن کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ پس منظر کا حصہ بن چکے مناظر یکے بعد دیگرے نظروں کے سامنے آنے لگے۔

ملک پر بڑا برا دن آیا تھا۔ سرخ آندھی چار سال قبل اُٹھی تھی جو شہروں شہروں آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی تھی۔ ہندو مسلم قصبات اور منافرت..... ایک دوسرے کے خون کے پیاسے لوگ..... عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا جنون..... کیا عبادت گاہوں کی مسماری سے کوئی قوم ختم ہو جاتی ہے؟ یہ وہی ہندو مسلم تھے جنہوں نے شانے سے شانہ ملا کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔ آج کیا ہو گیا ہے ان کو؟ کیوں ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہیں۔ واحد بے چارہ ان حالات سے بے خبر تھا، اس نے تو گاؤں میں آنکھ کھولی تو اپنے بابا سکھ دیو، چاچا بلدیو اور اپنے ہم عمر دوست رام اور کنور پال کو دیکھا تھا۔ وہ تو انہیں کے درمیان کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا۔ پاس کے ہی شہر میں وہ ایک بیکری میں مزدوری کا کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ اور گاؤں کی محنت مزدوری سے میاں حامد کسی طرح گھر چلا رہے تھے۔ شہر میں آنے والی سرخ آندھی نے بڑی تباہیاں مچائی تھیں۔ واحد بھی اس سرخ آندھی کی زد میں آ گیا تھا۔ اسے اس کے ہی ساتھیوں نے تہہ تیغ کر دیا تھا۔ غضب تو اس وقت ہوا جب واحد کی لاش گاؤں پہنچی۔

''میاں حامد...... میاں حامد..... واحد کی لاش .... آئی ہے'' بلدیو نے میاں حامد کو خبر دی تو اُسے جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بلدیو کو پکڑ کر چلایا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔''

ابھی وہ بلدیو کے کاندھوں کو پکڑ کر ہلا ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی دروازے پر رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور اسٹریچر پر واحد کی لاش لیے دو لوگ اندر داخل ہوئے۔ لاش کو چارپائی پر لٹا کر الٹے قدموں لوٹ گئے۔ کسی میں ان سے وا

حد کی موت کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔سارے گاؤں والوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ایک ایک کر کے سب کو پتہ چل گیا تھا کہ واحد کو شہر میں اس کے ساتھی مزدوروں نے کاٹ ڈالا تھا۔گاؤں کے ہندو،خود کو واحد کا قاتل محسوس کر رہے تھے۔میاں حامد کی حالت عجیب تھی،ان پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔آواز بند ہو گئی تھی۔وہ لاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے تھے۔گویا انہیں امید ہو کہ واحد اب اٹھا اور تب اٹھا۔اور اٹھتے ہی بابا کہتا ہوا ان سے لپٹ جائے گا۔اچانک بہت زور سے چیختے ہوئے میاں حامد زمین پر بے سدھ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔واحد کی بیوی شکیلہ پر بھی بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ساجد اور نازو اپنی ماں کے بے ہوش جسم سے لپٹے رو رہے تھے۔بلدیو اور گاؤں کے پردھان ٹھاکر امر پال نے تدفین کا انتظام کیا۔واحد کے جانے کے بعد سے میاں حامد کی حالت اس بوڑھے کی سی ہو گئی تھی جو لاغر ہو،کمر جھکی ہو اور اس کی لاٹھی اس سے چھین لی گئی ہو۔میاں حامد نے بچپن سے ہی بڑے نازک حالات دیکھے تھے۔قحط پڑتا تھا تو کھانے کے لالے پڑ جاتے۔مٹر،باجرہ،بے جھڑ اور جو کی روٹیاں بھی دن میں ایک وقت مل جاتیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے۔گھر،گھر کیا تھا۔بس ایک کمرہ اور اسارا تھا۔کھیتی کی زمین نہیں تھی۔اس کے باپ دادا نے بھی دوسروں کے یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا تھا اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔شروع میں بابا سکھ دیو کے گھر سے ہی اسے وقت بے وقت کھانا ملتا تھا بعد میں اس نے خود بھی کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔

"بابا......او بابا.....وہ تتلی پکڑ دونا..........کتنی اچھی ہے وہ"

ساجد کی آواز نے ایک بار پھر انہیں سوچ نگر کی گلیوں سے حقیقت آباد کے کچے راستوں پر لا دیا تھا۔اس کا پوتا ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔تتلی کبھی ادھر کبھی ادھر جاتی،لیکن ساجد کے پہنچتے ہی اڑ جاتی۔انہیں ایک پل کو لگا جیسے تتلی ان کی خوشی ہو،جو ہمیشہ اس سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔لمحہ بھر کو لگتا کہ اب ہاتھ آئی.....اب آئی۔لیکن پھر پھُر سے اڑ جاتی۔بے چارے ساجد کو کیا پتہ کہ یہ تتلی ہماری قسمت میں نہیں؟ہماری قسمت میں تو ہمیشہ کے دکھ ہیں جو سردی کی راتوں جیسے طویل ہوتے ہیں۔

"ساجد بیٹے۔نہیں۔تتلی کے پیچھے نہ بھاگو۔گر پڑو گے۔کپڑے خراب ہو جائیں گے۔"

کپڑے،کپڑے تو ساجد نے پہنے تھے مگر نئے نہیں تھے۔جبکہ ساجد نے پچھلے ہفتے ضد کی تھی۔

"بابا مجھے بھی نئے کپڑے سلواؤ نا،میں بھی حشمت کی طرح نئے کپڑوں میں عیدگاہ جاؤں گا۔"

"اچھا بیٹا...لا دیں گے"بوڑھے حامد میاں نے مجبوراً کہا۔

اور انہوں نے ساجد کو پرانے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ٹھیک ٹھاک سے کپڑے لا دیے تھے۔اتفاق سے چینی مل کے باہر پرانے سستے کپڑوں کا ایک ٹھیلہ عید کے سبب لگا تھا۔اس نے سرخ رنگ کی شرٹ اور نیلی پینٹ لے جا کر بہو کو دے دیے۔

"بہو انہیں دھو دینا۔اور تہہ کر کے نیچے رکھ کر اس پر پہلے پھونس پھر بستر بچھا دینا۔میں سو جاؤں گا۔کپڑوں پر استری ہو جائے گی۔"

بہو نے ایسا ہی کیا تھا۔ساجد کو ماں اور دادا نے بہکا لیا تھا۔چھوٹی نازو کی طبیعت خراب تھی اسے ماتا نکل آئی تھی۔وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ہر وقت روتی رہتی۔مکھیاں اسے پریشان کرتیں۔حامد مکھیوں کو دیکھ کر کئی بار سوچتا۔"اللہ نے مکھیاں کیوں پیدا کی ہیں۔یہ تو سب کو پریشان ہی کرتی ہیں۔"پھر خود ہی دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتا کہ اللہ نے ہر چیز سوچ سمجھ کر ہی پیدا کی ہے۔

عید سے دو دن پہلے گاؤں کے حاجی لطیف ان کے پاس آئے تھے اور زکوٰۃ کے تین سو روپے دے گئے تھے۔انہوں نے کچھ پیسوں سے گھر کی ضروریات کو پورا کیا تھا۔ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ نازو کی بیماری اور گھر کے خرچے میں لگ جاتا تھا۔عید کے لیے پیسے کہاں سے آتے۔زکوٰۃ کے پیسوں سے انہیں کچھ راحت ملی تھی۔انہوں نے سوچا تھا کہ اب کی عید پر وہ ساجد کو ریموٹ سے چلنے والی کار اور نازو کو پلک جھپکنے والی گڑیا خرید کر لائیں گے۔بہو جو جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی' کے لیے ایک سوٹ لائیں گے۔عیدگاہ جانے سے پہلے انہوں نے نہا کر اپنے پرانے دھلے کپڑے پہنے۔پھر ساجد کو تیار کیا۔ساجد کی ماں اسے عیدگاہ بھیجنے کو تیار نہ تھی۔لیکن ساجد کی ضد اور میاں حامد کی مرضی کے آگے وہ مجبور ہو گئی تھی۔شوہر کی موت کے بعد اسے تو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا کہیں اس کے بیٹے کو کچھ نہ ہو جائے۔گاؤں کے لوگ ساجد کو بہت پیار کرتے تھے،وہ تھا ہی بہت پیارا۔عیدگاہ چلنے سے پہلے انہوں نے سویاں کھائیں۔پھر ایک ایک روپیہ سب کو عیدی کے دیے۔انہوں نے بلدیو کے بچوں کو بھی عیدی دی تھی۔وہ ہر سال ان کے بچوں کو عیدی دیا کرتے تھے۔ساجد نے اپنے اور نازو کے روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔گاؤں کے دس بارہ بڑے بوڑھوں،بچوں پر مشتمل یہ ٹولہ سفید کرتا پاجامے میں ملبوس سر پر ٹوپیاں لگائے عیدگاہ کے لیے نکلا تھا۔عیدگاہ تک جانے کے لیے تین گاؤں کو پار کرنا پڑتا تھا۔سردیوں کا زمانہ تھا۔راستے کے دونوں جانب ہری فصلیں لہلہا رہی تھیں۔گیہوں کے کھیتوں پر شباب کا رنگ تھا۔سرسوں پھول رہی تھی۔ہرے اور پیلے رنگ نے زمین کو اس کنواری دوشیزہ سا بنا دیا تھا جس نے سبز رنگ کے کپڑوں پر پیلا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو،بلکہ ایسا بھی گمان ہو رہا تھا گویا قدرت زمین کے ہاتھ پیلے کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔بٹیا کے دونوں جانب فصلوں کی مہک دیوانہ بنا رہی تھی۔کہیں مٹر کے سفید اور جامنی پھول،کہیں ایکھ کے کھیت۔گاؤں میں ایک آدھ کولہو بھی نظر آ جاتا تا۔کولہو سے گڑ کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ویسے اب زیادہ تر کسان شوگر ملوں میں ہی گنا ڈالتے اور نقد روپے لے آتے۔اب گاؤں میں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔گاؤں کی نئی نسل کے بچے جب سے پڑھ لکھ گئے تھے اور کچھ نے باہر سروس

شروع کردی تھی گاؤں کا ماحول تبدیل ہونے لگا تھا۔اب وہ پہلے جیسی بے لوث محبت نہیں رہی تھی۔ پہلے گاؤں کے کسی ایک شخص کا داماد سارے گاؤں کا داماد ہوتا تھا۔اس کی اتنی خاطر کی جاتی کہ وہ خاطر سے پریشان ہوجاتا تھا۔ ہندو مسلم شیر وشکر کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہونا،ایک دوسرے کے کام کروانا۔ چھان اٹھوانا، اکھ بُوانا،شادی بیاہ میں ہاتھ بٹانا ان کا معمول تھا۔

''میاں حامد.....میاں....ٹنک سستائے لیو.....رس پی لیو۔گرم گڑ کھالیو۔''

مُراد پور گاؤں کے کولہو والے بزرگ چاچا ایشور نے عیدگاہ جاتے قافلے کو روک لیا تھا۔مُراد پور کے گاؤں کے مسلم بھی عیدگاہ جانے کو تیار تھے۔ جلدی جلدی قافلے کی خاطر کی گئی۔قافلہ پھر آگے بڑھ گیا۔حامد کو سکون ہوا کہ چلو ابھی بڑے بزرگوں میں کم از کم اتنی محبت اور خلوص تو باقی ہے۔قافلہ اب پکی سڑک پر آگیا تھا۔

میاں حامد نے اپنے پوتے ساجد کو کندھے پر بٹھا لیا تھا۔قافلہ پکی سڑک کی ایک جانب قطار بنا کر چل رہا تھا۔اچانک ایک تیز رفتار بس قافلے کے کے نزدیک سے گذری۔سب لوگ جلدی سے ایک طرف کو نہ ہوگئے ہوتے تو معاملہ خراب ہوسکتا تھا۔

''ابے اے کٹوؤ! کہاں جارہے ہو.........؟''

موٹر سائکل پر سوار تین کم عمر اوباش قسم کے نوجوان، زور سے چلّا تے ہوئے برق رفتاری سے گذر گئے۔ننھا ساجد چونک گیا۔

''بابا یہ.....کٹوا کیا ہوتا ہے.....؟''

''کچھ نہیں بیٹا.......یہ گندے بچے تھے.....تم ایسے نہ بننا.....''

میاں حامد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔زمانہ کتنا بدل گیا تھا۔ بڑے چھوٹوں کا امتیاز ہی نہ رہا۔ بیٹے ،باپ کے سامنے بیٹھتے بھی نہیں تھے۔میاں بیوی کسی کی موجودگی میں ساتھ بیٹھنے سے بھی کتراتے تھے۔ بہو ،ساس سسر کا احترام کرتی تھی۔آج سب الٹ ہوتا جارہا ہے۔یہ سب فلموں اور فیشن سے ہوا تھا۔بچوں میں فلموں کا شوق دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔وہیں سے خرافات سیکھتے ہیں۔فیشن اللہ توبہ! لڑکیاں بھی پتلون پہننے لگی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بازو کی قمیصیں۔دوپٹا یا تو گلے میں پٹے کی صورت یا پھر ندارد۔گاؤں بھی تبدیل ہوگئے تھے۔کچے مکانوں کی جگہ پختہ اور بڑے مکان، موٹر سائیکلیں اور کاریں اب اکثر دکھائی دیتیں۔پہلے کسی کے گھر کار ہوتی تو اسے بڑا رئیس مانا جاتا، لوگ اس کی مثالیں دیتے تھے۔گاؤں کو شاہراہوں سے ملانے والی کچی سڑکیں کھڑنجے یا تارکول کی بننے لگی تھیں۔علاقے میں فیکٹریاں اور مل لگنے لگے تھے۔ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانیت ختم ہوتی جارہی تھی۔

''بابا عیدگاہ کب آئے گی.....؟''

''بس بیٹا ....وہ جو گاؤں دکھ رہا ہے نا ....بس اسی گاؤں میں ہے....''

''بھئی ذرا جلدی چلو....کہیں ایسا نہ ہو نماز چھوٹ جائے۔رمضان کی ساری محنت ڈوب جائے گی۔''

میاں حامد نے قافلے کے بڑے، چھوٹوں، سب کو نصیحت کی۔اور سب جلدی جلدی قدم بڑھانے لگے۔کچھ ہی دیر میں وہ اسلام پور کی سرحد میں داخل ہوگئے تھے۔اسلام پور مسلم اکثریتی گاؤں تھا۔عیدگاہ کے راستے پر دونوں طرف میلہ لگا تھا۔ساجد تو بے چین ہوا جارہا تھا۔کہیں جھولے والے آواز لگا رہے تھے۔کہیں غبارے دھاگوں سے بندھے ہوا میں جھوم رہے تھے۔گول گپّے والے، چاٹ پکوڑی والے، چھولے کی چاٹ، دہی بڑے، بتاشے والے، مکّا کی کھیلوں والے، کھلونوں کی تو بہت سی دکانیں تھیں، کسی دکان پر ہر مال پانچ روپے، کسی پر ہر مال دس روپے کا بورڈ لگا تھا۔ساجد کی نظریں چاروں طرف بکھری بازار کی رونقوں کو دیکھ کر ہونق ہوئی جارہی تھیں وہ سب کچھ خرید لینا چاہتا تھا۔

''بھیا آجاؤ۔جلدی آؤ.....نماز کھڑی ہونے والی ہے۔''

عیدگاہ سے کئی لوگ راستے میں آنے والوں کو پکار رہے تھے۔

قافلے نے لپک کر عیدگاہ میں قدم رکھا۔عیدگاہ بہت بڑی نہیں تھی۔مغرب کی طرف مسجد جیسی عمارت کی تقریباً بیس فٹ اونچی دیوار تھی جس میں کنگورے کٹے ہوئے تھے دیوار کے آخری سروں پر دو بلند مینار تھے۔باقی دور تک خالی زمین جو سال میں دو نمازوں کے لیے اپنا دامن پھیلائے رہتی تھی۔عید میں بہت بھیڑ ہوتی تھی۔اسلام پور کے علاوہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی یہیں نماز پڑھنے آتے تھے۔میاں حامد بچپن سے اب تک نجانے کتنی بار عیدگاہ آئے تھے۔نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے تو ایسا لگتا گویا فرشتے زمین پر اتر آئے ہوں۔نماز کے بعد اسلام پور کے لوگ آس پاس کے لوگوں کو بغیر کچھ کھائے پیئے واپس جانے نہ دیتے میاں حامد کے ساتھ کئی بار بلدیو چاچا کے بچے بھی آجاتے تھے۔مسلمان نماز پڑھتے اور وہ سب کے جوتے چپلوں کی رکھوالی کرتے بعد میں عیدگاہ میلے سے میاں حامد ان کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے ضرور خریدتے۔وہ سب اپنے بھائی ہی تو تھے۔وہ سب میاں حامد سے چھوٹے تھے۔میاں حامد کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بار بلدیو چاچا نے اپنی ٹریکٹر ٹرالی نکالی تھی اور گاؤں کے سارے مسلمانوں کو بھر کر عیدگاہ لائے تھے۔کتنا میل ملاپ تھا لوگوں میں۔گاؤں میں امن و امان تھا۔گاؤں کے حالات سیاست سے بدلے تھے۔اب گاؤں میں بھی سیاست بڑھنے لگی تھی، پردھان اور گاؤں کے امیر لوگ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے۔رات کو موٹر چوری کرواتے، صبح کو ہمدردی جتانے پہنچ جاتے۔اور دو ایک دن بعد موٹر کہیں سے برآمد ہوجاتی۔اسی طرح بیل اور بھینس بھی غائب ہوجاتیں۔انہیں اچانک دس سال

قبل کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اس نے ایک رات بابا سکھ دیو کی بھینس چراتے کھیا کے بڑے لڑکے کو دیکھ لیا تھا۔

"چور......چور......دیکھو بھینس لے جار ہا رہے۔ چاچا...او بابا، بھیا....."

اس کی آواز پر بھینس کو بیچ میں چھوڑ کر چور فرار ہو گئے تھے۔ مگر اس نے ایک چور کو پہچان لیا تھا۔ اور غضب تو اس وقت ہو گیا جب اگلے دن پنچایت میں اس نے کھیا کے بیٹے کا نام سب کے سامنے کہہ دیا۔ کھیا کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

"تم جھوٹ بولت ہو....میرا بیٹا نہیں کوئی اور ہوگا....."

"نہیں ...نہیں....میں نے اپنی آنکھوں سے بیر پال کو دیکھا تھا....."

"پنچوں یہ مسلمان ہے ....یہ ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔...."

میاں حامد نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ بات اس کے کردار پر آجائے گی۔ نفرت کیا ہوتی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ اس نے تو کبھی کسی کو بری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ کیا ہندو، کیا مسلمان۔ وہ تو بچپن سے ہی بابا سکھ دیو کے گھر رہ کر بڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ہی اس کی شادی کروائی تھی۔ گاؤں کے کئی مسلمانوں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ سکھ دیو کے گھر نہ رہے لیکن اس نے کسی کی نہ سنی تھی۔ پھر بابا اسے بیٹا ہی تو مانتے تھے۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ کھیا کے جملے نے تو جیسے میاں حامد کے سینے کو گرم سلاخوں سے داغ دیا تھا۔ اس کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ گم سم ہو گیا۔ مانوں اس کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔ لیکن اگلے ہی لمحے سکھ دیو اور ان کے خاندان والوں نے کھیا اور اس بیٹے پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ دونوں طرف سے زوردار حملے ہو رہے تھے۔ اس سے قبل کہ کچھ انرتھ ہو جاتا، حامد میاں نے ایک زور کی چیخ ماری.....

"بند کرو خدا کے لیے.....!"

اور واقعی لڑائی کو اچانک بریک لگ گئے تھے۔

"تم لوگ میرے اوپر لڑ رہے ہونا۔ چلو میں گاؤں چھوڑ کر ہی چلا جاتا ہوں۔"

میاں حامد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، انہوں نے اپنا منہ دونوں ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ ان کے اتنا کہتے ہی کھیا اور بلدیو چاچا ایک ساتھ ان کی اُور لپکے تھے۔

"نہیں حامد......تم گاؤں نہیں چھوڑو گے...."

اور پھر وہ ہوا جو گاؤں والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کھیا نے اپنے بیٹے بیر پال کو سب کے سامنے مارنا شروع کر دیا۔

"اس کے کارن سب کچھ ہوا ہے......"

بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا تھا۔ گاؤں میں حامد کی الگ پہچان تھی۔ وہ ایک ایماندار مسلمان تھا۔ جو جتنا مسلمانوں کا ہمدرد تھا اتنا ہی ہندوؤں کا بھی۔

"اللہ اکبر...."

امام صاحب نے نیت باندھ لی تھی سب نے دو رکعت نماز ادا کی۔ خطبہ سنا اور دعا مانگنے لگے۔ میاں حامد نے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے۔ ان کے لب تھرتھرا رہے تھے، ہاتھ بھی لرزنے لگے۔ "اے خدا.....میرے خدا.....ہم بڑے گنہ گار ہیں۔ اے خدا ہمیں مسلمان کے ساتھ ساتھ انسان بھی بنا۔ مجھے انسانوں کی خدمت کرنا سکھا۔ یہ جو ایک عجیب قسم کی آندھی شہروں سے گاؤں کی طرف چلی آرہی ہے ہمیں اس سے محفوظ رکھ....."

دعا کے بعد سب ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ میاں حامد جھک کر اپنے پوتے ساجد سے گلے ملے۔ گلے ملتے وقت انہیں بے پناہ طمانیت اور مسرت کا احساس ہوا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ساجد کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ ایک چھوٹا بچہ بن گئے ہیں بچہ جو معصوم ہوتا ہے جو فرشتہ صفت ہوتا ہے۔

"بابا.....بابا.....آؤنا کھلونا لیں گے....."

ساجد نے ان کا ہاتھ کھینچا تو وہ دکانوں کی طرف چل دیے۔ ساجد نے بہت سے کھلونے دیکھے۔ سب کو فیل کرتا گیا۔ آخر میں اسے ریموٹ سے آگے پیچھے ہونے والی ایک خوبصورت سی کار پسند آگئی۔ ساجد نے ضد کر لی بابا میں تو اسے ہی لوں گا۔

"بھیا کتنے کی ہے.....؟

"بابا پورے سو روپے کی"

"سو روپے....؟" میاں حامد کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی جیب میں کل ڈیڑھ سو روپے رکھے تھے۔ اگر وہ کھلونا خرید لیتے تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ لیکن وہ پوتے کا دل بھی نہ توڑنا چاہتے تھے۔ آخر کار ساجد کی ضد جیت گئی۔ مول بھاؤ کے بعد سودا پچاس روپے میں ہو گیا۔ پھر دونوں نے نازو کے لیے ایک آنکھیں مٹکاتی گڑیا خریدی، بابا سکھ دیو کے بچوں کے لیے بھی کھلونے اور دوسرا سامان خریدا۔ سامان لے کر وہ نکل ہی رہے تھے کہ اچانک گولیوں کے دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ در اصل اس بار عید اور کانوڑیا ترا آس پاس ہی تھے۔ سارے علاقے میں دہشت تھی۔ ہر طرف زعفرانی رنگ لہرا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ کانوڑیوں کا ایک جتھا اسلام پور سے گذر رہا تھا۔ ان پر کسی مسلمان نوجوان نے پتھر مار دیا تھا بس کیا تھا۔ کارسیوکوں نے مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ خبر پھیلتے ہی گاؤں کے مسلمانوں نے گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ کارسیوکوں کی حمایت میں بھی بندوقوں نے گولیاں اگلنی شروع کر دی تھیں۔ گولیوں کا نشانہ بن کر کئی لوگ لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

میاں حامد نے ساجد کو گود میں اٹھالیا اور ایک طرف کو بھاگنا شروع کردیا۔انہیں قافلے کے دوسرے لوگوں کو ادھر ادھر دیکھا بھی، لیکن وہ ایک لمحہ بھی انتظار میں گنوانا نہیں چاہتے تھے۔گاؤں کے حاجی شوکت نے حامد میاں کو اسلام پور میں ہی رکنے کو کہا۔اسلام پور مسلمانوں کا بڑا گاؤں تھا۔مگر حامد میاں نے منع کردیا اور ایک طرف بھاگنے لگے۔وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ساجد کے ہاتھوں میں کار، گڑیا اور دوسرا سامان تھا۔ننھے ساجد کو پتہ نہیں تھا اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کرلی تھیں ۔میاں حامد پکی سڑک تک آگئے تھے۔ان کے بوڑھے قدموں میں نجانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔دراصل موت کا ڈر۔خود ایک زبردست طاقت عطا کرتا ہے۔ان کو ڈر تھا کہ اسلام پور کا معاملہ جب دوسرے گاؤں پہنچے گا تو ظلم ہو جائے گا۔وہ اس لمحے کے آنے سے قبل ہی اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتے تھے۔سڑک پر پیچھے سے شور کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔انہوں نے مڑکر دیکھا ایک بھیڑ بے تحاشہ بھاگی آرہی تھی۔لوگوں کے ہاتھوں میں تلواریں، لاٹھیاں اور بلّم تھے۔انہوں نے سڑک سے کھیتوں میں بھاگنا شروع کردیا تھا۔اب بس ایک گاؤں پار کرنا رہ گیا تھا، جس کے پاران کا گاؤں تھا۔دوڑتے دوڑتے وہ تھک گئے تھے۔گاؤں کے ایک ویران پڑے ٹیوب ویل کے پاس وہ سانس لینے کو رکے۔انہوں نے راستے سے خود کو چھپالیا تھا تاکہ کوئی گذرے تو دیکھ نہ پائے۔

''بابا...کیا ہوا۔آپ کیوں بھاگ رہے ہو....؟''

''چپ....پ...''

میاں حامد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔کہیں کوئی آواز نہ سن لے۔اتنے میں گاؤں میں زبردست دھماکہ ہوا۔لگا جیسے کہیں کوئی بم پھٹا ہو۔اسلام پور سے اٹھنے والی آندھی سرخ ہوتی جارہی تھی۔موقع ملتے ہی چنگاری، شعلہ بن رہی تھی۔آگ گاؤں گاؤں پھیلتی جا رہی تھی۔میاں حامد کے جسم میں خوف کا ناگ بری طرح لہرایا تھا۔انہوں نے ایک بار پھر اپنا راستہ تبدیل کیا۔اب وہ گاؤں سے نہ گذر کر کھیتوں کھیتوں اپنے گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔دوڑتے دوڑتے وہ اپنے گاؤں کی سرحد میں داخل ہوگئے تھے۔ساجد کو نیچے اتار کر انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔اطمینان ہوگیا تھا کہ اب وہ اپنے گاؤں میں آگئے ہیں وہ گاؤں جہاں ان کی اور ان کے باپ دادا کی عمریں گذری تھیں۔وہ اطمینان سے ساجد کی انگلی پکڑے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ابھی وہ گاؤں میں داخل ہی ہوئے تھے کہ گاؤں سے ایک شور بلند ہوا۔

''مارو......پکڑو......''

اس سے قبل کے میاں حامد کچھ سمجھ پاتے ایک جتھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔خون کی پیاسی تلواریں، آنکھوں میں درندگی اور وحشت سمائی ہوئی۔انہوں نے پلک جھپکتے ہی ساجد کو اپنی گود میں اٹھالیا اور جیسے ہی ایک طرف کو بھاگنا چاہا مکھیا کے بیٹے بیر پال کی دونالی سے نکلنے والی ایک بے رحم گولی نے ساجد کو نشانہ بنالیا۔

ساجد کے جسم کو پار کرتی ہوئی گولی میاں حامد کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی۔گولی نے اس طرح معصوم ساجد کا جسم پار کرکے میاں حامد کو زمین کا پیوند بنادیا تھا جیسے شمر کا تیر معصوم علی اصغر کے حلق سے ہوتا ہوا امام حسین کے بازو میں ترازو ہوگیا تھا۔دونوں زمین پر آرہے۔خون کا فوّارہ دونوں جسموں سے بلند ہورہا تھا۔زمین ساکت تھی۔آسمان خاموش تھا۔ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے اور تھوڑی ہی دوری پر ساجد کی کار، نازو کی گڑیا، بہو کا سوٹ اور ایک دھوتی، ایک خوب صورت اور چھوٹی سی پیتل کی لٹیا پڑی تھی، جو میاں حامد بابا سکھ دیو کے گھر والوں کے لیے لائے تھے۔

بقیہ: پیکدان

ہے۔ایک رنڈی صرف رنڈی ہوتی ہے!!۔۔۔اس کا نہ مذہب ہوتا ہے نہ خدا!!۔۔۔اگر اس کا کوئی خدا ہوتا تو وہ رنڈی کیوں بنتی؟!!۔۔۔دراصل ہماری زندگی پیکدان کی طرح ہے جسے مرد اپنی گندگی انڈیلنے کے لئے استعمال کرتا ہے!!۔۔۔تم ایک اچھے انسان ہو مگر پیکدان کو گلدان میں بدلنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے راحت!!۔۔ایک سواتی کو اگر تم نے اس دلدل سے نکال بھی دیا تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟!!۔۔معصوم بے سہارا لڑکیوں کو ویشیا بنانے کا کاروبار تو اپنی جگہ چلتا ہی رہے گا!!۔۔دراصل ہم جیسی چلتی پھرتی پیکدان کی سماج کو سخت ضرورت ہے کیوں کہ ہر سماج میں مردوں کا ایک ایسا طبقہ ضرور ہوتا ہے جو میلے کی طرح ہوتا ہے۔ہم رنڈیاں اگر ان غلاظت نما مردوں کو نہ ڈھوئیں تو ان سے سماج میں سڑاند پھیل سکتی ہے اور شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں انکے خونخوار پنجوں کا شکار ہوسکتی ہیں!!۔۔اس لئے جسم فروشی کا دھندہ میں ایک Social duty سمجھ کر بھی کرتی ہوں!۔۔میرے دھندے کا ٹائم ہوگیا۔میں چلتی ہوں''۔

سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر وہ تیز تیز قدم اٹھائے جوہو تارا روڈ کی طرف بڑھ گئی۔دور، بہت دور سورج بحر عرب کی آغوش میں ڈھل چکا تھا۔شفق کی لالی پر رات کے سائے بتدریج غالب آتے جارہے تھے۔راحت کے وجود پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔شاید پہلی بار اس نے زندگی کی ایسی دلدوز تصویر دیکھی تھی۔اپنے فکر وادراک میں وہ اک گہری دھند محسوس کررہا تھا جس میں اس کے سارے خواب گم ہوگئے تھے۔

''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں''

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

کچھ دنوں سے ہمیں عجیب وغریب خواب نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔خواب تو ہمیں اکثر عجیب وغریب ہی نظر آتے تھے، مثلاً کبھی ہم خود کو اندھے کنویں میں گرتا دیکھتے، کبھی اپنی وطن مالوف کی سیر کی دوران کسی نادیدہ جرم کی پاداش میں دھر لیے جاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خواب میں ہمارے پَر اُگ آتے اور ہم آسمانوں کی جانب اونچی، بہت اونچی اُڑان بھر کر واپسی کا راستہ بھول جاتے، ایسے میں کوئی غیبی آواز ہمارے کانوں میں گونجتی مگر اُس کے الفاظ مانوس ہوتے ہوئے بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتے۔ایک بار! ہاں ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ہم حکیم لقمان کی پیروی میں موت کے فرشتے کو جُل دے کر زمانے بھر کی خاک چھاننے کے بعد واپس جب اپنے گھر لوٹے تو ہمارا جسدِ خا کی سفرِ آخرت کی جانب گامزن تھا۔

گزشتہ رات نظر آنے کی خواب کی نوعیت کچھ ایسی ہے، جس کا ذکر ہم، بڑی عمر کے عزیزوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے بار ہا سن چکے ہیں۔نہ صرف سن چکے ہیں بلکہ اُس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بھی ان گنہگار آنکھوں نے ایک سے زائد بار دیکھی ہے۔

کئی دنوں سے بی جی ہر رات سفید لباس میں ملبوس ہمارے خواب میں وارد ہو کر دونوں ہاتھ بڑھائے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔جیسے ہی ہم بی جی سے کوئی سوال کرنے کی غرض سے اپنے لبوں کو جنبش دینے کی کوشش کرتے ہیں تو فوراً ہماری آنکھ کھُل جاتی ہے۔

بچپن سے دیکھتے اور سنتے آئے ہیں کہ شدید بیمار اور بزرگ لوگوں کو جب اس طرح کے خواب نظر آنا شروع ہو جائیں یعنی اُن کے مرحوم اعزاء، والدین یا بہن بھائی سفید لباس میں ملبوس اُن کے خواب میں آ کر اپنے ہمراہ چلنے کی ترغیب دیں تو اس کا مطلب ہے خواب دیکھنے والے کا سفرِ آخرت آن پہنچا۔

جس دن سے ہم یہ خواب تواتر سے دیکھ رہے ہیں اُس دن سے ہمارے ذہن میں یہی ایک خیال رہ رہ کر آ رہا ہے، کیا ہم مرنے والے ہیں؟ بظاہر ساٹھے پاٹھے دکھائی دینے والے ہم جیسے لوگ جوانی کا دم بھرتے اور زندگی سے لطف ہوتے اکثر دیکھے گئے ہیں۔تو پھر بی جی! ہماری اپنی مہربان، شفیق اور جانثار بی جی اپنے چہیتے کو موت کی وادیوں میں کیوں لے جانا چاہتی ہیں؟

ٹھہریے! ہمارا اور آپ کا اس مکان پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا اور ٹھہر کر یہ سوچنا بہت ضروری ہے کہ ایک انسان کو اُس کی زندگی میں موت کتنی بار آیا کرتی ہے یا آ سکتی ہے؟ آپ کی، ہماری سوچ کا نتیجہ اگر ایک ہے تو پھر ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مردہ شخص جو برسوں بلکہ عشروں پہلے کم سنی میں موت سے ہم آغوش ہو چکا ہے دوبارہ کیونکر مر سکتا ہے؟ اس مسئلے کا ایک نہایت سادہ حل یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے آپ ہمارے اور بی جی کے ماضی سے ہمکلام ہو جائیں۔اس کے بغیر آگے بڑھنا ایک طرح سے اندھیری گلی میں سفر کرنے کے مترادف ہوگا۔جی ہاں! اندھیری گلی جس میں مسافر ایک ہی جگہ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے ہونے کے باوجود ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتا مگر اپنی دانست میں اس کا سفر جاری رہتا ہے۔

ہماری یادوں کا سلسلہ، دراز قد، چھریرا بدن، گھنی مونچھوں اور آنکھوں پر موٹا چشمہ لگائے سخت گیر مگر کم گو اور اصول پسند ڈاکٹر والد صاحب اور سراپا محبت واپنائیت، ہنس مکھ، ملنسار اور محنتی والدہ سے شروع ہو کر چھ بہن بھائیوں کے علاوہ خاندان کے دیگر بزرگوں، محلے داروں، پڑوسیوں کی طویل قطار کے بعد بی جی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

اس وقت بی جی کی عمر جوانی اور بڑھاپے کا حسین امتزاج پیش کرتی تھی کبھی کبھی فکر مندی یا تھکن کے باعث بڑھاپا اُن کے چہرے پر ناجائز قبضہ جمانے کی کوشش کرتا تو دوسرے لمحے، دوسرے پل کبھی کبھی دوسرے دن آرام، اطمینان اور عبادت کی شمع سے روشنی پا کر بی جی کے چہرے کا نور ایک بار پھر سے جگمگ، جگمگ کرنے لگتا۔بی جی سرتاپا خوبصورتی اور خوب سیرتی کا چلتا پھرتا، جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم بڑھاتی تین معصوم بیٹیوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ جس وقار اور اعتبار سے بی جی بیوگی کے دن گزار رہی تھیں اُس کی مثال دُور، دُور تک دستیاب نہ تھی۔

گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد مسئلہ جب اسکول میں داخلے کا درپیش ہوا تو ہمارے ساتھ دادا دادی نے بہت واویلہ مچایا جس کا حل والد صاحب نے ایک ملازم کی شکل میں فراہم کر دیا۔ملازم کی ذمہ داری ہمیں اسکول لے کر جانا اور تمام وقت باہر بیٹھ کر ہمارا انتظار کرنا تھا۔آدھی چھٹی کے درمیان والد صاحب کے حکم کے مطابق ملازم کی ڈیوٹی اپنے ہاتھ سے ہمیں گھر کی بنی چُوری یا انڈہ پراٹھا کھلانا بھی تھا مگر ہم ہر روز ملازم کے ہاتھ ڈبہ چھین کر لے جاتے اور دوستوں کے ہمراہ مل بانٹ کر کھاتے۔

یوں تو ہمیں کم سنی میں بی جی کے گھر جانے کا بارہا اتفاق ہوا تھا مگر بی جی کے گھر کا محل وقوع ہمارے لئے قطعی اجنبی تھا۔اُس روز اسکول سے واپسی پر پیٹ میں درد کے باعث ہمارے کپڑے خراب ہو گئے اور ہم نے زور، زور سے رونا شروع کر دیا تو ملازم ہمیں تسلّی دیتے ہوئے نزدیک ہی واقع بی جی کے گھر لے گیا۔ملازم کی کوشش تھی کہ وہ ہمیں اپنے ہاتھوں سے نہلائے دھلائے مگر بی جی نے اُس غریب کو ڈانٹ پلا کر برآمدے میں بٹھا دیا۔بی جی نے اپنے ہاتھ

سے نہ صرف ہمارے کپڑے، جسم، منہ، ہاتھ دھلایا بلکہ ہمارے سر میں تیل، کنگھا اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر دودھ کا بڑا سا پیالہ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے سارے کا سارہ پینے کا حکم صادر کر دیا۔ درمیانی لڑکی جو صحن میں رسی ٹاپ رہی تھی کو دودھ کا دوسرا پیالہ تھماتے ہوئے ملازم کو پہنچانے کا کہا۔ چلتے وقت ملازم بی جی کی ہر بات پر ''جی آپا جی، جی آپا جی'' کہہ کر سر مارتا رہا۔ اُس دن کے بعد اسکول سے واپسی پر ہر روز ہمارا پڑاؤ بی جی کے گھر ٹھہر کر لسّی، پانی پیتا اور کچھ دیر ستا کر اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوتا۔

بی جی کے گھر پڑاؤ کا سلسلہ زیادہ پرانا نہ ہوا تھا کہ ایک دن واپسی پر بی جی کی نظر ہماری ناک پر لگے زخم پر مرکوز ہوگئی۔ بی جی نے ڈانٹ کر زخم کی بابت دریافت کیا تو ہم نے اُس لڑکے کا نام صاف، صاف بتا دیا جس نے کھیل کے دوران ہماری ناک پر مکّا جڑ دیا تھا۔ پہلے تو بی جی نے ملازم کو اندر بلا کر خوب جھاڑ پھٹک کی اور آئندہ کے لیے چوکنا رہنے کی تاکید کرتے ہوئے دوسری صبح اسکول جانے سے پہلے اپنے گھر بلانے کا کہا۔ اگلی صبح ہم دو نہیں تین افراد اسکول کی جانب گامزن تھے۔ آگے آگے بی جی شیرنی کی مانند قدم بڑھا رہی تھیں پیچھے پیچھے ڈرا سہما ملازم دُم دبائے چل رہا تھا اور ہم ان دونوں کے آگے پیچھے اُچھل کُود کرتے ہوئے فاتح کی مانند آگے بڑھ رہے تھے۔

اسکول میں بی جی کی آمد بجائے خود بڑی خبر تھی اُس پر بی جی کا غصّہ پورے اسکول کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، کلرک، چپڑاسی سب آگے بڑھ بڑھ کر بی جی کو اس طرح صفائی دے رہے تھے جیسے سب کے سب مجرم ہوں۔ اتفاق سے اُس روز خوف کے باعث مذکورہ لڑکا اسکول نہ آیا تھا ورنہ بی جی اُس کے والدین کی طلبی، ڈانٹ ڈپٹ اور معافی سے کم پر قطعی راضی نہ ہوتیں۔

ملازم کے ساتھ اسکول جانے کا سلسلہ تیسری جماعت تک جاری رہا جس کے بعد ہم گاؤں کے دیگر بچوں کے ہمراہ اسکول جانے لگے۔ واپسی پر بی جی کے گھر مختلف دوستوں کے ساتھ ٹھہرنا لازمی تھا جہاں ہمارے ساتھ دوستوں کی خاطر مدارات اُسی طرح کی جاتی جس طرح ہماری ہوا کرتی تھی۔ سال چھ مہینے تک دوست اور ہم جماعت یہ کہہ کر ساتھ چھوڑ گئے کہ گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے جس کے باعث گھر والے ناراض ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری پوری دوپہر بی جی کے گھر گزرتی۔

بی جی باقاعدگی سے ہمارے ہاتھ منہ دھلانے، کھانا کھلانے اور کچھ دیر سُلانے کے بعد بستہ کھول کر ہمارا ہوم ورک چیک کرتیں اور اکثر اپنے سامنے بیٹھا کر باری، باری اپنی لڑکیوں کو بلا کر ہماری مدد کی تاکید کیا کرتیں۔ شام کے وقت کوئی نہ کوئی گھوڑا تانگہ، بیل گاڑی ہمارے گاؤں کی جانب آتی تو بی جی تاکید کر کے ہمیں اُس کے ہمراہ گاؤں کے لیے روانہ کرتیں۔ جس دن کوئی گھوڑا تانگہ یا بیل گاڑی دستیاب نہ ہوتی اُس روز بی جی خود ہمیں لے کر ہمارے گاؤں کی جانب چل پڑتیں۔ کبھی درمیان میں گھر کا کوئی فرد یا ملازم ہمیں لینے آ جاتا، کبھی بی جی ہمیں خود چھوڑ کر جاتیں۔

بی جی! صاحبِ حیثیت تھیں نہ غریب، والدین اور مرحوم شوہر کی طرف سے ترکہ میں ملنے والی زمین بٹائی پر دے کر صابر وشاکر سفید پوشی کا بھرم خوش اسلوبی سے رکھے ہوئے تھیں۔ بی جی پیر تھیں، صوفی نہ ولی، وید تھیں، حکیم نہ ڈاکٹر اس کے باوجود گاؤں کی ہر عمر کی خواتین کو کسی بھی طرح کی مشکل، پریشانی یا اُلجھن کا سامنا ہوتا تو سیدھی بی جی کے گھر کا رُخ کرتیں۔ والدہ کے انتقال اور اوپر تلے کی دونوں لڑکیوں کی شادی کے بعد بی جی پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ پو پھٹنے سے لے کر رات کی سیاہی تک اُن کے گھر خواتین کا جھمیلہ رہا کرتا۔ قریشئے کا، کام کپڑے کی کٹائی، سلائی، رنگائی حتیٰ کہ سوئیاں، بڑیاں، اچار اور گائے، بھینس، بکری کی بیماری پر بی جی سے مشاورت کرنا گاؤں کی خواتین کا معمول تھا۔ بی جی ہر کسی کو اُتنی توجہ اور دھیان سے سُنتی جس قدر آنے والی خاتون توقع لے کر آتی۔ شرط صرف یہ تھی کہ اُن کے چہیتے یعنی ہمارے لیے پیار محبت اور تعریف کے چند بول ضرور بولے جائیں اور اگر اتفاق سے کوئی ہمارے لئے کھانے پینے یا کھیلنے کی کوئی چیز لے آتی تو بی جی کا بس نہ چلتا کہ بی جی اُسے سر پہ بٹھا لیتیں۔

ٹھہریے! ایک دور بی جی پر ایسا بھی آیا جب انہوں نے گاؤں کی تمام حاجت مند خواتین سے منہ موڑ کر صرف ایک ضرورت مند کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ جس طرح آج کل سیلاب، زلزلے اور طرح طرح کے وائرس کی بابت لوگ باگ اپنے فہم کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے اور کسی خاص ملک، قوم یا سپر پاور کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، اُس زمانے میں بھی پھیلنے والی چیچک، ہیضہ اور پلیگ کی وبا کو انگریز حکومت کی کارستانی ٹھہرایا جاتا تھا۔ طرح طرح کی ضعیف الاعتقادی بھی سننے کو آتی تھی۔ کوئی کہتا یہ وبائیں بھیڑ، بکری، کتا یا بلی وغیرہ کا روپ دھار کر گھروں میں گُھستے اور پٹاپٹ اُس گھر کے مکینوں کو لقمہ اجل بنا کر دوسرے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ کسی کے خیال میں انگریز سرکار حد سے بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے یہ حربے اختیار کرتی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ یہ عمل مخالفین کی آبادیاں کم کرنے کے لیے آزمایا جاتا ہے۔

والد صاحب کے علاج اور والدہ کی احتیاط کے باوجود ہماری چیچک کسی طرح ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ پہلے پہل بی جی روز کے روز صبح آ کر شام تک ہمارے پاس رہتیں اور ہر طرح سے ہماری دیکھ بھال کیا کرتیں۔ یہ سلسلہ ایک ہفتے تک جاری رہا جس کے بعد بی جی نے اپنے گھر جانا اور وہاں کی خیر خبر تک لینا چھوڑ دیا۔ بی جی کے حکم پر والد صاحب کا ولایتی علاج بند کر کے خاص قسم کی سوکھی لکڑیوں کا گنڈا بنا کر ہمارے گلے میں ڈالا گیا اُس کے بعد مٹی کے نئے نکور برتن میں خاکسیر کا پانی وقفے وقفے سے پلایا جاتا اور اُس کے بعد منقّہ کھلائی جاتی۔ سر کی مالش پیروں کے تلوؤں کی سہلائی اور طرح طرح کی احتیاط اُس وقت تک جاری رہی جب تک ہم مکمل صحت یاب نہ ہوگئے۔ اس

سارے عمل میں اہم بات یہ ہے کہ ہماری والدہ بھی بیماری کے دوران ہر وقت ہمارے قریب رہا کرتیں مگر بی جی نے اپنا بستر ہمارے پلنگ کے ساتھ مستقل طور سے زمین پر لگا لیا تھا۔ جب بھی کوئی شخص بی جی سے آرام کرنے اور اپنے گھر کی خیر خبر لینے کی درخواست کرتا تو بی جی کا ایک ہی جواب ہوتا ''میں تو تب ہی یہاں سے ہلوں گی جب میرا بچہ صحت یاب ہو جائے گا''۔

ہمارے ٹھیک ہونے کے بعد جس قدر شکر، نذر نیاز اور خیرات صدقات بی جی نے دیئے شاید ہی کسی اور نے کئے ہوں۔ گھر والے اکثر بی جی کی قربانی اور ہم سے اُن کی محبت کی مثال یہ کہہ کر دیا کرتے ''بی جی تو پھر بی جی ہیں، اسے دیکھو ماں باپ کے ہوتے ہوئے نیند اور بیماری میں صرف بی جی کو ہی پکارتا ہے''۔

ہر چند ہمارے گھر میں اوپر والے کا دیا بہت کچھ تھا مگر بی جی کے گھر میں دودھ، دہی، گھی، شکر، گڑ، گنا، اچار، پھل اور مٹھائی کا جب بھی گزر ہوتا سب سے پہلے اُس میں سے ہمارا حصہ نکالا جاتا اور گاؤں کے اکلوتے حلوائی ''گھنٹے والے'' سے ہماری پسند کی خالص کھوئے والی آدھ پاؤ برفی بی جی کے نعمت خانے میں اس اہتمام سے رکھی جاتی کہ اُن کی اپنی اولاد کو اُسے چکھنے یا ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ہوتی۔

لاڈ پیار تو بی جی شروع دن سے ہمارے ساتھ اپنی اولاد سے بڑھ کر کیا کرتیں مگر بیماری کے بعد اُن کے برتاؤ میں اور شدت آ گئی تھی۔ ہر روز اسکول سے واپسی پر ہم اپنی تختی ایک طرف اور بستہ دوسری طرف اچھال کر جوتوں سمیت بی جی کے باورچی خانے میں جا گھستے۔ بی جی ہمیں کچھ کہنے کے بجائے اپنی بیٹی کو ڈانٹ کر بلاتیں اور کہتیں ''بھائی کے لئے رکھی چیز دیتی کیوں نہیں'' جواب میں بی جی کی بیٹی کہتی ''اسی کا، کام تو کر رہی ہوں'' مراد ہماری تختی پوتنا یا لکھنا ہوتا۔ بی جی ترکی بہ ترکی میں اُس بیچاری کو شاباش دینے کے بجائے ڈانٹ پلا کر کہتیں ''کر رہی ہے تو کونسا احسان ہے، بہنیں تو بھائیوں کے لیے نجانے کتنی قربانیاں دیتی ہیں، یہ تو ویسے بھی تیرا چھوٹا بھائی ہے'' یہ کہتے ہوئے بی جی گود میں سمیٹ کر ہمارے موٹے موٹے گالوں کو چوم کر نہال ہو جاتیں۔

گاؤں کی زندگی سادہ، سچی اور ضروریات مختصر ہوا کرتیں ہیں۔ اس کے باوجود کچھ دنوں سے گاؤں میں عجب طرح کا بدلاؤ، بے چینی اور خوف در آیا تھا۔ گھروں، دکانوں اور چوپالوں پر لوگوں کی گفتگو میں نئے نئے موضوعات اور فکر مندی کا پہلو نمایاں ہونے لگا تھا۔ باوجود اس کے بی جی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی، جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم ہی رکھ پائی تھی کہ والد صاحب اور گاؤں کی دیگر بزرگوں کے اصرار پر بی جی نے قریب کے گاؤں میں ایک پڑھے لکھے گھرانے کے لڑکے سے اُس کا رشتہ طے کر دیا۔ شادی کچھ دنوں بعد طے پائی تھی مگر حالات جس تیزی سے رُخ بدل رہے تھے اُسے دیکھتے ہوئے والد صاحب نے فوری طور پر بیٹی کی رُخصتی کرنے کا کہا۔ بی جی والد صاحب کو بڑے بھائی سے زیادہ باپ کا درجہ دیا کرتی تھیں۔ فوری طور پر ''جی بھائی صاحب'' کہہ کر ہمارا ہاتھ تھاما اور ملازم کو تانگہ لانے کا حکم دیا۔ حالات کی سنگینی کے باعث والد صاحب نے ہماری والدہ کو بھی ساتھ کرتے ہوئے ملازم کو پہلی بار اپنی اکلوتی بندوق تھماتے ہوئے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔

آپ نے دولہا کی جانب سے شہہ بالا اکثر دیکھا ہوگا! دلہن کی جانب سے ہم پہلے شخص تھے جسے شہہ بالے کا درجہ دیا گیا۔ دولہا میاں والدین کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھے لہٰذا اُن کے گھر میں دُور، دُور تک شہہ بالے کا کوئی اُمیدوار نہ تھا۔ اس سے قبل شادیاں ہمارے بھائی بہنوں کی بھی ہوئی تھیں اور بی جی کی دونوں بڑی لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی بھی ہمیں خواب کی طرح یاد تھی۔ اس شادی میں تو ہماری خاطر دولہا سے بڑھ کر ہو رہی تھی۔ بارات والے دن طرح طرح کے کھانے اور مٹھائی ہماری خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے کافی تھے۔ اضافی طور پر شہہ بالا وہ بھی دوہرا یعنی ہم دلہن کے پاس جائیں تو اُس کے پہلو میں سب سے آگے ہمیں جگہ دی جائے، دولہا کے قریب ہوں تو سب کی توجہ کا مرکز ٹھہریں۔ غرض اس شادی میں ہماری حیثیت بہت ہی خاص مہمان کی تھی۔ اُس روز جس قدر کھانے، مٹھائی اور پکوان ہم نے دیکھے اور کھائے اس سے قبل کبھی دیکھے نہ کھائے تھے اور نہ بیک وقت ہمارے حصے میں اتنے ڈھیر سارے پیسے آئے تھے جتنے اُس روز ہماری جیبوں میں ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔

اکلوتی اور آخری بیٹی کی جدائی اور بی جی کا تنہا رہ جانا بجائے خود بڑا صدمہ تھا مگر بی جی نے جس طرح مردانہ وار حالات کا مقابلہ کر کے زندگی کا رخ موڑا تھا اُسی طرح بہادری سے اس صدمے کو بھی سہہ کر لوگوں کو حیران کر دیا۔ اب اُن کی توجہ کا مرکز صرف ہماری ذات تھی۔ جب کوئی بی جی کی تنہائی کا ذکر کرتا تو وہ ہمیں گود میں بھرتے ہوئے کہتیں ''تنہا ہوں میرے دشمن، میں کاہے کو تنہا ہونے لگی، رب سلامت رکھے میرے بیٹے کو''۔

گاؤں کی زندگی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ پُر اسرار اور غیر محفوظ ہو رہی تھی۔ گزرنے والا ایک ایک لمحہ اپنے اندر ایک نئی کہانی، ایک نیا خوف، ایک نیا اندیشہ لیے آتا جس نے گاؤں والوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ کچھ لوگ حالات کا رخ بدلنے کے لیے پُرعزم تھے، کچھ لوگ مقابلے کی تیاری کر رہے تھے اور کچھ حالات کو اپنی مرضی کا رخ دے کر ایک نیا کھیل کھیلنے کے خواہش مند تھے۔ زندگی ایک طرح سے ٹھہر گئی تھی۔ کاروبار ٹھپ اور تعلیمی ادارے سنسان ہو رہے تھے۔ ابتداء میں جو لوگ اپنی جائیداد، مال و دولت کے لیے فکر مند تھے اب اپنی آبرو اور جان کو لاحق خطرات سے دوچار تھے۔ کچھ لوگوں نے رات کی تاریکی میں اونے پونے اپنے مال مویشی اور گھر بار کا سودا بھی کر لیا تھا۔ بی جی نے جب والد صاحب کے منہ سے اس طرح کے خیالات سُنے تو وہ ایک دم سے آگ بگولہ ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ پہلی بار! پہلی بار بی جی نے والد صاحب کے سامنے، زمین پر لاٹھی مارتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ''کسی میں جرأت ہے جو

میرے بھائی یا اس کے خاندان کی جانب میلی آنکھ سے دیکھے!''

دوسری صبح ہم لوگ سو کر اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے تمام افراد ضروری سامان اکٹھا کرنے اور باندھنے میں مصروف ہیں۔ اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو سے جو سُن گُن مل سکی وہ یہ تھی کہ حالات کی سنگینی کو سامنے رکھتے ہوئے والد صاحب اور ہمارے علاوہ گھر کے تمام افراد محفوظ علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ والد صاحب اپنے مریضوں اور ہمیں بی جی کے سبب موجودہ قیام گاہ میں رہنا تھا۔ باری، باری گاؤں کے بڑے بوڑھے والد صاحب کو اپنا فیصلہ بدلنے اور بھرپور اخلاقی امداد مہیا کرنے کا یقین دلاتے جواب میں والد صاحب اس سارے عمل کو عارضی یا حفاظتی اقدام کہہ کر گاؤں والوں کا شکریہ ادا کر کے اُنہیں اطمینان دلانے کی کوشش کرتے۔ یہ ایسا عمل تھا جو ہم بچوں کے ساتھ بڑوں کے لیے شاید زندگی کا پہلا اور انوکھا تجربہ کہا جا سکتا تھا۔ اس تجربے کے دوران جس طرح کے جذباتی مناظر دیکھنے اور سننے میں آئے آج کی فلم اور ڈرامے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں دکھایا جاتا۔ دکھایا بھی کیسے جا سکتا ہے حقیقت اور افسانے میں کچھ فرق تو بہر حال ہونا ہی چاہیے۔

اہلِ خانہ سے بچھڑنے کے بعد ہمارے دل میں کسی طرح کا ملال، افسوس یا خوف ہرگز پیدا نہ ہوا تھا۔ ہماری تو ایک طرح سے عید ہو گئی تھی۔ گھر والوں کی موجودگی میں تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ اور پڑھنے پڑھانے کی تاکید کا سلسلہ سرے سے ختم ہو گیا تھا۔ اب سارا دن بی جی کا پلّو پکڑے گاؤں کے گلی اور چباروں کی سیر ہوا کرتی۔ جو سراسیمگی اور خوف گھر والوں کے جانے سے پہلے گاؤں کی گلی کوچوں میں پھیل چکا تھا وہ کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ چور اُچکّوں ،اٹھائی گیروں، بہروپیوں اور سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی بن آئی تھی۔

اس روز شام سے ہی گاؤں میں ہُو کا عالم تھا۔ آسمان پر ابابیلوں کا راج تھا۔ امن کے نمائندہ طوطے، بلبل، کبوتر اور فاختائیں نجانے کہاں گُم ہو گئے تھے ایسا لگتا تھا کہ سارے کا سارا گاؤں گھروں میں دبک کر بیٹھ گیا ہے یا کہیں ہجرت کر گیا ہے۔ قتل و غارت گری کی اکا دُکا واردات کا سلسلہ اب شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کلینک سے واپسی پر ایک راہگیر سے والد صاحب نے اس ویرانی کا سبب دریافت کیا تو اُس نے بتلایا کہ آج رات وہ اہم اعلان ہونے والا ہے جس کے برسوں سے چرچے تھے۔ تمام لوگ نمبردار کی حویلی میں اکٹھے ہو کر اس اہم واقعے کی نسبت صلاح مشورہ اور تیاری میں مصروف ہیں۔

والد صاحب عموماً اس طرح کے معاملات سے الگ تھلگ دیکھے گئے ہیں، اُس روز خدا معلوم اُن کے جی میں کیا آئی کہ قدم خود بہ خود نمبردار کی حویلی کی جانب بڑھنے لگے۔ حویلی میں موجود لوگوں نے والد صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے مصافحہ اور بغل گیر ہو کر نمایاں مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ نمبردار نے والد صاحب کو بتلایا کہ اُس نے اپنا ایک آدمی انہیں بلانے کی غرض سے کلینک کی جانب روانہ کیا ہے۔

اس سے قبل ہم گاؤں کے گھروں اور چوپالوں کی محفلوں و مجلسوں میں بڑے بوڑھوں کے ساتھ شرکت کر چکے تھے۔ نمبردار کے گھر میں ہونے والی آج کی محفل کا مزاج نہایت سنجیدہ بلکہ افسردہ تھا۔ چند روز قبل گاؤں کی اکثریتی برادری کے لوگ جس قدر پُر عزم اور پُر جوش تھے آج وہی لوگ اُس سے بھی زیادہ مایوس اور فکرمند دکھائی دیتے تھے۔ آج سے قبل جو لوگ اقلیتی برادری کی عزت، آبرو اور جان و مال کو اپنی عزت و آبرو اور جان و مال قرار دے کر اُس کی حفاظت کا دم بھرتے تھے آج وہی لوگ دل گرفتگی اور شکستگی کے عالم میں اقلیتی برادری کو ہجرت کے مشورے دے رہے تھے۔ وہ لوگ بڑی عاجزی، انکساری اور رقّت کے ساتھ والد صاحب اور اُن کے گرد بیٹھے لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کر رہے تھے کہ آپ لوگ جلد سے جلد محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اکثریت و اقلیت کی بحث و تکرار کب تک جاری رہی اور اس نے کیا رُخ اختیار کیا، ہم تو نیند کے غلبے کے باعث والد صاحب کی گود میں سر رکھ کر کب کے سو چکے تھے۔

دوسری صبح خلافِ توقع والد صاحب اور ملازم نے منہ اندھیرے اٹھا کر جلدی جلدی ہمارا ہاتھ منہ دھلا اور کپڑے بدلا کر چلنے کو کہا۔ ہمارے بچگانہ سوالوں پر والد صاحب نے صرف اتنا جواب دیا کہ تمہاری والدہ تمہیں یاد کر رہی ہیں اس لیے ہم لوگ اُن کے پاس جا رہے ہیں۔ ''اور بی جی؟'' بی جی کے سوال پر والد صاحب نے اِدھر اُدھر سر گھما کر ہوں، ہاں کی اور آگے کی جانب بڑھ گئے۔ ملازم نے دروازے کے آگے تانگہ لگا کر والد صاحب کو اگلی نشست اور اُن کی گود میں ہمیں بٹھا کر دو بندوق بردار نوجوانوں کو پچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر کی مسافت کے بعد ہمارا تانگہ بی جی کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

اتنی صبح والد صاحب کو اچانک اپنے گھر کے سامنے دیکھ کر بی جی کے منہ سے بے ساختہ ''ہائے میں مر جاؤں، سب خیرت تو ہے'' والد صاحب نے بی جی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کن سنی کے انداز میں اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی تو بی جی کے اوپر ایک طرح سے غشی طاری ہو گئی۔ اُن کی گھُٹی گھُٹی چیخوں نے ہمارا دل بھی اُداس کر دیا۔ ہمیشہ چاق و چوبند اور ہشاش بشاش نظر آنے والی بی جی ایک ہی پل میں سینکڑوں برس پرانی کہانیوں کا کردار نظر آنے لگیں۔

اس سے قبل بڑے سے بڑے امتحان کے موقع پر ہم نے بی جی کو بہت ہمت اور استقلال کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ بی جی کا یہ روپ ہمارے لئے قطعی اجنبی اور ناپسندیدہ تھا۔ آگے بڑھ کر ہم نے بی جی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے لاڈ سے اُنہیں منانے اور اُن کے رونے کی وجہ دریافت کی تو بی جی نے ضبط کے تمام بندھن توڑ کر آہ و بکا شروع کر دی۔ کبھی وہ سینے پر دو ہتڑ مار کر روتیں، کبھی ہمیں سینے سے لگا کر ''ہائے میرے بچے، میری جان، تیرے بنا کیسے جیوں گی'' کہہ کر بین ڈالنا شروع کر دیتیں۔

''کیوں؟ آپ اکیلے کیوں رہوں گی، آپ ہمارے ساتھ چلوگی''

بی جی کے چہرے پر پیار کرتے ہوئے''میں بھی تو اپنی بی جی کے بغیر نہیں رہ سکتا'' والد صاحب کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ کر''ہیں نا!'' بجائے اس کے والد صاحب ہمیں تسلی دیتے، ہمارا حوصلہ بڑھاتے، انہوں نے جذبات سے عاری لہجے میں''چلو چلو، جلدی کرو'' کہہ کر ہمیں پریشان کر دیا۔''نہیں نہیں، میں اپنی بی جی کے بغیر نہیں جاؤں گا'' ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے'' کیسے نہیں جاؤ گے؟'' ایسا لگتا تھا کہ صدمے سے بی جی ہم باپ بیٹے کی گفتگو سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ والد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ اور کھینچا تانی سے وہ ایک دم ہوش میں آ گئیں''نہیں بھائی صاحب! زبردستی نہ کیجیے، یہ بہت معصوم، بہت چھوٹا ہے، بہت پیارا ہے'' والد صاحب نے بی جی کی خواہش پر ہمیں گود میں اٹھالیا۔

''بیٹا! ضد نہیں کرتے، بی جی ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں'' والد صاحب کے اس جملے پر ہم مچل گئے'' کیوں نہیں چل سکتیں؟'' بے بسی سے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے''اب میں تمہیں کیسے بتلاؤں؟'' زمین پر پیر مارتے ہوئے ''میں کچھ نہیں جانتا، بی جی نہیں جائیں گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا''۔

والد صاحب کی کیفیت دیدنی تھی۔غم، غصّہ اور جھنجھلاہٹ سے اُن کے چہرے کا رنگ کبھی سرخ کبھی کالا اور کبھی پیلا ہو رہا تھا۔انہوں نے ایک بار پھر ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے ملتجی نظروں سے بی جی کو دیکھا''اب تم ہی اسے سمجھا سکتی ہو'' غنودگی سے چونکتے ہوئے''میں؟ نہیں بھائی صاحب! میری ساری ہمت، ساری طاقت ختم ہو گئی ہے'' زمین پر ڈھیر بنے جسم نے بے بسی کا اعلان کیا تو والد صاحب ایک طرح سے حواس باختہ ہو گئے۔

''ابے نالائق! سمجھنے کی کوشش کر، تیری بی جی کا مذہب الگ اور ہمارا مذہب الگ ہے، وہ یہ ہے! ہم وہ ہیں! یہ اُن کو ماننے والی ہے! ہم اُن کے پیروکار ہیں! اب سمجھ آیا، تیری بی جی ہمارے ساتھ کیوں نہیں چل سکتی؟''

بچے تو ازل سے معصوم اور ناسمجھ ہوا کرتے ہیں۔شاید ابد تک رہیں گے، کُجا ایک لاڈ پیار کا مارا بچہ، اچانک اپنے اور اپنی بی جی کے درمیان کھڑی ہونے والی دیوار کی مار کیسے سہہ سکتا تھا!

اس کے بعد کیا ہوا، کیسے ہوا، کیونکر ہوا، اُس کی بابت ہم قطعی بے خبر اور لاعلم ہیں، ہونا بھی چاہیے! اُس روز کے بعد ہر صبح، ہر شام، ہر دن، ہر رات، ہر پل، ہر گھڑی بڑے بڑے ہوشمند ہمارے چہار جانب جس طرح ڈھونگ اور سوانگ رچائے ہوئے ہیں اُس کی موجودگی میں کسی معمولی ہوش والے کے لیے بھی سوچ، سمجھ کی بات کرنا، کارِدارد ہے!

سوال جہاں تک ہماری ذات کا ہے ہمارے لیے تو وثوق سے اب یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اُس روز کے بعد ہمارے ہوش وحواس بحال ہوئے بھی ہیں کہ نہیں؟ مگر ٹھہریے! ہم نے یہ کیا کہہ دیا، ہوش وحواس تو زندگی کی علامت ہے جبکہ ہمارا شمار تو کب کا مُردہ پرستوں میں ہو چکا ہے!!!

☆

بقیہ: بے لگام

خوبصورت سفید گھوڑے کے دائیں بائیں بھاگ رہی تھی گویا اس پر نظر رکھے ہو۔سفید گھوڑا اس کے قریب آتا تو رفتار تیز کر کے آگے نکل جاتی، اسے اپنے ساتھ نہ دوڑنے دیتی لیکن اپنی حدِ نظر کے دائرے میں رکھتی۔

سہ پہر سب تھک ہار کر اصطبل کی جانب لوٹے۔لوسی کو آج بہت مزہ آیا تھا۔اس نے اتر کر اس کی گردن تھپتھپائی اور ماتھے پر بوسہ دیا۔باقی گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھا تو آہستہ آہستہ خوبصورت سفید گھوڑا بھی باندھے جانے کے لئے آہستہ چالوں سے آگے بڑھ آیا۔ اسکی چال ہزیمت اور ٹوٹے دل کی چال تھی۔لوسی نے اس کی لگام تھامی، گردن کی مالش کی اور جا کر اس کے استھان پر کھونٹے سے باندھ دیا۔

اتوار چرچ، آرام اور دوسرے کاموں کے لئے مخصوص تھا۔آج ہفتہ تھا۔لوسی سو کر اٹھی تو اس کا دل تو دھاری دار جانور پر سواری کا تھا، مگر اسے اپنے سب گھوڑوں سے محبت تھی، اور وہ سب کو برابری کی ورزش کا موقع دینا چاہتی تھی۔حسبِ معمول سب گھوڑوں کو اصطبل سے باہر کرنے کے بعد اس نے خوبصورت سفید گھوڑے کی گردن پر مالش کی، اس کی ایال سنواری، زین کسی اور دلکی چال چلتی اصطبل سے باہر نکلی۔عموماً خوبصورت سفید گھوڑا، اصطبل سے باہر نکلتے ہی سرپٹ دوڑنے لگتا تھا، لوسی کو اپنا آپ سنبھالنا دشوار ہونے لگتا۔مگر آج اسکی چال میں وہ زندگی نہیں تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے فقط اپنا فرض نبھانے کو دوڑ رہا ہو۔دل نہ بھی چاہے تو بھی مالک کے حکم سے سرگردانی کہاں ممکن ہے۔خوراک چاہے گھانس پھونس ہی کیوں نہ ہو، پسینہ بہا کر کمانی پڑتی ہے۔خوبصورت سفید گھوڑا بھی بے مقصد ایسے ہے دوڑتا رہا۔لوسی کو آج تک ایڑ نہیں لگانی پڑی تھی۔لیکن آج ایڑ لگانے پر بھی اس کی چال میں وہ سبک رفتاری نہیں آئی۔۔جھنجلا کر لوسی نے ہلکے سے اس کی پشت پر چابک ماری۔چابک ویسے تو لوسی کے ہاتھ میں ہمیشہ رہتی لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے پچھلی بار کب کسی بھی گھوڑے پر اسے استعمال کیا تھا۔چابک کھا کر گھوڑا جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔اس نے یکلخت رفتار پکڑی، اب اسکی دوڑ میں ایک مقصد تھا۔منہ ہوا میں بلند کر کے اس نے تازہ ہوا سے اپنے پھیپھڑے بھر لئے اور ایک عزم کے ساتھ دوڑنے لگا۔کھائی والے موڑ پر گھوڑے خود بخود مڑ جاتے تھے، لوسی کو کبھی بائیں لگام کھینچنی نہیں پڑی۔آج جب لوسی کو لگا گھوڑا مڑ نہیں رہا تو اس نے پوری قوت سے لگام کھینچی لیکن گھوڑا اسی رفتار سے کھائی میں کود گیا۔ اپنی چیخ سے پہلے لوسی کی آخری سوچ یہی تھی کہ شاید اس نے لگام کھینچنے میں بہت دیر کر دی۔

''فن کی زندہ مثال''

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

ترے حسن کو یہ کمال ہے، مرے عشق کو یہ زوال ہے
کہاں جستجو کا رہا مزہ، نہ جواب ہے نہ سوال ہے

وہ جو چل رہے تھے کنارے تک وہ بھنور تمام ہی خشک ہیں
نہ کوئی اُتار چناب میں ، نہ کوئی ہوا کا اُچھال ہے

کبھی رو پڑا یہ دِل مرا کبھی آنکھ نم ہے مری ہوئی
یہ جو روشنی ہے جگہ جگہ، مرے خونِ دِل کا کمال ہے

کسی چہرے پر نہ ہنسی سجی، کسی آنکھ میں نہ خوشی بسی
نہ کسی کے گھر میں ہیں رونقیں، نہ کسی کے رُخ پہ جمال ہے

یہ اُسی کے بس میں دوستو کہ پہاڑ ریت میں اُڑ چلیں
یہی اُس کے فن کا کمال ہے، یہی اُس کا حُسنِ خیال ہے

مرے پیر کی ہے عجب ادا مرا وہ زہیر ہے دل رُبا
جو غزل میں دے گا وہ مشورہ، مرے فن کی زندہ مثال ہے

کرامت بخاری

(لاہور)

نہ آنسو رُکیں اور نہ برسات ٹھہرے
عجب زندگانی کے حالات ٹھہرے

یہی رات ہے جس میں آنا ہے اُنکو
اجل سے یہ کہہ دو بس اِک رات ٹھہرے

کبھی شوخ یادیں رُکیں میرے دل میں
کبھی تو محبت کی بارات ٹھہرے

ہوائیں جنہیں گنگناتی ہیں اکثر
مری آرزو کے وہ نغمات ٹھہرے

ہماری تو بس زندگانی کا حاصل
ملاقات کے چند لمحات ٹھہرے

ہماری شبِ ہجر کی بات چھوڑو
تُم اپنی سناؤ کہاں رات ٹھہرے

مسلسل حوادث سے دو چار ہے دل
نہ معلوم جا کر کہاں بات ٹھہرے

حیات رضوی امروہوی

(کراچی)

چارۂ دردِ لا دوا اسکے سوا نہ ہو سکا
جس دن جدا ہوئے تھے تم وہ دن جُدا نہ ہو سکا

گذری ہے اضطراب میں اپنے ہی پیچ وتاب میں
آئینۂ خیال بھی چہرہ نما نہ ہو سکا

کہنا تھا جو نہ کہہ سکا، اتنا وفورِ شوق تھا
حاملِ موت ہو کے بھی اپنی صدا نہ ہو سکا

لاکھ سکندری رہی، بوئے قلندری رہی
اوجِ قمر پہ جاکے میں گِل سے جُدا نہ ہو سکا

جادو بھری تھی ہر نظر، مجھ پہ ہے آج تک اثر
قرضِ نگاہِ مہوشاں مجھ سے ادا نہ ہو سکا

میں نے یہ کاوشِ ہنر، کوشش تو کی بہت مگر
تیری عطائے خاص کا شکر ادا نہ ہو سکا

مرحلۂ حیات میں، عالمِ بے ثبات میں
خود کو خدا سمجھ کے بھی انساں خدا نہ ہو سکا

تیرا حیات نیم جاں، یعنی قتیلِ دوستاں
صاحبِ شعر ہو تو ہو مردِ ذکا نہ ہو سکا

○

سجادمرزا

(گوجرانوالہ)

چلو کہ خود احتسابیوں کا ہر ایک رستہ اجال دیکھیں
لگا ہے ہم پر جو کوئی الزام ، شک تمہارا نکال دیکھیں

لئے ہیں ہم نے مزے بہتیرے جہان بانی کے اس جہاں میں
بھرا ہے ہم نے بس اپنا دامن ، ہمارا یہ بھی کمال دیکھیں

ہمارے رستے میں کوئی آیا تو اس کو ہم نے نہیں ہے چھوڑا
جو برسرِ اقتدار ہوتے ہیں ان کا جاہ و جلال دیکھیں

جو ہم سے کہتے ہیں چھوڑ دو تم یہ مسندِ اقتدارِ شاہی
بڑے ہی نادان ہیں،ان کے ہونٹوں پہ بچوں جیسا سوال دیکھیں

ہم اپنی ضد پر ہیں اڑنے والے،کسی کی سنتے نہ ہیں سناتے
اگر چہ رہتے ہیں ہم زمیں پر مگر ہیں اونچے خیال دیکھیں

بلا کشانِ رہِ محبت، محافظان وطن سلامت
سلگتے سینوں کا حال دیکھیں،تڑپتے ماؤں کے لال دیکھیں

یہ کیسا پیرایۂ غزل ہے کہ جس میں حسن و جمال عنقا!
ہم ایسے درویش لوگ سجاد کب ہیں حسنِ غزال دیکھیں

○

رومانہ رومؔی

(کراچی)

دلِ حزین کو محبت کا پاس رہتا ہے
اگرچہ دل تو ہمارا اُداس رہتا ہے

مجھے خبر ہے جہاں دھڑکنیں سنورتی ہیں
میں جانتی ہوں کہاں دل شناس رہتا ہے

اُسے میں چشمِ حقیقت سے دیکھ سکتی ہوں
مرے قریب مرا خوش لباس رہتا ہے

ہے اُس کا سایہ بھی وحشت نشاں زمانے میں
جہاں کہیں بھی یہ خوف و ہراس رہتا ہے

میں زندگی کے مناظر پہ جاں لُٹاتی ہوں
مگر مزاج سفر میں اُداس رہتا ہے

یہ کون ہے جو میرے ساتھ ساتھ ہے رومؔی
کوئی تو ہے جو پسِ التماس رہتا ہے

○

بشارت پرویز

(ڈنمارک)

چھن گیا دل کا سکوں اور اشک افشانی ملی
زندگی کی رہ گزر ہر ایک انجانی ملی!

بربطِ احساس کا ہر گیت زخمی ہو گیا!
تیری آنکھوں میں مجھے جس دن سے حیرانی ملی

قسمتِ ناشاد نے کچھ اور بزدل کر دیا
خواب تھا کتنا حسیں، تعبیر بے گانی ملی

کس لیے مغرور ہے اپنی جوانی پر کوئی
مجھ کو دنیا میں ملی جو چیز ہے فانی ملی

چھین کر پرویز کے دل کا سکوں پردیس میں
بھولنے والے تجھے کیا چیز لاثانی ملی

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

حیرت کا اِک سفر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو
ہجرت کا اِک حجر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

ہر سمت کا نظارہ، مری مرضی کا رہے
آسودہ سی نظر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

ایسا لگے کہ جیسے پہلی بار آئے ہوں
اِک اجنبی نگر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

خواہش کے پھول کھلتے رہیں گام گام پر
خوشبو میں ہی بسر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

ہوں گرد و پیش میں بھلے گُل پات ہی کھلے
منظر میں بام و دَر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

سائے سے جس کے ذہن کو آسودگی ملے
سوچوں کا وہ شجر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو

جو ہو نہیں پہ ہونے کا احساس ساتھ دے
کچھ ایسا ہم سفر ہو مرے ساتھ ساتھ ہو!

○

عرش صہبائی

(جموں کشمیر)

کون سا وہ زخمِ دل تھا جو تروتازہ نہ تھا
زندگی میں اتنے غم تھے جن کا اندازہ نہ تھا

ہم نکل سکتے بھی تو کیوں کر حصارِ ذات سے
صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

اتنی شدّت سے کبھی آیا نہ تھا اُس کا خیال
اس سے پہلے زخمِ دل اتنا تروتازہ نہ تھا

اُس کی آنکھوں سے نمایاں تھی محبت کی چمک
اُس کے چہرے پر نئی تہذیب کا غازہ نہ تھا

دُور کر دے گا زمانے سے مجھ میرا خلوص
مجھ کو اپنی اس صلاحیّت کا اندازہ نہ تھا

اس کی ہر اک سوچ میں ہے اک مسلسل انتشار
اِس طرح بکھرا ہوا اس دل کا شیرازہ نہ تھا

عرشؔ اُن کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

○

اسد بیگ

(راولپنڈی)

میری آنکھوں میں آ بسے شاید
خوابِ جاناں کے سلسلے شاید

شب کی بے چین آرزؤں سے
ملنے آئے ہیں رت جگے شاید

دل کی دھرتی ہے پیاس کی ماری
یاد کی پھر گھٹا اُٹھے شاید

شاخ جھومی ہے لے کے انگڑائی
پھول کوئی نیا کھلے شاید

رنگ ساون میں مسکراتے ہیں
خواب آنکھوں میں بس گئے شاید

میں محبت کا آسماں ہوں اسد
وہ ستارہ ہے آ ملے شاید

○

''چہارسُو''

خورشیدانوررضوی

(اسلام آباد)

دل پر کیا کیا چوٹیں کھائیں — ساری رام کہانی لکھی
دنیا کی عبرت کی خاطر — اپنی ہر نادانی لکھی
اپنی ہراک بات پہ صاحب! — دنیا کی حیرانی لکھی
اپنی موت پہ خود ہی رویا — اپنی نوحہ خوانی لکھی
وقت کو بہتا دریا لکھا — باقی شے فانی لکھی
علم کو ہے دوام بتایا — دولت آنی جانی لکھی
ہر وہ بات جو دیکھی کہہ دی — ہر وہ بات جو جانی لکھی
لکھنے کا انداز نیا ہے — گرچہ بات پُرانی لکھی
صرصر کی ہر چیرہ دستی — گلشن کی ویرانی لکھی
زرداروں کی تسمہ پائی — محنت کی ارزانی لکھی

اکرام تبسم

(لاہور)

وہ دِل جگر میں ہے لیکن مجھے مرا نہ لگے — کہوں گا سچ میں اگر اس کو یہ برا نہ لگے
ملے اُسے بھی کوئی اس کے جیسا ہرجائی — مگر خدا سے دعا سے کہ یہ دعا نہ لگے
جو چھوڑنا ہو کبھی تو اِس طرح چھوڑو — وہ کب گرا ہے نظر ہے اُسے پتہ نہ لگے
ہے زور اتنا کہ چھونا اسے محال ہوا — قریب اتنا کہ کوئی بھی فاصلہ نہ لگے
ہزار بار تبسم وہ بے رُخی سے ملے — مگر یوں ملنا اُس کا مجھے برا نہ لگے

اختر رضا سلیمی

(اسلام آباد)

میں اٹھ کے آیا جب آئندگاں کے پہلو سے — مہک رہا تھا مکاں رفتگاں کی خوشبو سے
فغاں کہ چاند ستارے اب اس سے عاجز ہیں — کبھی یہ شب چمک اٹھتی تھی ایک جگنو سے
ہمارے رونے سے تسکین کس کے دل کو ملی — یہ کس نے آگ بجھائی ہمارے آنسو سے
میں اک طویل سفر سے پلٹ کے آیا تو — نکل چکی تھی زمیں آسماں کے قابو سے
بس ایک دل سے علاقہ ہے میرے شعروں کو — انہیں نہ دائیں سے نسبت نہ بائیں بازو سے
صدائے ھُو نے مری راہ بارہا روکی — پلٹ رہا تھا میں جس دم مزارِ باہو سے
رضا یہ پختہ مکانوں میں رہنے والے لوگ — متاعِ خاک سے واقف نہ اس کی خوشبو سے

تصوراقبال

(اٹک)

نبض جب تیز تیز چلتی ہے زندگی رُخ کئی بدلتی ہے
ہر بلا میرے سر سے ٹلتی ہے دل سے جب بھی دعا نکلتی ہے
دل میں یاد اُس کی یوں مچلتی ہے لہر پانی میں جُوں اُچھلتی ہے
ٹوٹ کر میں نے اُس کو چاہا تھا بس مری اک یہ ہی غلطی ہے
ایک موسم سدا نہیں رہتا رُت خزاں کی بھی ساتھ چلتی ہے
رُخ سے پردہ ہٹا کے روزانہ ایک گھر سے پری نکلتی ہے
اس طرح آج دل جلا میرا رات بھر جیسے شمع جلتی ہے
جب دلوں میں محبت آ جائے برف نفرت کی تب پگھلتی ہے
یہ زمیں مجھ سے اور کیا چاہے پی کے میرا لہو یہ پلتی ہے

شائستہ سحر

(میرپورخاص، سندھ)

رقصِ وحشت ہنوز طاری ہے ہر گلی خوں کی ملمع کاری ہے
سنگ کوئی گراؤ شیشے پر زندگی پر جمود طاری ہے
بانٹ لیں آؤ درد کے لمحے ساتھیوں ! وقتِ غمگساری ہے
یوں تو اُجڑی ہے بارہا دھرتی مگر اب کہ یہ ضرب کاری ہے
بڑے دن سے اُداس ہے طبیعت شاید اندر بھی جنگ جاری ہے
قتلِ انساں ہے کہ نہیں تھمتا رقصِ ابلیس ہے کہ جاری ہے
چین پل بھر سحؔر نہیں آتا کیا کہوں کیسی بے قراری ہے

اخلاق عاطف

(سرگودھا)

حیرتوں کے رنگ ہر تصویر میں بھرتے ہوئے جا رہا ہے وقت، سب کو سرزنش کرتے ہوئے
جی رہا ہے، جس کے لہجے کی اماوس رات میں دل ہے نازاں، اُس رخِ مہتاب پر مرتے ہوئے
کیوں دیا تھا دل اُسے، جس کو نہ تھا یہ بھی شعور سوچ لینا چاہیے، شیشہ کہیں دھرتے ہوئے
ایک مدّت تک رہی ہے جن سے گہری دوستی شرم آتی ہے ہمیں، اُن کا گِلہ کرتے ہوئے
میری غربت کا تمسخر اب اُڑاتے ہیں وہی میں ہُوا قلاّش جن کی جھولیاں بھرتے ہوئے
جیت کے عادی مریضوں کو بھلا کیا علم ہو کتنا لُطف آتا ہے عاطفؔ، جان کر ہرتے ہوئے

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط......۹

کچھ پراسرار واقعات

دنیا کے ہر معاشرے، ہرقوم اور ادب میں پراسرار اور مافوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ انگریزی ادب تو اس سے پُر ہے اور اس صنف میں لکھنے والوں کو ایک خاص عزت اور مقام دیتا ہے۔ اردو میں اس صنف میں بہت ہی کم طبع آزمائی کی گئی ہے اور جو تھوڑا بہت لکھا گیا اسے سنجیدہ نہیں لیا گیا۔ بیگم عبدالقادر، ظفر عمر علیگ اور تیرتھ رام فیروز پوری نے تو زیادہ تر ترجمہ پر اکتفا کیا اور قصہء پارینہ ہوگئے مگر ماضی قریب میں ابن صفی کو بھی جن کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئیں ادب میں کوئی مقام نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس انگریزی میں سر آرتھر کانن ڈائل، آگسٹھا کرسٹی، برام اسٹوکر، رائڈر ہیگرڈ اور سب سے بڑھ کر ایڈگر ایلن پو کو قابل رشک مقام عطا کیا گیا۔ یہ بات طے ہے کہ ان واقعات کی اپنی اہمیت ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ قدرت اللہ شہاب نے اپنی معرکتہ الآرا آپ بیتی ''شہاب نامہ'' میں بھی ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔

ایسے ہی کچھ واقعات جو میرے بچپن میں ہوئے اور جن کا میرے ذہن نے اثر لیا، کا ذکر قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر یہ واقعات ایسے نہ ہوتے کہ پورا شہر یا انکے راوی خود اسکے شاہد نہ ہوں تو مجھے ان کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر ان میں سے کچھ واقعات کا تو میں خود شاہد ہوں۔

شہر میں خوف وہراس

یہ بھی ۱۹۵۶ یا ستاون ہی کا ذکر ہے۔ جیسا میں نے پہلے لکھا تھا ہمارے یہاں گھر کے تمام کام کاج کے لئے ایک ماڑواڑی ملازمہ رکھی گئی تھی۔ یہ لوگ چھپے ہوئے سرخ کپڑے پہنتے تھے، ناک اور کانوں میں بڑے بڑے بالے اور ہاتھوں میں کہنیوں تک ہاتھی دانت کے کڑے ہوتے تھے۔ ہم اس کو ''بڑی بی'' کہتے تھے۔ یہ بڑی دلیر تھی اور کسی چیز سے خوف نہیں کھاتی تھی۔ ایک شام میری اماں نے اسے بازار کچھ خریدنے کے لئے بھیجا مگر وہ جلد ہی خوف زدہ سی سودا خریدے بغیر واپس آ گئی اور اس نے کہا کہ شہر میں اعلان ہو رہا ہے کہ جنگل میں ''جناور'' یعنی جانور چھوٹ گیا ہے جو میر پور خاص کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں رہیں اور احتیاط کریں۔ ساری دکانیں جلدی جلدی بند ہو رہی ہیں۔ میری اماں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھیں اس لئے انہوں نے اسے ڈانٹا اور کہا نہ جانے تو کیا واہی تواہی بکتی ہے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد واقعی ہمارے محلے میں بھی ایک تانگہ جس پر لاؤڈ اسپیکر لگا تھا آیا اور اس نے باقاعدہ ڈپٹی کلکٹر کا نام لیکر کہا کہ کوئی جانور دیکھا گیا ہے جس سے لوگوں کی جانوں کو خطرہ ہے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ آج رات سب لوگ گھروں میں دروازے بند کر کے رہیں اور باہر نہ نکلیں۔ اسی کے ساتھ شہر میں افواہوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ عام طور پر جو منظر کھینچا گیا وہ بیحد دہشت ناک تھا اس کے مطابق ایک بن مانس نما انتہائی ہیبت ناک اور کیم شحیم جانور ہے جو سانگھڑ کے جنگلات سے نکل کر میر پور خاص کی جانب بڑھ رہا ہے۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس کی کمر پر ایک مضبوط اور بہت لمبا خمیدہ کانٹا ہے اور یہ اپنے سامنے آنے والے انسان کو اٹھا کر اس طرح کمر پر پھینکتا ہے کہ وہ سیدھا اس کانٹے میں پرو دیا جاتا ہے، جب وہ اس کانٹے میں ایک دو لوگوں کو پرو لیتا ہے تو جنگل کی جانب بھاگ کر گم ہو جاتا ہے۔ اس خبر نے لوگوں کو دہلا دیا اور شہر کی انتظامیہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ رات تو ایک عجب دہشت میں گذری مگر خوش قسمتی سے کوئی خطرناک واقعہ نہیں ہوا۔ مگر دوسری رات کی ابھی مکمل طور پر صبح بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہر میں شور مچ گیا کہ اس جانور نے ایک گھر میں گھس کر کسی لڑکی کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں ناکام ہوگیا۔ اب پورا شہر اس گھر کی طرف دوڑا۔ یہ گھر ایک طرح سے ریلوے محلے کا ہی حصہ تھا۔ ہمارے محلے کے سامنے ریلوے لائن پار کر کے ایک گراؤنڈ تھا جسے کالا گراؤنڈ کہتے تھے اسکے ایک سرے پر ''اجول جگت رام'' کی فیکٹری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ رہائشی کوارٹروں کی قطاریں تھیں۔ میں بھی اس جانب دوڑا۔ وہاں لوگوں کے ہجوم کے علاوہ پولس کی بھی ایک بھاری نفری موجود تھی اور علاقے کا SDM بھی وہاں موجود تھا۔ یہ بہت چھوٹا سا گھر تھا اور اسکے آنگن کی دیواریں بمشکل چھ فٹ تھیں۔ سارا کنبہ آنگن ہی میں سوتا تھا۔ اس لڑکی کے باپ کے مطابق صبح چار بجے کے قریب لڑکی چیخی تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بندر یا ریچھ اس لڑکی کو کھسوٹ رہا ہے۔ سب لوگ اٹھ گئے اور شور مچایا تو وہ جانور دیوار پھلانگ کر بھاگ گیا۔ میں نے خود اپنی آنکھ سے اس لڑکی کو دیکھا اور اسکے چہرے اور بازؤں پر پڑی خراشوں کو سرکاری عملے نے بھی دیکھ کر لکھت پڑھت کی۔ اس کے باپ نے بتایا کہ وہ جو جانور جو بھی ہے مگر اس کی کمر پر کوئی کانٹا نہیں ہے۔

اگلے کم از کم تین دن تک پورا شہر، رات تو رات دن کے وقت بھی شدید خوف میں مبتلا رہا۔ کوئی کہتا تھا کہ کسی مداری کا بندر یا ریچھ چھوٹ گیا ہے کوئی کہتا تھا کہ یہ عجیب وغریب مخلوق ہے جو اللہ کا قہر بن کر نازل ہوئی ہے۔ مگر اس لڑکی کے باپ کے علاوہ اس مخلوق کا کوئی اور عینی شاہد نہیں تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ہر چار چھ گھنٹے کے بعد، چاہے دن ہو یا رات شہر میں غلغلہ مچتا تھا کہ جانور آ گیا اور فلاں جگہ دیکھا گیا ہے۔ ہزاروں لوگ جوق در جوق لاٹھیاں بلم اور نہ جانے کیا کچھ لیکر

دوڑتے تھے، کئی دفعہ امّاں کے منع کرنے کے باوجود میں بھی ان میں شامل ہوا مگر جائے وقوع پر پہنچ کر کچھ نہیں ملتا تھا۔ آخر کار چار پانچ دن کے بعد حالات معمول پر آئے اور اس کہانی کا انجام ہوا مگر کسی کو آج بھی نہیں معلوم کہ اس کی حقیقت کیا تھی۔ میں اب بھی کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میرے خیال سے اب شہر میں ایسے کم لوگ ہوں گے جنہیں یہ واقع یاد ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے پورا شہر کئی دن افواہوں اور خوف و دہشت کی گرفت میں رہا۔

ریلوے پلیٹ فارم پر خوں ریزی

میرے خیال سے قارئین ۱۹۸۰ کی دہائی میں کراچی کے پلیٹ فارم پر ہتھوڑا گوروپ کی تباہی کو نہیں بھولے ہونگے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے شہر میں میرے سامنے بھی پیش آیا۔

یہ بھی بڑی حد تک اسی دور کا ذکر ہے۔ ان دنوں میری بڑی بہن سلطانہ آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہمارا گھر بالکل ریلوے پلیٹ فارم کے سامنے تھا اور ہمارے گھر اور پلیٹ فارم کے درمیان ریل گاڑی کی صرف ایک پٹڑی تھی۔ ہمارے گھر کو اس پٹڑی سے لوہے کا ایک جنگلہ جدا کرتا تھا۔ حقیقت میں ہمارا گھر اس پلیٹ فارم کے حیرت انگیز حد تک قریب تھا۔ گھر کی خاص عمارت کے بیرونی حصے میں لکڑی کی پٹیوں سے ایک قسم کا ٹیرلیس بنا ہوا تھا جو بہت ہوادار تھا اور گھر کے سامنے ایک بہت بڑا نیم کا درخت تھا۔ گرمیوں میں خواتین اس ٹیرلیس میں سوتی تھیں اور مرد بالکل باہر نیم کے نیچے سویا کرتے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی کہ اس دور میں میر پور خاص میں یہ رواج تھا کہ عام طور پر مرد حضرات گھر کے بالکل باہر کھلے آسمان کے نیچے سویا کرتے تھے۔ اس پلیٹ فارم سے آخری گاڑی حیدر آباد کے لئے رات ساڑھے دس بجے جاتی تھی اور اس کے بعد یہاں قسم قسم کے لوگ جن میں عجیب وغریب حلیہ میں ملبوس فقیر، خانہ بدوش، ملنگ اور بہروپئے شامل تھے، سونے کے لئے بستر لگاتے تھے۔

سلطانہ آپا ہمارے گھر میں اس سلسلے میں مشہور تھیں کہ وہ بہت ہی خوفناک اور پیچیدہ خواب دیکھتی تھیں اور کبھی تو انہیں دوسری رات بھی پہلی رات والا خواب نظر آتا تھا۔ کچھ خواب تو بہت ہی دہشت ناک ہوتے تھے۔ میری امّاں بہت ترقی پسند خیالات کی حامل تھیں اور کسی قسم کے توہمات پر یقین نہیں کرتی تھیں اس لئے جب میری بہن اپنا خواب سناتیں تو وہ انہیں ڈانٹ کر چپ کروا دیا کرتی تھیں۔ ایک دن وہ کہنے لگیں کہ رات کے وقت پلیٹ فارم پر ایک آدمی دوشالہ اوڑھے سفید گھوڑے پر سوار آتا ہے وہ بہت مبارک اور پرنور لگتا ہے اور ان فقیروں سے کہتا ہے کہ یہاں نہ سویا کرو اور تنبیہ کر کر کے آوٹر سگنل کی جانب چلا جاتا ہے۔ انکا دعوہ تھا کہ وہ یہ سب جاگتے ہوئے دیکھتی ہیں اور انکے بقول یہ پچھلی تین چار راتوں سے ہو رہا ہے۔ میری امّاں نے انہیں ٹال دیا کہ تم خواب دیکھ رہی ہوگی۔ مگر انہوں نے کہا کہ میں تو روز یہ دیکھتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے وہ ان لوگوں کو کسی خطرے سے آگاہ کر رہا ہو۔ مگر چونکہ وہ بعض دفعہ تسلسل کے ساتھ خواب دیکھتی تھیں اس لئے ہم نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

ایک رات ہم گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر شدید چیخ وپکار کی آوازوں سے ہماری نیند ٹوٹ گئی۔ دیکھا کہ اسٹیشن پر ایک طویل القامت گرانڈیل شخص جو سیاہ رنگ کا لمبا جبہ پہنے تھا، اسکی کمر کے اطراف زنجیریں لٹکی تھیں اور اسکے ہاتھ میں ایک بھاری لٹھ جسکا سرا بہت موٹا کدوّ کی طرح تھا بغیر کسی وجہ کے ان غریب لوگوں پر ٹوٹ پڑا ہے اور بے دردی سے انکے سروں اور جسم کے دوسرے حصوں پر لٹھ برسا رہا ہے۔ کچھ کو تو اس بے رحمی سے مارا تھا کہ انکی کھوپڑیاں کھل گئی تھیں اور وہ خون سے لت پت ہو کر زمین پر تڑپ رہے تھے۔ ایک عجب دہشت کا سماں تھا پورا ماحول آہ وبکا اور چیخوں سے کانپ رہا تھا۔ زخمی زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے ہر طرف خون کے دھبے اور چھینٹیں تھیں۔ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی جاگ گئے مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہاں جا کر اسے روکے، بلکہ ہم لوگ خوف زدہ ہو کر گھروں میں گھس گئے۔ ہمارا خوف تھا بھی صحیح کیونکہ ایک تو ہم اس سے صرف چند قدم ہی پر تھے دوسرے ہمارے پاس اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ تھا۔ امّاں چیخنے لگیں ''ارے پولس کو بلاؤ''۔ اسٹیشن پر کبھی کبھی رات کو ریلوے پولس گشت کرتی تھی مگر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی طریقہ تھا کہ فوری طور پر پولیس سے مدد طلب کی جاتی۔ یہ ہنگامہ اگرچہ آٹھ دس منٹ رہا مگر اس اثنا میں اس نے خون کے دریا بہا دئے اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کچھ بڑبڑاتا ہوا کسی طرف رم گیا۔ بعد میں پولس آئی اور کچھ فرسٹ ایڈ والے بھی آئے کچھ زخمی سر پر چوٹ کی وجہ سے بیہوش تھے انہیں کھاٹ پر ڈال کر سول ہسپتال لیجایا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کچھ جانبر نہ ہوسکے ہونگے۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کون تھا، اس نے اس قدر بیدردی سے معصوم اور بیگناہ لوگوں کو کیوں زخمی کیا یا اتنے شدید طور پر زخمیوں کا کیا حشر ہوا۔ اس کے بعد میں تو پھر کبھی باہر نیم کے نیچے نہیں سویا۔ مگر اس کے بعد ریلوے انتظامیہ نے اس بات کا انتظام کر دیا کہ رات کو ''واچ اینڈ وارڈ'' جو ایک قسم کی پولس ہوتی ہے وہاں مستقل گردش کرتی تھی۔

اچھو بھائی جان کی موت

اچھو بھائی جان میرے، بہت دور کے رشتہ دار تھے مگر چونکہ ہمارے خاندان میں بہت زیادہ باہمی محبت اور اتفاق تھا اس لئے انکا ہمارے یہاں بہت آنا جانا تھا۔ انکا نام تو دراصل ریاست یار خان تھا مگر ایک زمانے میں متحدہ ہندوستان کے صوبے یو پی میں مسلمانوں میں اس کا رواج تھا کہ پیار سے کچھ دوسرا نام بھی رکھا جاتا تھا اس لئے سبھی انکو اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ لکھنو میں میاں ٹھن، یا بنے میاں جیسے نام عام تھے۔ ہمارے کنبے کی ایک شاخ کا تعلق یو پی کے پٹھان قبیلے سے ہے۔ اچھو بھائی جان بھی اسی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں عام معلومات کے لئے یہ لکھنا ضروری ہے کے یو پی کے بعض اضلاع میں پٹھانوں کی بستیاں تھیں اور اگر چہ وقت کے ساتھ یہ لوگ مروجہ مقامی

تہذیب میں رنگ چکے تھے مگر انکو اپنے حسب نسب پر خاص فخر تھا (جوش ملیح آبادی اسکی ایک مثال ہیں) س میں رامپور، بلند شہر اور خرجہ کے پٹھان خاص شہرت رکھتے تھے۔ان میں سے بہت سے تو اب تک نام کے ساتھ یوسف زئی اور اورکزئی بھی لگاتے تھے۔محدود اور آپس کی شادیوں کی وجہ سے یہ اپنے قدو قامت اور رنگ وروپ میں بھی اپنی خاص شناخت رکھتے تھے۔اچھو بھائی جان بیحد خوبرو، قابل رشک صحت اور کسرتی جسم کے مالک تھے اور انہیں اتھلیٹک اور دوسرے کھیلوں میں بڑی مہارت حاصل تھی۔مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک دن وہ ہمارے ساتھ ریلوے کے منعقد کردہ کھیلوں کے مقابلے دیکھنے گئے۔جب اعلان ہوا کہ اگلا مقابلہ سائیکل ریس کا ہے اور یہ ''اوپن'' ہے یعنی ہر کوئی اس میں حصہ لے سکتا ہے تو جا کر یہ بھی اس میں شریک ہوگئے اور ریس کے خاتمے پر اول درجے کا کپ اٹھائے واپس آئے۔یہ کچھ ہی سال پہلے، جب میں ساتویں جماعت میں تھا، مراد آباد سے پاکستان آئے تھے۔انکا گھر شہر کی نیم کچی آبادی میں تھا جس کے صحن میں ایک گھنا آم کا درخت تھا۔انکے ساتھ انکی نانی بھی رہتی تھیں جو یوں تو میری والدہ سے عمر میں بہت بڑی تھیں مگر میری والدہ سے انکی بڑی دوستی تھی اس لئے وہ گاہے بگاہے میری امّاں سے ملنے ہمارے یہاں چلی آتی تھیں۔ایک دن وہ میری والدہ سے کہنے لگیں ''جعفری (میری امّاں کا نام تو جہاں آرا بیگم تھا مگر پیار سے سب انہیں جعفری کہتے تھے)۔۔ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی ہے۔کبھی کبھی میری رات کو آنکھ کھلتی ہے تو میں دیکھتی ہوں کہ ایک لڑکی اس کوٹھری سے نکلتی ہے، دبے پاؤں اچھو کی چار پائی کے پاس جا کر کچھ دیر اسکے پیروں کے پاس کھڑی رہتی ہے، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اسکے پیروں کو چھونے کی کوشش کرتی ہے مگر ٹھٹک کر پیچھے ہٹتی ہے اور واپس کوٹھری میں چلی جاتی ہے۔۔مگر کوٹھری میں تو کچھ بھی نہیں صرف کچھ کاٹھ کباڑ بھرا ہے'' میری امّاں نے حسب دستور انکی بات کو مزاق میں اڑا دیا اور کہا ''ارے ہٹو بھی۔۔یہ تمہاری نظر کا دھوکا ہوگا'' مگر انہوں نے کئی دفعہ میری والدہ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔اچھو بھائی جان کڑیل جوان تھے اور اب انکے والدین کو انکی شادی کی فکر تھی۔جلد ہی انکی شادی طے ہوگئی۔ایک دن انکی نانی ہمارے یہاں آئیں وہ کافی پریشان تھیں۔وہ میری امّاں کے ساتھ چوکی پر بیٹھ گئیں۔میں بھی قریب ہی زمین پر دری بچھائے اپنے کسی دوست کے ساتھ لوڈو کھیل رہا تھا۔مجھے انکی گفتگو اب بھی یاد ہے۔انہوں نے کہا ''جعفری۔۔مجھے رات ایک عجب خواب آیا۔میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی میرے خواب میں آئی ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہے تم لوگ اس کی شادی کر رہے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ اسکی شادی تو مجھ سے ہو چکی ہے۔اگر تم نے اسکی شادی کی تو اچھا نہیں ہوگا'' ایک تو میری امّاں ایسی کسی چیز پر یقین نہیں رکھتی تھیں پھر یہ نانی کافی بوڑھی تھیں۔اس لئے میری امّاں نے سوچا ہوگا کہ بڑھیا نہ جانے کیا اول فول خواب دیکھتی ہے اسلئے انہوں نے بڑی حد تک انہیں ڈانٹ دیا کہ تم نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ خواب دیکھتی ہو کیوں بچے کی زندگی خراب کرنا چاہتی ہو۔نانی نے یہ بات اچھو بھائی جان کے والد سے بھی کہی وہ رام پور کے لمبے تڑنگے پٹھان تھے انہوں نے اونچی آواز میں چند ترش جملے کہہ کر کہا کہ کر لے جسے کچھ کرنا ہے میں تو اپنے بیٹے کی شادی ایسی ہی دھوم دھام سے کرونگا۔

بہر حال انکی شادی ہوئی، اب مجھے اسقدر تفصیل تو یاد نہیں رہی کہ آیا وہ ولیمے کی رات تھی یا اسکے ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد کی رات، اس رات جب اچھو بھائی جان اپنے کمرے میں پہنچے تو دلہن کے پاس بیٹھتے ہی ان پر شدید مرگی کا دورہ پڑا وہ زمین پر گر پڑے ہاتھ پیر اینٹھ گئے، زبان دانتوں تلے بھنچ گئی اور سانس لینا مشکل ہوگیا نئی دلہن ہراساں چیختی ہوئی باہر نکلی۔فوراً ہسپتال لیجایا گیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کسی قسم کے ایسے ٹیسٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے کہ مکمل تفتیش ہوتی۔بہر حال دواؤں سے حالات قابو میں آگئے۔مگر کچھ دن بعد پھر ایسے ہی دورے پڑنے لگے۔کراچی میں کئی بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا، اب سر میں درد کے ساتھ بینائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔جلد ہی مکمل طور پر اندھے ہوگئے۔مرض تیزی سے بڑھتا گیا لوگوں سے انکی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔شاید ایک ہی سال شادی شدہ زندگی کا نصیب ہوا اور نئی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر اس سفر پر روانہ ہوئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ہمارے خاندان نے انکی جوان موت کا بہت اثر لیا اور آج بھی انکو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹری لحاظ سے یہ بات مجھ پر واضح ہے اور انکی بیماری کے زمانے میں ڈاکٹروں نے بھی اسکی تشخیص کر لی تھی کہ یہ دماغی سرطان (brain tumor) کا کیس تھا۔اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ برین ٹیومر کسی کو بھی کسی عمر میں بھی ہو سکتا ہے۔مگر اچھو بھائی جان کے سلسلے میں حالات کی جو کڑیاں تھیں وہ حیرتناک تھیں۔اگر یہ اتفاق تھا۔۔جو یقیناً تھا کہ میں ایک ڈاکٹر اور سائینسدان ہونے کی حیثیت سے اور کسی چیز کو نہیں مانتا تو یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ ایسا اتفاق خال خال ہی ہوتا ہے اور جن حالات میں یہ ہوا وہ یقیناً نہایت عجیب وغریب تھے۔انکے مرنے کے کئی سال بعد بھی انکی نانی ہمارے یہاں آکر یہی کہا کرتی تھیں ''جعفری۔۔دیکھا کمبخت لیکر ہی گئی''

شہیدوں کا قافلہ

میری والدہ کے ایک رشتہ کے بھائی صفات حسین پولس میں اعلی عہدے پر تعینات تھے۔میرے دل میں انکے لئے بڑی عزت ہے کہ وہ جب بھی سرکاری دورے پر میرپور خاص آتے تو اگر چہ انکا قیام دوسرے افسران کے ساتھ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہوتا تھا مگر وہ وہاں ٹھہرنے کے بجائے ہمارے معمولی گھر میں ٹھہرتے اور رات گذارتے۔صبح سرکاری جیپ انہیں لینے آ جاتی۔انکے آنے سے ہمارے گھر میں رونق ہو جاتی اور ہم بچوں کو یہ بہت اچھا لگتا۔پھر اپنی ملازمت کی وجہ سے انکے پاس ہمیشہ بڑے مزے مزے کے قصے ہوتے جو ہم ان سے ضد کر کے سنا کرتے تھے۔یوں تو انہوں نے ہمیں بہت

سے قصے سنائے مگر ایک قصہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا۔ پھر اس دن ماحول بھی ایسا تھا کہ اس نے اس قصے میں ایک خاص رنگ بھر دیا تھا۔ اس دن میر پور خاص میں گہری گھٹا چھائی تھی اور اسکے بعد بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ ماحول ایسا سرمئی سا ہو گیا کہ اول شام اندھیرا ہونے لگا اور ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ ہمارے گھر کے باہر نیم کا ایک بہت بڑا درخت تھا تیز ہوا سے اسکی شاخیں ہماری جافری سے ٹکرا کر دہشت ناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ اتنے میں میری امّاں چائے بنا لائیں۔ چائے کے ساتھ ہم بچوں نے اصرار کیا کہ ماموں کوئی واقعہ سنائیں۔ پہلے تو انہوں نے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر ہم نے جب ضد کی تو وہ کہنے لگے یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب وہ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کے ایک چھوٹے شہر ہردوئی میں تعینات تھے۔ وہاں یہ روائت مشہور تھی کہ جہاں اب پولس کا پریڈ گراؤنڈ ہے وہیں پر انگریز اور مسلمان جانباز سپاہیوں کے درمیان ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے دوران زبردست معرکہ ہوا تھا جس میں بیسیوں مسلمان شہید ہوئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کبھی کبھی سرخ آندھی چلتی ہے، ہر چیز دھندھ اور دھول میں چھپ جاتی ہے اور پھر شہیدوں کا قافلہ گذرتا ہے، سب اسکو دیکھتے ہیں اور بس پھر وہ قافلہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

کہنے لگے ایک شام وہ اپنے سپاہیوں کو پریڈ کروا رہے تھے کہ پہلے ہوا آہستہ آہستہ چلنی شروع ہوئی پھر ذرا تیز ہوئی ایسے کہ سیٹیاں سی بجنے لگیں پھر اچانک تھوڑی دیر کے لئے ہوا بالکل ساکت ہو گئی۔ فضا پر ایسا سکوت اور سناٹا طاری ہوا کہ دل میں ایک خوف کی لہر اٹھنے لگی۔ ایسا لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک دم تیز جھکڑ چلنے لگے، اتنے تیز کہ درخت جھک جھک جاتے تھے، گرد بھی اٹھی اور ماحول قرمزی ہو گیا آسمان پر جیسے خون کی سرخی چھا گئی۔ ہر شخص ساکت ہو کر ٹکٹکی باندھ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک شور سا اٹھا جو ہواؤں کے ساتھ مل کر عجیب تاثر دینے لگا۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ ہواؤں کا شور ہے یا اس میں انسانوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ بھی شامل ہے۔ پھر سب نے دیکھا کہ دور درختوں کے اوپر ایک بہت بڑی سبز چادر ایسی تنی ہوئی ہے جیسے اسے بہت سے آدمیوں نے پکڑ رکھا ہو یہ چادر دھول اور گرد کے طوفان کے ساتھ آہستہ آہستہ مشرق سے مغرب کی جانب جاتی ہوئی نظر آئی۔ پہلے یہ چادر ان سے ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ جیسے جیسے یہ انکے قریب آتی گئی شور اور جنگی تاشوں کی آوازیں بڑھتی گئیں۔ ان میں تلواروں کی جھنکار گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہنہناہٹ کی آوازیں اور زخمیوں کی آہ و بکا بھی شامل تھیں۔ آوازیں تو ایک پورے قافلے کی تھیں مگر نظر صرف چادر آ رہی تھی۔ آخر کار یہ چادر درختوں کے اوپر سے ہوتی ہوئی مغرب کی سمت افق میں گم ہو گئی۔ تمام دیکھنے والوں کو سکتا ہو گیا۔ ہر شخص حتٰی کہ انکے انگریز افسر بھی کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ انہوں نے کچھ سپاہیوں کو ان درختوں کی جانب دوڑایا جہاں چادر گم ہوئی تھی مگر چادر کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ انہوں نے پریڈ کو منسوخ کرنے کا حکم دیا اور سب نے اپنے گھر کی راہ لی۔ بعد میں کچھ پرانے افسروں نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہی وہ روائت ہے جس کے مطابق سالوں میں کبھی کبھی شہیدوں کا یہ قافلہ اس خونی دن کی یاد تازہ کرتا ہوا آنکھوں کے سامنے سے گذرتا ہے۔

ہم تو ہردوئی سے سینکڑوں میل دور میر پور خاص میں بیٹھے تھے مگر پھر بھی ہمیں بہت ڈر لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم بچوں کی ضد پر انہوں نے ہمیں مطمئن کرنے کے لئے یہ کہانی گڑھ کر سنائی تھی یا حقیقت میں یہ کوئی سچا واقعہ تھا مگر انکا انداز بیان اور اس شام کا تاثر میرے ذہن پر نقش ہو گیا ہے۔

خارش زدہ کتا اور ہمار پڑوس

میر پور خاص میں شام ہوتے ہی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ شہر میں بجلی بھی کہیں کہیں ہی تھی اور پھر سردیوں میں اندھیرا ہوتے ہی کہر کی دبیز چادر شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ میں چھوٹا تھا اور پانچویں جماعت میں تھا۔ ہمارا گھر جس محلے میں تھا وہاں ایک دوسرے سے جڑے گھروں کی دو قطاریں تھیں مگر ہمارا ایک چھوٹا سا بنگلہ نما مکان ان قطاروں سے ذرا الگ ایک بہت بڑے نیم کے درخت کے سائے میں واقع ہوا تھا۔ گھر کے سامنے بھی قطار سے سرس کے درخت لگے تھے۔ ہمارے گھر سے ایک دوسرا مکان جڑا تھا جو بالکل ہمارے گھر جیسا ہی تھا بس یہ فرق تھا کہ اسکا نقشہ ہمارے گھر سے الٹ تھا اور جہاں ہمارے گھر میں بجلی تھی اس گھر میں بجلی نہیں تھی۔ یوں تو پورے شہر ہی میں بہت زیادہ درخت تھے مگر ہمارا محلّہ خاص طور سے شہر میں اپنے گھنے اور اونچے درختوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ رات ہوتے ہی ان درختوں کے گہرے سائے، اندھیرا اور کہر مل کر ماحول کو عجیب ہیبت ناک بنا دیتے تھے۔ پھر جس شام تیز ہوا چلتی تو درختوں سے سیٹیاں بجنے کی آوازیں آنے لگتیں اور یوں لگتا تھا کہ بہت سی بلیاں ایک ساتھ بین کر کے رو رہی ہوں۔ میں ماحول سے بہت خوف زدہ ہو جاتا تھا اور اپنے منہ کو لحاف سے مکمل طور پر ڈھانپ نے کے باوجود مجھے اپنے جسم میں ایک کپکپی کا احساس ہوتا تھا۔

میرے والد سرکاری ملازمت کی وجہ سے پاکستان بننے سے کچھ عرصے پہلے ہی سے اس شہر میں تعنات تھے اس لئے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی ہم اسی میں رہتے رہے۔

مگر ہمارے پڑوس کا مکان مستقل مکینوں سے محروم رہا۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ پہلے اس میں ایک ہندو دیال سنگھ رہتے تھے جو نہایت شریف اور کم آمیز انسان تھے۔ انکا کنبہ راجپوتانے میں تھا اس لئے اکیلے تھے اور پھر نوکری کے سلسلے میں وہ کئی کئی دن باہر رہتے تھے۔ میری والدہ اپنے خاص لہجے میں کبھی کبھی کہتی تھیں ''اللہ مارا کیسا منحوس مکان ہے کہ کئی کئی دن اس میں مغرب کے وقت بھی چراغ نہیں جلتا''۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد اس میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی افسر رہائش پذیر ہوئے مگر پھر کشمیر میں جنگ شروع ہونے کے بعد وہ بھی وطن چلے گئے۔ غرض اس کے بعد بھی اس مکان میں کوئی دو سال سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔

میرپورخاص تھر کے ریگستان کے قریب ہے اور اس زمانے میں یہاں تھری اور ماڑواڑی لوگوں کی بہتات تھی۔ان میں ایک خاص تو ہم پرستی تھی۔ ہماری اپنی ملازمہ ایک تھری عورت تھی وہ ایک لمبا گھونگٹ نکال کر کام کرتی تھی۔ خاص طور سے وہ اس گھر سے بہت خوف کھاتی تھی اور کوشش کے باوجود مغرب کے بعد اس گھر کے پاس سے نہیں گذرتی تھی کیونکہ اس گھر کی بغلی دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا جسکی شاخیں اس کے آدھے آنگن پر سایہ فگن رہتیں۔اس کو یقین تھا کہ برگد کے درخت پر ہمیشہ کسی آسیب کا سایہ ہو تا ہے۔ادھر یہ گھر پھر کچھ مہینوں سے خالی تھا اور ہم نے نوٹ کیا تھا کہ اس کی دیوار پر ہر شام مغرب سے ذرا پہلے ایک کوّا آ کر مستقل اپنی کریہہ آواز میں کائیں کائیں کیا کرتا ہے۔ ہمارے یہاں اوپر کا کام کرنے والے لڑکے کی یہ ڈیوٹی تھی کہ اسے کنکر یا پتھر مار کر اڑائے۔

خدا خدا کر کے اس گھر میں ایک بھرا پُرا کنبہ آیا۔ یہ سیالکوٹ کے پنجابی، ڈار صاحب تھے۔خوش مزاج اور اونچے اونچے قہقہے لگانے والے۔شلوار قمیض پر کوٹ پہنتے تھے اور اس پر ٹائی لگاتے تھے۔سر پر اونچا سنہری طرہ والا کلہ ہوتا تھا۔انکے کئی بچے تھے جو جلد ہی ہم سے گھل مل گئے۔شام کو ان کے لئے درخت کے نیچے ایک چار پائی پر بستر بچھتا اور وہ نیم دراز ہو کر اپنا تازہ کیا ہوا حقہ گڑ گڑاتے۔ہمیں بہت اچھا لگا۔کچھ دنوں کے لئے نحوست کے سائے دور ہو گئے۔کوے سے وہ بھی پریشان تھے انہوں نے دیکھا کہ اس کوے کا گھونسلہ اسی برگد پر ہے انہوں نے اس کا یہ علاج کیا کہ برگد کی شاخوں کو ایسا کٹوایا کہ بس چند ٹھنٹ ہی رہ گئے کوے کا گھونسلہ بھی اسی کی نظر ہو گیا۔اس سے انکے آنگن میں دھوپ بھی آنے لگی اور پھر اس کے بعد کوا کبھی نظر نہیں آیا۔

انکے کنبے کی وجہ سے ایک رونق کا سماں ہو گیا۔ادھر ہم بچوں کو کھیلنے کے لئے ساتھی مل گئے تھے اور رات کو میری والدہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب آنگن میں تخت پر بیٹھ کر اپنا پاندان کھولتیں تو انکی بیوی اور بڑی بیٹی بھی ہمارے یہاں آجاتیں۔وہ باہر بیٹھے میرے ابا جی کے ساتھ سیاست پر گفتگو کرتے اور آواز لگاتے بھابی جی مجھے بھی ایک پان بھجوادیں۔مگر یہ دن زیادہ نہیں رہے ایک دن انکی بیگم میری والدہ سے کہنے لگیں میری چھوٹی بچی جب پچھلے کمرے میں جاتی ہے اور اکیلی ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے۔میرے پوچھنے پر وہ بتاتی ہے کہ اس نے وہاں ایک کتا پالا ہوا ہے جس سے اسے بڑا پیار ہے۔مگر ہمیں تو کبھی کوئی کتا نظر نہیں آتا۔ وہ ہم سے ضد کر کے ''بھوں بھوں'' کے لئے روٹی بھی مانگ کر لے جاتی ہے۔وہ اس سے پریشان تھیں۔ملک صاحب نے اسے قہقہوں میں اڑا دیا اور کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر کچھ ہی دن بعد انکا بھی تبادلہ ہو گیا۔معلوم نہیں کیا وجہ تھی مگر اس کے کئی ماہ بعد تک یہ گھر خالی رہا۔گھر میں پھر اندھیروں کا راج ہو گیا اور برگد کے درخت پر نئی شاخیں نمودار ہوئیں اور ایک بار پھر اسکے پتے اس گھر کے آنگن پر اپنا سایہ ڈالنے لگے۔پھر وہی سناٹے، مہیب اندھیرا اور کہر۔

وہ رات کچھ زیادہ ہی تاریک تھی آسمان پر بادل گھرے تھے اور شام ہی سے وہی ہوا جس سے درختوں میں سیٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بارش پڑنے لگی اور بارش کے پہلے قطرے کے ساتھ ہی بجلی غائب ہو گئی۔اب کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لئے ہم سب لوگ جلد بستروں میں گھس گئے۔شاید رات کا پچھلا پہر تھا جب ہماری آنکھ ایک دلدوز لمبی اور ہوک نما چیخ سے کھلی پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر معلوم ہوا کوئی کتا ہے جو نہایت دلدوز آواز میں رو رہا ہے۔کم بخت ایسی لمبی لمبی اور دل ہلا دینے والی آواز میں رو رہا تھا کہ ہم بچوں کے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔میرے ابا نے ہاکی اٹھائی اور باہر نکلے۔ہمارے پڑوس کے مکان کے دروازے پر ایک خوفناک شکل، خارش زدہ کتا منہ اوپر اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا وہ بار بار اپنے دونوں پنجے آگے بڑھا کر تھوتنی زمین پر رگڑتا تھا۔ابا نے اسے ہاکی سے دھمکایا وہ بڑا ڈھیٹ تھا مگر میرے بڑے بھائی اور ابا آخر کار اسے دور تک بھگانے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے تو اسکے بعد دیر تک نیند نہیں آئی۔ کچھ دن تو سکون رہا مگر پھر کچھ دنوں کے بعد کسی کسی رات کو ہم لوگوں کی نیند ایک ایسی آواز سے ٹوٹ جاتی جیسے کوئی کتا بہت اذیت سے رو رہا ہو مگر کئی دفعہ باہر جانے کے بعد بھی ابا کو کوئی کتا نظر نہیں آتا۔ پھر بھی بار بار ایک درد بھری ہوک سنائی دیتی جو بہت لمبی ہوتی اور دیر تک فضا میں اپنی گونج چھوڑ جاتی۔پھر اس ہوک میں ایک اور آواز شامل ہو جاتی جیسے اس کتے کے ساتھ رونے میں کوئی دوسرا کتا بھی شامل ہو گیا ہو۔دیر تک یہ سلسلہ رہتا اور ماحول پر ایسی دہشت چھا جاتی کہ میری امّاں بے ساختہ آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دیتیں۔رات کی تاریکی اور سناٹے میں یہ آواز جسم میں خون منجمد کرنے کے لئے کافی ہوتی۔میرے ابا کہتے یہ کتے نہیں شاید گیدڑ ہیں۔یہ بھی پتا نہیں لگتا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔میرے ابا دوبارہ باہر جانے کی کوشش کرتے مگر امّاں انہیں باہر نہیں جانے دیتیں۔کبھی کبھی ایسا لگتا کہ یہ آوز ہمارے پڑوس کے خالی مکان سے آرہی ہے۔مگر پھر ہم خود ہی کہتے کہ خالی اور تالا لگے مکان میں کتے کہاں سے آگئے۔شاید ایسی ہی کسی رات اس آواز پر میرے بڑے بھائی نے، جو ہماری جنرل نالج میں اضافہ کرنے پر ہر وقت تیار رہتے تھے کہا کہ کتے کے کاٹنے پر انسان بھی ایسے ہی کتے کی آوازیں نکال نکال کر روتا ہے اور سننے والوں کے لئے یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ آیا یہ کتے کی آواز ہے یا انسان کی۔

چند دن بعد خوش قسمتی سے ہمارے پڑوس میں پھر ایک کنبہ آکر بس گیا یہ شوہر بیوی اور دو بچوں، ایک بیٹی جمیلہ اور اس کے چھوٹے بھائی ارشد پر مشتمل تھا۔ ہم سب اس گھر کے آباد ہونے پر بہت خوش ہوئے خاص طور سے میرے لئے خوشی کی یہ بات تھی کہ ارشد مجھ سے چند ہی سال چھوٹا تھا اب تو جیسے مجھے اپنا بھائی مل گیا ہو۔وہ اسکول میں مجھ سے چار سال پیچھے تھا اب ہم نہ صرف اسکول ساتھ جاتے تھے بلکہ دن کا زیادہ وقت ساتھ ہی گذارتے تھے۔ میں اسکے

ہوم ورک میں اسکی مدد کرتا تھا اور وہ شام کو کرکٹ میں بولنگ کر کے میری بیٹنگ بہتر کرنے میں میرا ساتھ دیتا تھا۔ انہی دنوں انکے یہاں بجلی بھی آ گئی اور میونسپل کمیٹی نے نئی سڑک کے لئے کئی درخت بھی کٹوا دئے۔ اس کے بعد نہ تو کتوں کے رونے کی آوازیں آئیں اور نہ ہی برگد پر کوئی کوا اپنی منحوس آواز میں کائیں کائیں کرتا نظر آیا۔ اسکے بعد ایک خوشگوار دور آیا۔ مکان کی نحوست بھی قصہء پارینہ ہو چکی تھی۔ کبھی ہمارے یہاں اور کبھی ہمارے پڑوس میں کسی نہ کسی بہانے ایک چھوٹی موٹی تقریب ہو جاتی۔ ہفتے میں دو تین دفعہ دونوں گھرانے کھانا بھی مل کر ساتھ ہی کھاتے۔ ارشد تو مجھ سے بہت ہی قریب ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ بھیا، اگر تم پڑھ نے کسی اور شہر میں چلے گئے تو میں یہاں اکیلا کیسے رہونگا۔ اور پھر ہوا بھی یہی کہ دو سال اس شہر کے کالج میں گذارنے کے بعد مجھے صوبے کے بڑے شہر کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا اور میں نے شہر چھوڑ دیا مگر میں سنیچر اتوار کو ضرور گھر آتا تھا اور اس دوران زیادہ وقت میرا ارشد کے ہی ساتھ گذرتا تھا۔

میں میڈیکل کالج کے دوسرے سال میں تھا کہ ایک دفعہ جمعہ کی شام جب میں گھر آیا تو مجھے محلے کے لڑکوں نے بتایا کہ انہوں نے نزدیکی گاؤں میں کرکٹ کا میچ رکھا ہے جو ہمیں سنیچر کو کھیلنا ہے۔ سندھ کے اس علاقے میں بارہ چودہ میل دور گاؤں بھی کافی دور سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں چھوٹی لائن کی گاڑی جاتی تھی۔ ہم دوسرے دن گاڑی پکڑ کر اس گاؤں پہنچے اور دن بھر میچ کھیلا۔ ارشد بھی ساتھ تھا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد ہم سب لڑکے واپس ریلوے اسٹیشن آ رہے تھے۔ کھیتوں سے گذرنا تھا۔ ابھی اچھی خاصی دھوپ باقی تھی۔ کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی۔ ہم سب میچ جیتنے کی وجہ سے اچھے موڈ میں تھے۔ ہنستے کھیلتے جا رہے تھے کبھی کبھی کوئی لڑکا زمین سے کوئی ٹھیکری اٹھا کر ہوا میں دور تک پھینک دیتا۔ کچھ ویسے ہی زمین پر پڑے پتھروں کو فٹبال کی طرح ٹھوکریں مار مار کر چل رہے تھے کہ یکا یک کھیتوں سے ایک خونخوار کتا نکل کر ہمارے سامنے پگڈنڈی کو روک کر کھڑا ہو گیا اور بہت مہیب شکل میں اپنے لمبے لمبے دانت نکال کر غرّانے لگا۔ اس کے جسم پر سے بال جگہ جگہ سے ادھڑے ہوئے تھے اور وہ بار بار اپنے سر کو زور سے اِدھر اُدھر ہلا کر کانوں کو جھٹک رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور داہنے جبڑے سے تھوک کی ایک لمبی دھار نکل کر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ہم ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پگڈنڈی پر کچھ اس طرح قبضہ کیا ہوا تھا کہ ہمارا آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک بلّا تھا۔ ایک لڑکے نے وہ بلّا گھمایا کتا بچاؤ کے لئے جھاڑیوں کی طرف دبک گیا ہم نے موقعہ غنیمت جان کر دوڑ لگائی اسی لمحے کتے نے بھی چھلانگ لگائی۔ ارشد اس کے قریب تھا اس نے کتے کو ہٹانے کے لئے اپنے سیدھے ہاتھ سے اسے جھٹکنے کی کوشش کی مگر کتے کا ایک دانت اسکی چھنگلی کو معمولی سا چھیلتا ہوا نکل گیا۔ لیکن ہم سب خیریت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ارشد کی چھنگلی پر ایک بہت معمولی خراش تھی اتنی معمولی کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب بار بار اس بات کا شکر ادا کر رہے تھے کہ کیسے اللہ نے جان بچائی ورنہ کتا تو بہت ہی خونخوار اور خطرناک لگ رہا تھا۔ گھر آتے آتے اور جیت کی خوشی میں محلے والوں کی دعوت کھاتے ہوئے ہم اس واقعہ کو بھول بھی گئے۔

میں واپس آ کر اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ تین ہفتے بعد میں پھر واپس گھر گیا۔ اس دفعہ ہمارا ارادہ شہر کے قریب بہنے والی نہر میں نہانے اور تیرا کی کرنے کا تھا۔ صبح صبح میں، ارشد اور کچھ دوسرے لڑکے تیرا کی کرنے نکلے۔ دو پہر تک خوب تھک گئے تو ہم نے گھر کی راہ لی۔ شام کو میرا پروگرام ارشد کے ساتھ ایک لمبی سیر کو جانے کا تھا۔ مگر جب چار بجے میں اسکے یہاں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسکی طبیعت خراب ہے۔ اسکے جسم میں درد تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ''فلو'' ہونے والا ہے۔ سب نے یہی خیال کیا کہ صبح صبح پیرا کی کی وجہ سے تھکن ہو گئی ہے یا سردی لگ گئی ہے۔ مگر دو گھنٹے کے اندر اندر اسکی حالت مزید خراب ہو گئی۔ جسم میں درد اس قدر شدید تھا اور اسکے پٹھوں میں ایسی بیچینی تھی کہ اسے کسی پہلو چین نہ تھا وہ کبھی اپنی ٹانگوں کو مروڑتا تھا تو کبھی ہاتھوں کو۔ کبھی کبھی اسکی کمر میں ایسا تناؤ پیدا ہوتا کہ اسکا پورا جسم ایک کمان کی طرح بستر سے اوپر اٹھ جاتا۔ اسکی حالت اتنی تیزی سے بگڑی کہ چند ہی منٹوں میں اس کے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ وہ ہاتھ سے کسی چیز کو پکڑ نہیں پا رہا تھا اور خاص طور سے اسکی گردن کے پٹھے سخت ہو کر کھنچ گئے تھے۔ اس سے تھوک بھی نہیں نگلا جا رہا تھا۔ ہم لوگ گھبرا گئے اور اسے لے کر فوراً سول ہسپتال بھاگے۔

ہسپتال میں ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور اسکے والد سے کہا کہ میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر نے اس کے والد سے پوچھا کیا اسے کتے نے کاٹا تھا؟ انہیں تو اسکا علم ہی نہیں تھا۔ خراش تھی ہی اس قدر معمولی کہ ہم نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ مجھے سب یاد آ گیا۔ میں نے کہا کاٹا تو نہیں تھا مگر ایک کتے کے دانت کی خراش اس کی چھنگلی پر لگی تھی۔ وہ تو اتنی معمولی تھی کہ ہم تو سب اسے بھول بھی گئے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس ڈاکٹر نے جذبات سے عاری آواز میں ان سے کہا کہ اب آپ دعا کریں اس بیماری کا کوئی علاج نہیں اور یہ صبح تک ''ختم'' ہو جائیگا۔ میں آج بھی لکھتے ہوئے کانپ رہا ہوں کہ اس نے یہی لفظ ''ختم'' استعمال کیا تھا۔ اسکے والد تو یہ سن کر ایسے لڑکھڑائے کے ساتھ آئے محلے کے ایک ساتھی نے انہیں پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ گر گئے ہوتے۔ میں اندر تک لرز گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟؟ صبح تو یہ ہمارے ساتھ پیرا کی کر رہا تھا!! میری آنکھوں میں اسکا ریلوے پل سے نیچے نہر میں چھلانگیں لگانے کا منظر پھرنے لگا۔ اس ڈاکٹر کے بے حس رویہ اور ایسے حتمی فیصلے پر میرا دل چاہا میں اسکا منہ نوچ لوں لیکن وہ ڈاکٹر موت کی سزا سنا کر واپس اپنے بنگلے کی طرف جا چکا تھا۔ میں نے اس کے والد سے کہا'' مجھے یقین نہیں آتا، آپکو معلوم ہے میں میڈیکل کالج میں پڑھتا ہوں اس کو ابھی میڈیکل کالج ہسپتال لے کر چلتے ہیں۔ میں وہاں اس

کوکسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤنگا'' سب نے اس سے اتفاق کیا۔جس شہر میں میڈیکل کالج تھا وہ دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ایک پرائیوٹ ٹیکسی کی گئی اور ہم میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے۔ارشد کو فوراً دیکھا گیا۔اس وقت تک اسکی حالت اور خراب ہو چکی تھی۔بار بار تشنج کے دورے پڑتے تھے،سخت پیاس طاری تھی بار بار پانی مانگتا تھا مگر کٹورا منہ تک پہنچتے پہنچتے گلے کے پٹھے اس قدر تیزی سے کھنچتے تھے کہ اسکے جبڑے کٹکٹا کے بھنچ جاتے تھے۔سانس تیز ہو جاتی تھی اور زبان اینٹھ کر گلے میں پھنس جانے کی وجہ سے ایسی خوفناک خرخراہٹ کی آواز نکلتی تھی کہ وہ خود ہی کٹورے کو ہاتھ سے دور پھینک دیتا تھا۔وہ خود اپنا تھوک نگلنے کے قابل نہیں تھا اور اب اسکے سیدھے گال سے رال کی لمبی دھار بہ رہی تھی جسے میں بار بار پونچھ رہا تھا۔ڈاکٹر نے ارشد کے والد کو الگ بلایا اور کہا کہ افسوس انکے پاس اسکا کوئی علاج نہیں۔آپ اسے واپس گھر لے جائیں۔ہمیں تو دنیا تاریک لگ رہی تھی۔مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ایسا کیسے ممکن ہے کیونکہ صبح تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ہمارے گرد اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے انہی میں کسی نے کہا کہ یہاں سے کوئی بیس میل دور کسی خاص فقیر کا ڈیرا ہے جو صرف اسی بیماری یعنی کتے کے کاٹے کا علاج جھاڑ پھونک سے کرتے ہیں۔یہ بات شرطیہ ہے کہ مریض ٹھیک ہو جاتا ہے اور انکو کبھی ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔کئی لوگ فوراً گواہی دینے پر تیار ہو گئے۔ہمارے پاس تو کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔اب تو ہم کسی معجزے ہی کی تلاش میں تھے۔ٹیکسی موجود ہی تھی ہم نے فوراً اس گاؤں کی راہ لی۔چلتے چلتے میڈیکل کالج کے ڈاکٹر نے ہمیں سنجیدگی سے خبردار کیا کہ ہم خیال رکھیں کہ اگر اس نے ہم میں سے کسی کے کاٹ لیا تو ہمیں بھی یہی بیماری ہو سکتی ہے۔

ہماری ٹیکسی کھیتوں سے گذرتی کچی سڑک پر دھول اڑاتی جارہی تھی۔شام ڈھل چکی تھی دونوں وقت مل رہے تھے عجب ماحول تھا میں ارشد کے ساتھ پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے نزدیک بیٹھا تھا۔اسکا ذہن بالکل صاف تھا وہ مجھ سے پوچھنے لگا ''بھیّا۔۔مجھے کیا ہو گیا ہے۔میں کب ٹھیک ہونگا؟'' میرے دل میں جیسے کسی نے بھالا مارا ہو۔میں نے دور افق پر نظریں جمائیں اور اس وقت میرے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر دعا نکلی کہ ''اے اللہ تو اسکو اپنی رحمت خاص سے شفا عطا کر'' چھوٹی سی جھگی نما خانقاہ میں پھٹے چوغے میں ملبوس ایک فقیر نے دعائیں پڑھیں اور ایک رومال سے اسکی جھنگلی کو جھاڑا پھر ہم سے کہا فکر نہ کریں اب گھر جائیں۔ہم گھر واپس آئے مگر لمحے لمحے اسکی حالت خراب ہوتی گئی۔مقامی ہسپتال کا کمپاؤنڈر ہماری مدد کو ہمارے ساتھ ٹھہرا۔اب ارشد کے دونوں گال اس طرح کھنچتے تھے کے اسکے دانت جبڑوں تک نظر آنے لگتے تھے وہ بار بار منہ اپر اٹھا کر کتے کی طرح ایک دل دوز چیخ بلند کرتا۔اسکے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور گاڑھا گاڑھا تھوک مستقل بہہ بہہ کر اسکی گردن اور سینے کو تر کر رہا تھا۔بہت رات ہو چکی تھی۔مجھ سے کہا گیا کہ میں اب اپنے گھر جاؤں۔وہ رات قیامت کی رات تھی۔پوری رات وقفے وقفے سے ارشد کے حلق سے ایسی ہی لمبی لمبی ہوکیں اٹھتیں جیسے اس رات ہم نے سنی تھیں جب میرے بھائی جان نے کہا تھا کہ کتے کے کاٹنے پر انسان کے حلق سے بھی ایسی ہی چیخیں نکلتی ہیں۔اسکی ہوکیں دیر تک فضا میں ارتعاش بپا کر دیتیں۔بالکل ایسا ہی لگتا جیسے کوئی منحوس کتا رو رہا ہو۔اسکے ساتھ محلے کے جو لوگ تھے وہ بھی پریشان اور دہشت زدہ تھے۔مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کسی نے کہا کہ جب دیہات میں یہ صورتحال پیدا ہوتی ہے تو اسکا علاج یہ ہے کہ ایک گیلی چادر زبردستی بیمار کے گرد سختی سے لپیٹ دی جاتی ہے جس سے چند منٹوں میں بیمار کا دم نکل جاتا ہے۔اسکے والد اور کمپاؤنڈر اس پر راضی نہ ہوئے۔پوری رات ایک ڈرامائی اور ہیبت ناک کیفیت رہی۔میں اپنے بستر میں یہ آوازیں سن سن کر کپکپاتا رہا۔ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ دور واپس آ گیا جب اس خالی گھر سے کتوں کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔شاید اسی حالت میں آنکھ لگ گئی تھی کہ اچانک زور سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں، پو پھٹ رہی تھی کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ارشد ختم ہو گیا۔۔۔

''ہوائیں چیختی ہیں''

محمود شام
(کراچی)

دیکھ کر کھیت مکاں ڈوبتے

دیکھ کر کھیت مکاں ڈوبتے، خوف آتا ہے
کٹتے جاتے ہیں سبھی رابطے، خوف آتا ہے

بوڑھی مائیں کہ جواں بیٹیاں، بھائی، بہنیں
سوکھی آنکھوں سے فلک دیکھتے ہیں، خوف آتا ہے

اچھے موسم میں کوئی کام نہ کرنے والے
کچھ کٹھن وقت میں کر پائیں گے، خوف آتا ہے

پل، مکانات، گزرگاہیں، دفاتر، اسکول
سب کی تعمیر، یہی سوچ کے، خوف آتا ہے

جن کی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں، آس نہیں
وہ دکھائیں گے ہمیں راستے، خوف آتا ہے

بے بسی، آہ و فغاں، کرب ہے، بربادی ہے
شام یہ حال وطن دیکھ کے، خوف آتا ہے

اب بصد شوق وہ ان کے ہی گلے لگتے ہیں
جن سے معمول میں غم بانٹتے، خوف آتا ہے

○

طوفاں تجزیے نہیں سنتے

ہوائیں چیختی ہیں
آسماں تک شور جاتا ہے
زمیں والے دہلتے ہیں
گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
اجالا منہ چھپاتا ہے
سمندر یوں اچھلتا ہے
کہ ساحل کانپ جاتا ہے
وصال و ہجر بے معنی سے لگتے ہیں
فلک بوسوں پہ دہشت طاری ہوتی ہے
حکومت، حکمرانی، حکمراں بے بس
سراسر بے اثر دعوے حفاظت کے
ہوائیں حکمرانوں، رہنماؤں جنرلوں کی آرزوئیں کیسے جانیں گی
ججوں کے فیصلوں اور تبصروں سے کس طرح سے آشنا ہوں گی
کہ وہ خبریں نہیں پڑھتی ہیں
طوفاں تجزیے سنتا نہیں ہے

○

عکسِ رُخِ گلبدن۔۔۔

کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ،بھارت)

بڑی اُدا سے، بڑے بانکپن سے آئے ہیں
حسین چہروں کی اک انجمن سے آئے ہیں
ہمارے پاس ہیں شبنم کے، چاندی کے پیام
ہمیں ملو کہ ہم اُس کے وطن سے آئے ہیں

○

بہت سے جلوے تصوّر کی دین ہیں ہمدم!
بہت سے پردے خود اپنی نظر کے ہوتے ہیں
وہ زخم، ہم جنہیں اپنا سمجھ نہیں پاتے
بہت سے اُن میں دلِ معتبر کے ہوتے ہیں

○

روشنی کی کِرن کِرن کے لیے
غم کی تاریک رات دیتی ہے
زندگی ایک قہقہہ دے کر
آنسوؤں سے حساب لیتی ہے

○

تِرے جمال کی پُرکیف راحتوں کی قسم
حدودِ کون ومکاں سے گذر بھی سکتا ہوں
میں جس خلوص سے جیتا رہا ہوں تیرے لیے
اُسی خلوص سے اے دوست! مَر بھی سکتا ہوں

○

تمہاری یاد کے اُجڑے ہوئے اُداس چمن
نکھر رہے ہیں مرے درد کی پھوار کے ساتھ
میں سوچتا ہوں کبھی تم بھی لوٹ آؤ گے
تمہارا بھی تو تعلّق ہے کچھ بہار کے ساتھ

○

مِری گلی میں یہ آہٹ تھی کس کے قدموں کی
یہ کون چاند سے دامن بچا کے گذرا ہے
مِرے اُداس دریچے مجھے بتاتے ہیں
بڑے ہی درد سے کوئی بُلا کے گذرا ہے

قطعات

منظر ایوبی
(کراچی)

صرف دل ہی نہیں، جگر بھی دے
دیکھنے کے لئے نظر بھی دے
ذوقِ پرواز ہی نہیں مقصود
میرے معبود ، بال و پر بھی دے

○

سہل ہے یہ زباں سے کہہ دینا
سختی راہِ عاشقی کیا ہے
دو قدم ساتھ چل کے دیکھو ناں
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

○

اس ہوا میں نہ آپ رہیے گا
اپنا مارے تو سائے میں ڈالے
آج، اپنوں کا ساتھ ہے ایسا
جیسے خود کوئی ناگ کو پالے

○

عشق کا ایک رخِ نشاط وِصال
دوسرا روپ قہرِ دوری ہے
لذّتِ قربِ یار کی خاطر
کچھ نہ کچھ فاصلہ ضروری ہے

○

زندگی کا سراب

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

صحرا، صحرا، زندگی ہے
تشنگی سی تشنگی ہے
روادِ حیات میں پھر
از سرِ نو تیرگی ہے
اُسکی تنہائیوں سے لپٹی
ایک چوتھائی صدی ہے
شکستہ و تن و تنہا
جسنے اُسکو زیست دی ہے
اُسکی باتوں کا طلسم
کیوں نہیں پہچانتی ہے
صورتِ گرگٹ رنگ بدلے
اُس پہ پھر وہ مرمٹی ہے
زیست صحرائی سراب!
جس کے تعاقب میں چلی ہے

○

ہائیکو

انوار فیروز
(راولپنڈی)

کبھی تو آ کے مل
تیرے بن اے میرے ساجن
سونی ہے محفل

تم ہو میرے پاس
پھر بھی جانے کیوں جاناں
دل ہے مرا اداس

سرما کی اک شام
تنہائی میں لائی ہے
زہر بھرا اک جام

تارے بوتے ہیں
تنہائی میں کام یہی ہے
ہم کب سوتے ہیں

تیرا میرا پیار
حائل کس نے کر دی ہے
ایک نئی دیوار

کیا ہے یہ اسرار
کھلی نہیں ہے وہ کھڑکی
اب کے بھی انوار

رب نواز مائل
(کوئٹہ)

بے گانگی

کیسی بے گانگی اب کے ہے ہر طرف
کس کو چاہیں عجب کس سے ہٹ کے رہیں
خواب در خواب بھی کب ہے کوئی خوشی
سیر در سیر بھی کب ہے کوئی فرح
موت آگے بھی ہے پیچھے بھی ہے کھڑی
سو کریں کیا کہ بے بس بھی تو کتنے ہیں
سو کریں کیا کہ کب مجتمع بھی ہیں کچھ
عشق سے تاہر اِک آشتی جنگوں سے

○

میرا کوئی دوش نہیں

زمانہ مجھے چاہے کچھ بھی نہ سمجھے
جوانی
محبت
حسیں زندگانی
لہو کا تماشا
یہ سب رنگ میرے تھے میں نے
لُٹائے
سمندر کی خاطر خوشی سے گنوائے
سمندر اگر اب بھی سویا پڑا ہے
تو میں سوچتا ہوں، مرا دوش کیا ہے

○

کیسی مجبوری

نقشبند قمر نقوی بھوپالی
(ٹلسا، امریکہ)

کوئی کیا شدت احساس کی تفسیر کرے
حالت و رد کا کیسے ہو تعین ممکن
کیا بیاں ہو دل خوں گشتہ کی کیفیت کا
تذکرہ کیسے ہو انسان کی حیثیت کا
یوں تو کونین کی اس کارگہہ رنگیں میں
شوکت وحشمت تخلیق کے افسانے ہیں
لیکن اس اشرف مخلوق کی حالت یہ ہے
کوئی قابو ہے زمیں پر نہ فلک پر قدرت
ہو زمیں لرزہ بر اندام تو انساں بے بس
آسماں زلف نچوڑے تو ہے انساں مجبور
بحر ذخار کی اک موج ہلاکت کا پیام
سب تدابیر حفاظت ہیں فقط وہم و گماں
غیر محفوظ ہے انسان زمیں ہو کہ زماں
کرب کی چیخ ہے مسموم فضا میں رقصاں
فرط آلام میں محصور ہے نالاں انساں

○

میرے آقاؐ

حمیراراحت
(کراچی)

مرے آقاؐ
ہم اُس بستی میں رہتے ہیں
جہاں پر صبح کے اخبار پر تازہ لہو کے پھول کھلتے ہیں
جہاں پر داستانوں کی طلسمی ساعتوں پر، جبر لکھا ہے
جہاں پر اشک ہیں، آہیں ہیں
اور فریاد کے کچھ ایسے سُر ہیں جن کو منصف بھی نہیں سنتا
مرے آقاؐ
ہم اُس بستی میں رہتے ہیں
جہاں دہشت کی دیوی کالی چادر اوڑھ کر ہر شب نکلتی ہے
جہاں پر بوریوں میں بند لاشیں ہیں
مگر قاتل کھُلے ہیں اور یہ کہتے ہیں
کوئی بھی سانس لے تو ہم سے پوچھے
خواب دیکھے تو ہماری ہی اجازت سے
مرے آقاؐ
ہم اُس بستی میں رہتے ہیں
جہاں پر دن میں آدھی رات ہوتی ہے
جہاں پر خالی ہاتھوں میں دعائیں بین کرتی ہیں
ہمیں لگتا ہے جیسے بند ہے تاثیر اُن ساری دعاؤں کی
کسی نادیدہ مٹھی میں
مرے آقا
کوئی سورج، کوئی تارہ، کوئی جگنو
مری بستی کی تاریکی مٹانے کوئی تو آئے۔۔۔

○

شہر کا شہر ہو گیا ہے اداس

(کراچی میں قومیتوں کے نفاق و تعصب کی آگ میں چند گھروں کو جلتا دیکھ کر)

قیصرنجفی
(کراچی)

میں نہیں ایک وقفِ حزن و یاس
غم سے ہر شخص کھو چکا ہے حواس

زندگی کی رُتوں سے کہہ دو ہمیں
موسمِ مرگ آ گیا ہے راس

وا رہی چشمِ پاسبانِ چمن
اور لہو ہوگئی گلوں کی باس

وہ کہ پیوندِ خاک بھی نہ ہوئے
پہنا کرتے تھے برگِ گل کا لباس

ہر قدم پر لہو لہو دیکھے
رہ نور دانِ جادۂ احساس

آنگنوں کے چراغ بُجھ جائیں
ہے یہ فرمانِ بادِ خوف و ہراس

غم کی ایسی چلی ہے اب کے ہوا
شہر کا شہر ہو گیا ہے اُداس

○

بڑی اسکرین

فیصل عظیم
(کینیڈا)

میرے چاروں طرف
نقرئی پردہ کب جانے' تانا گیا
ایسا ناٹک ہوا
دیکھنے جس کو سارا زمانہ گیا
اور گیا بھی کہاں
بس کبھی پردے کے اِس طرف اور کبھی اُس طرف
جو بھی آیا وہیں سے' گیا بھی وہیں
اور ایسے میں خود کو میں ڈھونڈوں' تو میں تو کہیں بھی نہیں
پھر اچانک میں پردے پہ چھا سا گیا
مجھ سے پوچھے بنا
اگلے منظر میں مجھ کو بلایا گیا
منہ کے بل' اتنی اونچائی سے نیچے آتا ہوا میں دکھایا گیا
آسمانوں کی جانب مگر دوسروں کو بلایا گیا
کیسے دیکھوں اُنھیں!
(سر اُٹھائے ہوئے
اور بلندی کو چھونے کی خواہش میں بازو بڑھائے ہوئے)
کیسے دیکھوں اُنھیں! دل نہیں مانتا
سر جھکانے کی پہلے سزا دیکھ لوں
اتنی گہرائیوں میں ہے کیا' دیکھ لوں
اس کہانی میں پھر کیا ہوا' دیکھ لوں
پہلے خود کو تو گرتا ہوا دیکھ لوں

❍

زہر آلود

سیفی سرونجی
(سرونج' بھارت)

تمام سنگلاخ زمینوں میں
محبت کے بیج بونے والے
اپنے لہو سے
اپنے وطن اپنے شہر کو
سینچتے ہیں
اور اس میں
رنگ برنگ
پھول سجاتے ہیں
لیکن یہ بھی سچ ہے
کہ کچھ لوگ
ان کی محنت کو
پل بھر میں ضائع کر دیتے ہیں
اور ہنستے گاتے موسم کو
زہر آلود کر دیتے ہیں

❍

پنجاب کے رنگ

ڈاکٹر سید توقیر حیدر
(جدہ)

پھر دل کی جوت جگا سجناں، پھر پیار کی جگنی گا سجناں
یہ درد کی لذت چیز ہے کیا، تو لوگوں کو سمجھا سجناں

وہ خوشیاں کیسی خوشیاں ہیں جو پل بھر کی مہمان ہوئیں
یہ غم ہی اپنے ساتھی ہیں جو ہم کو ملے سدا سجناں؟

یہ دھرتی ہے دل والوں کی، نہ گوروں کی نہ کالوں کی
معیار یہاں کردار اپنا، تو سب کو یہ بتلا سجناں

چشمک کے کنائے کیا سمجھوں، میں رمز، اشارے کیا جانوں

تو رسیا محل مناروں کا، میں بندہ سیدھا سا سجناں

اب رہٹ کی شامیں سونی ہیں، چوپال میں اب وہ بات نہیں
چورستے خالی خالی ہیں، اب آ، اور انہیں سجا سجناں

جہاں رات ڈھلے ارمانوں کی، وہ دھرتی شیر جوانوں کی
پنگھٹ پہ رنگ حسینوں کے، اب سب کچھ ہے عنقا سجناں

دنیا کی ریت نرالی ہے، وہ پگڈنڈی بھی خالی ہے
جو رستے منزل دیتے تھے، وہ سب نے دیئے بھلا سجناں

پردیس کو جو بھی جاتا ہے، وہ واپس کبھی نہ آتا ہے
تو دیس کو لوٹ کے آ سجناں اب اپنے قول نبھا سجناں

○

موت

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

موت تو اک اٹل حقیقت ہے
زیست کی طرح خوبصورت ہے

اس کے آنے پر ہے اداسی کیوں
اس سے کیوں آدمی کو وحشت ہے

ٹوٹ جائے جو سانس کی ڈوری
زندگی ہے نہ پھر حرارت ہے

سارے پندار ٹوٹتے ہیں جہاں
موت ایسا جہانِ عبرت ہے

موت کے بعد بھی ہے اک دنیا
جس میں آباد اتنی خلقت ہے

لے کے جاتی ہے ساتھ سارے دُکھ
موت کی یہ بھی اِک عنایت ہے

زندگی ہے عارضی ٹھکانہ اور
موت ایک دائمی حقیقت ہے

عظمیٰ جو تاابد ہے موجود
وہ خدا ہے خدا کی رحمت ہے

○

آؤ نوحے لکھیں

تنویر شاہد محمد زئی
(ڈیرہ دین مراد)

چاند کو اپنی ہی چاندنی کھا گئی
اور سورج کو بھی روشنی کھا گئی
رات کو تیرگی کھا گئی
مفلسوں کو فقط مفلسی کھا گئی
زندگی کا سفر ختم ہونے لگا
زیست کو زندگی کھا گئی
علم و عرفان کو آگہی کھا گئی
جن کے چہروں پہ تھی زردیوں کی دھنک
ایسے چہروں کو بھی بے بسی کھا گئی
آگ کے دشت کو تشنگی کھا گئی
شہر کی رونقیں ہر خوشی کھا گئی
زلف خم دار کو برہمی کھا گئی
پھول سے جسم کو تازگی کھا گئی
شبنمی رات کو پھر نمی کھا گئی
ہر طرف موت کا رقص ہوتا رہا
اور آواز کو نغمگی کھا گئی
شادیٔ مرگ ہے
آؤ ماتم کریں آؤ نوحے لکھیں

شہر کے وسط میں سُولیاں نصب ہیں
آؤ! لاشیں گنیں
یہ جو لاشوں کا انبار ہے دوستو
ان میں تیری بھی ہیں
ان میں میری بھی ہیں
سب کی لاشیں ہیں یہ
اور مصلوب ہم جان کر ہی ہوئے
اپنی آنکھیں بھی ہم نے نکالی ہیں خود
کھال کھینچی اگر۔۔۔اپنی ہی کھینچ لی
جسم نوچا اگر۔۔۔جسم اپنا ہی تھا
اپنے قاتل بنے
خود ہی مقتول ہیں
شہر جل بھی چکا۔۔۔آگ بجھ بھی چکی
ہر طرف خامشی۔۔۔ہونٹ سِل بھی چکے
اور اپنے قلم
اپنے ہاتھوں سے ہم نے قلم کر دیئے
اب یہی فرض ہے
اپنے خوں میں ڈبوئیں یہی اُنگلیاں
اور نوحے لکھیں

○

''شام کی منڈیر سے''

ایک فکری خودنوشت

انور سدید

(لاہور)

اب مجھے یہ تو معلوم نہیں کے اردو کے نامور نقاد، ممتاز شاعر، منفرد انشائیہ نگار اور ادبی جریدہ ''اوراق'' کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا نے غزل کا یہ شعر کب کہا تھا۔

''دن ڈھل چکا تھا، اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا''

لیکن میں نے جب یہ شعر پڑھا تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ اس میں خود نوشت سوانح کا عنصر موجود ہے۔ بلاشبہ یہ شعر زمانہ حال کا بیانیہ ہے اور مصرعہ ثانی میں رجائیت کا زاویہ بھی موجود ہے لیکن اہمیت اس شعر کے ابتدائی الفاظ ''دن ڈھل چکا تھا'' کو حاصل ہے جو اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ زندگی کی شام سائے نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے دوست سجّاد نقوی صاحب سے شعر کے اس تجزیئے کا ذکر کیا تو ان سے درخواست کی کہ وہ وزیر آغا صاحب کو اپنی ''خودنوشت سوانح'' تالیف کرنے پر آمادہ کریں۔ اور انہوں نے مجھے کہہ بتا کر حیرت زدہ کر دیا کہ آغا صاحب اپنی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' کے نام سے لکھ چکے ہیں اور اب نواحی گاؤں لالیاں میں صغیر شیروانی اس کی کتابت کر رہے ہیں۔ انہوں نے دلچسپ بات یہ بھی بتائی کہ اوپر لکھا ہوا شعر وزیر آغا صاحب پر اس روز اترا جب وہ اپنی آپ بیتی کا آخری صفحہ لکھ چکے تھے۔ اور یہ احساس زندہ بقا کہ زندگی کا سفر جاری ہے اور اب راہ نوردِ حیات وہ مناظر دیکھے گا اور ان میں فعّال حصہ لے گا جو شام کی منڈیر سے انہیں نظر آئیں گے۔

یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ چند سال پہلے ان کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' شائع ہوئی تو بعض لوگوں نے اسے وزیر آغا کی منظوم سوانح عمری قرار دیا جس میں زندگی کی پوری کہانی موجود ہے لیکن آغا صاحب نے اسے صرف اپنے محسوسات کے مدّ وجزر کی داستان قرار دیا جس کے عقب میں پھیلے ہوئے وہ صدہا واقعات وحادثات موجود نہیں تھے جن سے یہ محسوسات پیدا ہوئے اور جن کے بلاواسطہ اور بالواسطہ اثرات سے یہ طویل نظم تخلیق ہوئی تھی۔ دوسرے نظم کے فنّی ضابطوں اور پابندیوں میں کوئی مفکّر اور دانشور ادیب اپنے تصورات وافکار کا تجزیہ اتنی آزادی سے نہیں کر سکتا جتنا شعر کی صنف میں ممکن ہے۔ اب انہیں احساس ہوا ہے کہ انہیں اپنی کہانی ایک بار پھر سنانی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں اپنا قیام بڑھا دیا۔ علی الصبح اٹھتے، اور اپنے پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ ان کا ذاتی ملازم محمد حسین چائے کی میز ان کے قریب کر دیتا جس پر ان کی شاعری کی اس وقت تک کی چھپی ہوئی نظم کی کتابیں ''شام اور سائے''، ''دن کا زرد پہاڑ''، ''نردبان''، ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''گھاس میں تتلیاں'' ترتیب وار رکھی ہوتیں۔

ان کتابوں کی تمام نظمیں وزیر آغا کی زندگی کا حصہ ہیں، ہر نظم کے باطن میں کوئی واقعہ یا کہانی موجود ہے جس نے ان کی تخلیقی شخصیت کو متاثر کیا تو ایک نظم وجود میں آ گئی، ان تمام نظموں کو آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا اور اس تخلیقی سفر کو تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کاوش کی تو ایک مربوط کہانی مرتب ہوتی چلی گئی جو نثر میں لکھی گئی تو ایک واقعے سے دوسرے واقعے تک کا خلاء یادوں کی الٹی چلنے والی فلم نے مکمل کر دیا۔ میں نے یہ آپ بیتی دسمبر ۱۹۸۶ء میں اشاعت کے بعد پڑھی تو اسے اردو کی ایک ایسی منفرد خودنوشت سمجھا۔ جس کا تمام مواد مصنف نے اپنی شعری تخلیقات سے بازیافت کیا تھا۔ بالفاظ دیگر ''شام کی منڈیر سے'' وزیر آغا کی متعدد نظموں کی تخلیق مکرّر قرار دی جا سکتی ہے تو یہ اعتراف کرنا بھی مناسب ہے کہ وزیر آغا یہ طویل نثری نظم دوسروں کو نہیں سنا رہے بلکہ وہ خود اس کے سامع ہیں۔ لیکن جب کتاب چھپ گئی تو اہلِ نظر نے تسلیم کیا کہ آغا صاحب نے انہیں اپنی خلوت میں جھانکنے کی اجازت دے دی ہے اور اب ہم اسے ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری قرار دے سکتے ہیں جس میں شخصیت کو نمایاں کرنے کی بجائے افکار کی نشو اور نظریات کے ارتقاء کو فوقیت دی گئی ہے۔ بلاشبہ زمانی واقعات، حالات اور سماجی کرداروں کو نظرانداز نہیں کیا گیا لیکن میں اسے خودنوشت کی فنی، ادبی اور سماجی ضرورت قرار دوں گا کہ تصنیفی فریضہ ادا کرنے کے بعد اب یہ کتاب زمانے کی عدالت میں ہے اور قارئین کرام ہی اس کے مصنف ہیں جبکہ وزیر آغا کی ادبی اور سماجی شخصیت کی پوری آگہی کے لیے یہ سب کچھ ضروری تھا۔

''شام کی منڈیر سے'' کا پہلا نقش جو ۱۹۸۶ء میں چھپا۔۔۔ سفرِ اوّل (۱۹۲۲ تا ۱۹۴۹)۔ قیام (۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۹)۔ مزید سفر (۱۹۵۹ تا ۱۹۷۵) اور قیام (۱۹۷۵ تا ۱۹۸۰) پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۰ء کو انہیں پھر سفر درپیش تو اس سفر کے دوران میں ہی یہ آپ بیتی لکھی گئی۔ اس لیے اس سفر کو وزیر آغا نے جاری قرار دیا ہے۔ تاہم ۲۰۰۶ء میں انہیں اس خودنوشت کو آگے بڑھانے کا خیال آیا تو آخری سفر کا عرصہ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۶ء مقرر کیا جو اس کتاب کی اشاعت کا سال ہے۔ لیکن یہ سفر اس کتاب کے دوسرے حصّے میں (نیا ایڈیشن اضافے کے ساتھ) ۱۹۹۹ تک جاری ہے۔ اور ۱۹۹۹ سے تا حال (۲۰۰۹) کو انہوں نے قیام سے تعبیر کیا ہے۔ آپ انہیں اس کتاب کے سات ابواب بھی قرار دے سکتے ہیں جن کے زمانی تسلسل سے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی زندگی پر خودنظر ڈالی ہے۔ یہاں اس کا اجمال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وزیر آغا نے زندگی کا سفر ۱۸ مئی ۱۹۲۲ کو سرگودھا کے نواحی گاؤں وزیر

کوٹ سے شروع کیا جوان کے دادا آغا وزیر علی خان قزلباش کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ان کے والد آغا وسعت علی خان (جو گیان دھیان کی طرف راغب ہوئے تو د،ع،خ کے نام سے معروف ہوئے) گھوڑوں کے سوداگر تھے۔انگریزی سرکار کو گھوڑوں کی ضرورت لاحق ہوئی تو ''گھوڑی پال سکیم'' کے تحت اپنی شرائط پر زمینیں الاٹ کیں۔اور وزیر آغا کا خاندان لاہور سے وزیر کوٹ منتقل ہو گیا۔بیسویں صدی کے ربع دوم میں جو اقتصادی بدحالی آئی تو یہ خاندان بھی اس سے متاثر ہوا۔اور وزیر آغا کا لڑکپن انتہائی عسرت میں گزرا۔لیکن انہوں نے لکھا ہے:

''لڑکپن کے ایّام خوشیوں سے معمور تھے۔غربت کا ہمیں
احساس تک نہیں تھا۔کیونکہ ہم اپنے سے بہتر معیارِ زندگی
سے واقف ہی نہیں تھے۔گاؤں کے دوسرے باسیوں کا حال
اتنا پتلا تھا کہ ان کے مقابلے میں ہم خود کو شہزادے سمجھتے تھے
مگر اس سلسلے میں کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں تھے''۔

وزیر آغا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسوں میں حاصل کی اور میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول سرگودہا سے ۱۹۳۷ء میں پاس کیا،ایف اے جھنگ کالج سے کیا جہاں ممتاز عالمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام ان سے سینئر طالب علم تھے۔جھنگ میں وہ ایف اے میں اوّل آئے تھے۔بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنوں میں تنہا ہیں۔اس تنہائی کے داخلی کرب نے ان کے اندر کے شاعر کو بیدار کیا اور وہ انگریزی اور اردو میں نظمیں لکھنے لگے۔لیکن ان کی پہلی نظم ''ساقی'' دہلی میں ''دھرتی کی آواز'' کے عنوان سے ۱۹۴۶ میں چھپی جب وہ تین برس پہلے معاشیات میں ایم۔اے کر چکے تھے۔اس دوران والد نے انہیں فوج میں لیفٹیننٹ بھرتی کرانے کا ارادہ کر لیا۔لیکن وزیر آغا نے انکار کر دیا اور وجہ بتائی:

''میں اس قوم کے ساتھ کیسے تعاون کر سکتا ہوں جس نے
ہمیں صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور
جو نسل در نسل ہمارا خون پیتی رہی ہے''۔(ص ۴۷)

وزیر آغا کے والد مسکرائے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔وزیر آغا اب آزاد تھے لیکن والد صاحب نے انہیں گھوڑوں کے کاروبار میں لگانا چاہا اور مطالعاتی دورے پر بمبئی اور پونا بھیج دیا۔وزیر آغا گھوڑوں کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کر کے واپس آئے لیکن اس سفر میں وہ فطرت سے مواتست کے نئے خواب دیکھ چکے تھے۔انہوں نے گھوڑوں کا کاروباری بننے کے بجائے زمین سے محبت پیدا کی،کاشتکاری اختیار کر لی۔دھرتی کا تصور جاگا تو یہ ماں کے تصّور کے مماثل قرار پایا اور وزیر آغا کی تخلیقی اور تنقیدی شخصیت کا جزو بن گیا۔اس دور میں وزیر آغا نے اپنے باطن کی سیّاحت میں گہری دلچسپی لی اور یہ چند اہم سوالات ان کے دل میں پیدا ہو رہے تھے:

''کائنات کا اسرار کیا ہے؟''
''حقیقت عظمیٰ سے میرا رشتہ کیا ہے؟''
''میں کیوں ہوں اور یہ کائنات کس لئے ہے؟''

تجسس اور تلاش کے اس مرحلے پر مولانا صلاح الدین احمد اور د۔ع۔خ نے ان کی رہنمائی کی اور ان کے بھانجے شمش آغا ان کے ہم سفر بن گئے۔واضح رہے کہ د۔ع۔خ ان کے والد گرامی تھے جواب ان کے دوست بن گئے تھے جو تصوّف اور ویدانت کے رموز و اسرار انہیں سمجھاتے تھے۔شمس آغا اور وزیر آغا پر اس تعلیم نے متضاد اثرات مرتب کیے۔شمس آغا جس نے ایک اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار کی شہرت حاصل کر لی تھی،اپنے وجود کے سوالوں میں ایسا گم ہوا کہ پھر اس کا پتہ نہ ملا۔وزیر آغا نے اس کے برعکس زندگی کو ایک نعمت سے تعبیر کیا اور اس کا رس نچوڑنے کی بجائے اس کی معنویت دریافت کرنے کے لئے ادب کی طرف آ گئے۔''ادبی دنیا'' کے دورِ پنجم میں مولانا صلاح الدین احمد کی معاونت کی اور ان کی وفات کے بعد اپنا رسالہ ''اوراق'' جاری کیا،ادب کی آبیاری اپنے نئے مطالعے کی روشنی میں کی،جدید شاعری کے ساتھ انشائیہ کی صنف کو فروغِ نو دیا اور نظم ''جدید کی کروٹیں''،''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ''اردو شاعری کا مزاج''،''تخلیقی عمل''،''تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں''، ''مجید امجد کی داستان محبت''،''غالب کا ذوقِ تماشا'' جیسی یک موضوعی کتابیں لکھیں۔ایک درجن سے زیادہ کتابوں میں ان کے متنوع موضوعات کے مضامین شامل ہیں۔ان کی جدید شاعری کی پہلی کتاب ''شام اور سائے'' (۱۹۶۴) تھی۔اور ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی۔''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' ان کی کلیات کا نام ہے۔فیصل ہاشمی نے ان کی منتخب نظموں کا مجموعہ ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' مرتب کیا اور ۲۰۰۸ میں اوسلو سے شائع کیا۔

''شام کی منڈیر'' شاید اردو کی پہلی خودنوشت ہے جس میں مصنف نے انکشافِ ذات کے لئے اپنی تخلیقات کو استعمال کیا ہے۔انہوں نے ادب کے جدید زاویوں کو علوم کی نئی روشنی میں دریافت کیا اور اپنے معاصرین کے ذہنی افق کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ان کی مخالفت بالعموم ان شہرت پسند ادیبوں نے کی جو یک رخی شاعری کرتے تھے تاہم ان مخالفین نے بھی وزیر آغا کو ایک دبستانِ فکر کا بانی شمار کیا لیکن اس قسم کا دعویٰ خود وزیر آغا نے کبھی نہیں کیا۔''شام کی منڈیر سے'' پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وزیر کوٹ میں وزیر آغا کی چار مربعہ اراضی کی وسعت کا اندازہ غلط لگانے والوں نے انہیں ''جاگیردار'' موسوم کیا اور ''اوراق'' میں لکھنے والوں کو ان کا ''مزارع'' شمار کیا۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ''میراجی'' کو جدید اردو شاعری میں ''دھرتی پوجا کی مثال'' قرار دیا تو ان کی مراد میراجی کا دھرتی سے عشق تھا۔لیکن بعض لوگوں نے اس ترکیب کو بطور دشنام ان پر استعمال کیا۔یہ طوفان اس وقت تھا جس ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' کا نغمہ گلی کوچوں میں گایا جانے لگا اور ارضِ وطن کو مقدس مقام دیا گیا۔

باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

''انبالہ کے مسلم شعراء وادبا''

(بیشتر تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے)

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ شہر، بھارت)

انبالہ ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے یہاں تک کہ 1847ء سے یعنی آج سے قریب 165 برس پہلے سے یہ ضلع کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ شہر جہاں صنعت وحرفت کے لئے مشہور ہے وہیں علم وادب اور فن وثقافت کی آماجگاہ بھی رہا ہے۔ کھیل کُود کے سامان اور سائنسی آلہ جات کی صنعت وتجارت کے علاوہ آج کل یہ شمالی ہند کی کپڑے کی سب سے بڑی مارکیٹ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اسی شہر میں جہاں ایک طرف عیسائیوں کے قدیم گرجا گھر اور مسلمانوں کی کئی مساجد اور مقدس مزار ہیں وہیں سکھوں کے کئی تاریخی گُوردوارے اور ہندوؤں کے کئی قدیم مندر بھی ہیں۔

انبالہ شہر میں امبا دیوی کا مندر بہت ہی پُرانا ہے اور کچھ مورخین کے مطابق اس شہر کا نام بھی اسی دیوی کے نام سے منسوب ہے جبکہ کچھ دیگر تاریخ دانوں کی رائے ہے کہ یہاں پر آموں کی فصل کی بہتات ہوا کرتی تھی اسی لئے اس شہر کو پہلے ''امب والا'' کے نام سے جانا جاتا تھا جو بعد میں امبالہ یا انبالہ بن گیا۔ یہ شہر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے: انبالہ (یعنی انبالہ شہر) اور انبالہ چھاؤنی۔ ان دونوں کے درمیان قریب سات آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

گذشتہ صدی کی نامور گلوکارہ زہرہ بائی (1922ء تا 1990ء) کا تعلق بھی تادیر انبالہ شہر سے رہا اور پھر فلمی دنیا میں جانے کے بعد اُس نے اپنے نام کے ساتھ ''انبالہ والی'' کو برقرار رکھ کر نہ صرف خود شہرت کی بلندیوں کو چھوا بلکہ اپنے ساتھ ساتھ انبالہ کے نام کو بھی روشن کیا۔

اسی طرح دنیائے شعر وادب میں بھی اس شہر نے بے شمار مشاہیر پیدا کیے۔ یہاں کے متعدد شعراء وادبا نے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کی۔ ان شاعروں اور ادیبوں کا تعلق مختلف مذاہب سے تھا۔ بہر حال سرِ دست اس مضمون میں صرف مسلم شعراء وادبا کا ذکر کیا جانا مقصود ہے خصوصاً اُن حضرات کا جو تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے پاکستان جا بسے تھے۔ مضمون کے دوسرے اور آخری حصے میں کچھ ایسے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر بھی شامل ہے جن کے بارے میں زیادہ جانکاری حاصل نہیں ہوسکی۔ بہر کیف ان سے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہوسکی ہیں، درج کی جارہی ہیں۔ دونوں حصّوں میں تمام حضرات کے تخلّص کو سامنے رکھ کر انہیں حروف تہجی کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے۔

اقبال سحر انبالوی:

اصل نام محمد اقبال۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۸ء کو انبالہ چھاؤنی میں جناب محمد یعقوب کے یہاں پیدا ہوئے۔ انبالہ ہی میں میٹرک تک کی تعلیم پائی اور پھر ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء تک انبالہ چھاؤنی ہی میں رہے۔ پھر دوسال بسلسلہ ملازمت روپڑ میں گزارے۔ ہجرت کے بعد لاہور میں جا بسے تھے۔ ۱۹۹۶ء میں انہوں نے لاہور ہی سے ایک معیاری ادبی ماہ نامہ ''رُشحات'' کا اجرا کیا جو ان کی حیات تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

طویل علالت کے بعد ۲ دسمبر ۲۰۰۷ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ آخری ایام میں اپنی جنم بھومی خاص طور پر اپنے بچپن کے دو ہمجولیوں پروفیسر شیدا انبالوی اور سردار بھاگ سنگھ سوڈھی (مالک سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ انبالہ چھاؤنی) کو بہت یاد کرتے تھے۔ وفات سے پہلے اپنا ایک شعری مجموعہ ''فکرِ سحر'' کے نام سے ترتیب دے رہے تھے جو شاید اشاعت کا منہ نہ دیکھ سکا۔

نمونہ کلام:

روا روی میں بشر کا پتہ نہیں چلتا
بغیر پرکھے گُہر کا پتہ نہیں چلتا
ہے خوب شاعری' آزاد شاعری بھی سحرؔ
ہُنر وروں کے ہُنر کا پتہ نہیں چلتا

چلے ہو ساتھ اگر تم تو حوصلہ رکھنا
رہِ وفا میں قدم سے قدم ملا رکھنا
جہاں میں ہم کو سحرؔ! چار دن ہی رہنا ہے
تو پھر کِسی کو بھلا کس لیے خفا رکھنا

حسنؔ رضوی:

پورا نام: سید حسن عباس رضوی۔ 18 اگست 1946ء کو انبالہ شہر میں سید کوثر عباس رضوی کے ہاں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد آپ کا خاندان ہجرت کر کے لاہور چلا گیا تھا جہاں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ بہ یک وقت شاعر، نثر نگار، محقق اور صحافی تھے۔ 21 کتابوں کے مصنّف/مرتّب تھے جن میں چھ شعری مجموعوں کے علاوہ پانچ سفرنامے، تین ادبی شخصیات سے لئے گئے انٹرویوز اور چند تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعوں کے ساتھ ساتھ بہت سا نعتیہ کلام بھی شامل ہے۔ آپ کی صحافتی خدمات بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ مختلف وقفوں میں آپ روزنامہ ''جنگ'' (لاہور) ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' (کراچی)، روزنامہ ''مساوات'' (لاہور) ہفت روزہ ''شہاب'' اور روزنامہ ''مشرق'' (لاہور) سے وابستہ رہے۔ بدیشوں کی سیاحت بھی کی اور بے

شمار بین الاقوامی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ آپ کی مجموعی ادبی وصحافتی خدمات کے اعتراف میں کئی اعزازت سے آپ کونوازا گیا تھا جن میں پاکستان کا صدارتی ایوارڈ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' (۱۹۹۶ء) اور ساہتیہ اکادمی (بھارت) کا''مجازایوارڈ'' (۱۹۹۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۵فروری۲۰۰۲ءکوآپ نے لاہور ہی میں رحلت فرمائی

نمونۂ کلام:

زمیں پہ رہ کے جس نے آسمانوں پہ قدم رکھا
اُسی کے دم قدم سے رشکِ جنّت بن گئی دنیا
اُسی نے آدمیت کی نئی تاریخ لکھی تھی
جو لہجے میں خدا کے، آدمی سے بات کرتا تھا

حسن عسکری کاظمی:

16اکتوبر 1931ءکوانبالہ شہر کے محلّہ سادات، قاضی واڑہ میں سیّد محمد باقر کاظمی کے یہاں آپ کی پیدائش ہوئی تھی۔ آٹھویں جماعت تک کی تعلیم مسلم ہائی اسکول انبالہ شہر (موجودہ ڈی اے وی کالج) سے حاصل کی۔ ہجرت کے بعد ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات پاس کر کے آپ نے 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور سے اُردوادب میں ایم۔اے کیا۔ 1991ء میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو سے صدرِشعبہ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نے اب تک سات کتابیں تخلیق کی ہیں۔ کئی ملکوں کی سیاحت کر چکے ہیں۔ پی۔ٹی۔وی لاہور سے آپ پنجابی ملی ترانہ کے لئے اوّل انعام بھی پا چکے ہیں۔ معروف ادیب، محقق اور صحافی حسن رضوی صاحب (مرحوم) آپ کے بھانجے تھے۔ حسن عسکری کاظمی آج کل 72 /سی، مدینہ بلاک، اعوان ٹاؤن لاہور میں قیام پذیر ہیں۔

نمونۂ کلام:

عجب نہیں کہ رہے دوش پر نہ سر باقی
ستم شعار کا لیکن رہا نہ ڈر باقی
خدا وہ وقت نہ لائے، مگر وہ آئے گا
زمیں پہ کوئی ٹھکانہ رہے نہ گھر باقی

ساغرصدیقی:

اصل نام محمد اختر تھا۔ 1928ء میں انبالہ شہر کے محلّہ شانہ گراں (کنگھی گراں) میں پیدا ہوئے تھے۔ شروع میں ناصر مجازی کے نام سے لکھتے تھے، بعد میں ساغرصدیقی ہوگئے اور اسی نام سے شہرت پائی۔ آبائی پیشہ شانہ گری تھا یعنی لکڑی کی کنگھیاں بناتے تھے۔ صرف چار جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ آواز بہت سُریلی تھی۔ شروع شروع میں میلادی کی مجالس میں نعتیں پڑھا کرتے تھے اسکول میں''بزم ادب'' کی محلفوں میں نعتوں کے علاوہ ایک بھجن بھی بڑی خوش الحانی سے سُناتے تھے جس کے شروع کے بول تھے:

ہری اپنا ہی نام جپایا کرو
مت مایا میں ہم کو پھنسایا کرو

تقسیم وطن کے وقت ہجرت کر کے پہلے امرتسر اور پھر لاہور منتقل ہوئے۔ شاعری میں بڑی شہرت پائی۔ اشعار میں سوز وگداز کرب، ہجر محبوب اور زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی جھلکیاں جابہ جانمایاں ہیں۔ بے حد مقبول و معروف شاعر تھے۔ ہندوپاک کے کئی عظیم گلوکاروں نے اُن کی بے شمار غزلوں کو اپنی آواز دی ہے۔ فلموں کے لیے بھی گیت لکھے لیکن درویش صفت، اور قلندرانہ مزاج کے انسان تھے۔ تمام عمر شادی نہ کی۔ شروع میں شراب کے رسیا تھے پھر چرس پینے لگ گئے اور آخر میں مارفیا کے انجکشن پر آ گئے۔ داتا دربار کے باہر فٹ پاتھ پر پڑے رہتے تھے۔ لوگ مشاعروں میں لے جاتے۔ فلم والے گیت لکھواتے اور سینکڑوں روپے پیش کرتے تھے لیکن یہ صرف پانچ روپے کا نوٹ لے کر کہہ دیتے تھے کہ''بس فقیر کو یہی کافی ہے'' نہ گھر نہ ٹھکانہ۔ آخر میں فالج کا حملہ ہوا اور دایاں بازو بیکار ہو گیا۔ کسمپرسی کی حالت میں 19 جولائی 1974ءکولاہور ہی میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں
زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا، یاد نہیں
میں نے پلکوں سے درِیار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل نہیں جسے کوئی صدا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

سرمدترمذی:

اصل نام سیّد منظور حسین تھا۔ ۱۶جنوری ۱۸۹۷ءکوسیّد اُلفت علی گویا کے یہاں محلّہ قاضی واڑہ انبالہ شہر میں تولّد ہوئے۔ مدرسہ ناصرالمومنین اور مشن اسکول انبالہ شہر میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ ریلوے اور محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۰ء میں انبالہ میونسپلٹی میں اکاؤنٹنٹ مقرر ہوئے اور ترقی کر کے سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ تقسیم وطن کے بعد خان گڑھ اور پھر مظفر گڑھ (پاکستان) میں سیکرٹری بلدیہ مقررّ رہے۔ 1953ء میں ریٹائر ہو کر مظفر گڑھ میں آباد ہوگئے۔

آپ معروف شاعر وصحافی حضرت کشفی ملتانی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ 1916ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور اپنے والدِ محترم سے اصلاح لی۔ مذہبی شاعری، سہرانویسی اور تاریخ گوئی ان کے خاص میدان تھے۔ ''گلزارِ سرمدی'' کے نام سے ان کی تین جلدیں مرتّب ہو چکی تھیں۔ آپ کے

اندازِ تغزّل پر قدیم اسلوبِ غزل نگاری کی چھاپ بڑی گہری ہے لیکن کلام میں بے ساختہ اور بے تکلّف اظہارِ بیان کی مثالیں بھی بکثرت مل جاتی ہیں۔ آپ نے 29 فروری 1976ء کو مظفر گڑھ ہی میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:

واہ اے شوئی قسمت! نہ ہوئے ہم بیدار
جاگو، جاگو کی صداؤں پہ صدائیں آئیں
تب کھُلیں خوابِ تغافل سے ہماری آنکھیں
دُھوپ کی طرح سے جب سَر پہ بلائیں آئیں

سُرورؔ انبالوی:

اصل نام محمد یامین۔ آپ کی ولادت 15 جنوری 1927ء کو قدرت اللہ صاحب کے یہاں انبالہ شہر میں ہوئی۔ میٹرک تک کی تعلیم انبالہ ہی میں پائی۔ ہجرت کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں سے اُنھوں نے اُردو ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ شاعر بھی ہیں، نثر نگار اور تنقید نگار بھی۔ اب تک آٹھ کتابیں شائع کروا چکے ہیں۔ آج کل آپ شعرائے انبالہ پر مشتمل ایک کتاب بھی مرتّب کر رہے ہیں۔ کئی انجمنوں کے صدر اور سرپرست ہیں اور کئی انعامات واعزازات سے سرفراز کیے جاچکے ہیں۔ تعصّب، ریاکاری، بغض اور حسد سے کوسوں دُور، محبت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار آپ کے کلام کی پہچان ہیں۔

سُرور صاحب آج کل 953/2، گلی نمبر 7، ڈھیری حسن آباد، راولپنڈی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔

نمونۂ کلام:

طرح طرح کے جہاں کو عذاب دیتا ہے
فلک زمین کو جس دم جواب دیتا ہے
تمام عمر اُنہیں کے طفیل جیتے ہیں
جو زندگی کو سہارے، یہ خواب دیتا ہے
متاعِ زیست جو بخشی سُرورؔ انساں کو
تمام عُمر یہ اُس کا حساب دیتا ہے

شارقؔ انبالوی:

اصل نام عبدالحمید۔ ولادت 26 جنوری 1916ء کو قصبہ ساڈھورہ ضلع انبالہ (حال ضلع یمنانگر) میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم مسلم ہائی اسکول ساڈھورہ اور بنارسی داس ہائی اسکول انبالہ چھاؤنی سے مکمل کی۔ 1943ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیبِ فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران عروض سے دل چسپی ہوئی اور شاعری کا شوق بھی انہیں دنوں بیدار ہوا۔ شروع میں حضرت قیسؔ بوڑیوی (مصنف مثنوی ہیر رانجھا) سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں علاّمہ سحرؔ عشق آبادی کے دامنِ فیض سے منسلک ہوگئے اور اُن کی وفات کے بعد اُنہیں کے جانشین حضرت زارؔ علاّمی سے استفادہ کیا۔

تقسیمِ وطن کے بعد آپ نے کروڑ لعل عیسن ضلع لیّہ (سابق ضلع مظفر گڑھ) میں اقامت گزیں ہوکر معلّمی کا پیشہ اختیار کیا لیکن اکثر تنگ حال رہے۔ نہایت پختہ گو شاعر تھے۔ پانچ سو رعبایات کا مجموعہ بھی تیار کر لیا تھا لیکن اسے شائع نہ کروا سکے۔ ان کے اشعار میں طنز کی کاٹ بے عدیل ہے۔ اُنھوں نے شعر گوئی کے علاوہ بے شمار تحقیقی مقالے اور کچھ افسانے بھی لکھے تھے۔ شارقؔ صاحب 9 دسمبر 1986ء کو کروڑ ہی میں واصلِ بحق ہوگئے۔

نمونۂ کلام: حسبِ ذیل دو رعبایاں ملاحظہ ہوں:

بے بہرہ اقدار کہاں تھا پہلے
بیگانۂ معیار کہاں تھا پہلے
بے معنی تھے الفاظ سفارش، رشوت
مُنصف کا یہ کردار کہاں تھا پہلے

آدابِ درآمدو برآمد سیکھو
اسلوبِ حیاتِ نیک و بد سیکھو
ہے قصرِ ادب میں بھی رسائی ممکن
شائستہ مزاجی سے خوشامد سیکھو

عابدؔ انبالوی:

اصل نام عبدالغفار تھا۔ 1933ء میں شیخ محمد مشتاق کے ہاں سُنام (پنجاب) میں ولادت ہوئی۔ اُن کے والد ماجد دارالریاست نابھہ میں ملازم تھے۔ انبالہ میں اُن کی ننھیال تھی۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم نابھہ اور انبالہ میں حاصل کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد ان کا خاندان انبالہ سے ہجرت کر کے لیّہ ضلع مظفر گڑھ (اب ضلع لیّہ خاص) میں آباد ہوگیا۔ بی۔اے کرنے کے بعد اُنہوں نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں اُنہیں کئی قابل اور فاضل رہنماؤں سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔

1952ء میں وہ تپِ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہوگئے اور بالآخر 19 جون 1967ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ بیماری کے دوران ہی انہوں نے اُردو ادب میں ایم۔اے کیا اور پھر ایم۔او۔ایل اور بی ایڈ کی اسناد بھی حاصل کیں۔ ان کی کتاب ''افکارِ عابدؔ'' کے نام سے اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔ بقول پروفیسر ظہیر الحق ساقیؔ الحسینی، عابدؔ صاحب کے اسلوبِ بیان میں سادگی اور صفائی ہے اور اُن کے ہر شعر پر ان کی انفرادیت کی چھاپ ہے۔

نمونۂ کلام:

نہیں اِک تار بھی دامن میں باقی
دکھائے ہیں جنُوں نے ہاتھ کیا کیا
غمِ جاناں ہے دل کے ساتھ ناصح!

ہوا ہے گوشت ناخن سے جُدا کیا!

کتنا بھر پور ہے کانٹوں سے چمن یہ بھی تو دیکھو
سیرِ گلشن میں ہے کس درجہ چبھن ! یہ بھی تو دیکھو

شیر محمد محوؔی:

1914ء یا 1915 میں انبالہ شہر میں ان کی ولادت ہوئی۔ بچپن میں ایک بار بیمار ہوئے، ساتھ ہی آنکھیں بھی دُکھنے آئیں اور بینائی جاتی رہی۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ رمضان کے مہینے میں ہر روز مسجد میں کلامِ الٰہی سنتے ہوئے اُنھوں نے پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ بعد میں انہوں نے طبیّہ کالج دلّی سے تین سالہ کورس کر کے سند حاصل کی اور اوّل درجے میں پاس ہوئے۔ انبالہ کے صرافہ بازار میں اپنا مطب کھولا، رہائش ساتھ ہی کوتوالی بازار کے پیچھے ایک سرائے میں تھی۔ ایک لڑکا تھا، وہ بھی اُن کی طرح نابینا۔ تقسیم ملک کے بعد سرگودھا میں جا کر مقیم ہوئے۔ 1948ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شاعری میں آپ مقامی عالم اور اُستاد مولوی سوندھے خاں فیروزؔ کے شاگرد تھے۔ کلام بہت زیادہ تھا مگر بیشتر ضائع ہو گیا۔ انبالہ ہی کے معروف شاعر جناب سُرور انبالوی جو آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ محوؔی صاحب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ محوؔی صاحب نے انبالہ سے متعلق بھی ایک شعر کہا تھا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

نمونۂ کلام:

ایک صورت یہ بھی ہے انبالہ کے حالات کی
شہریت کو دیکھ، ہنستی ہے دُلہن دیہات کی

بہار آئی نہیں یہ شورِ محشر آزما کیا ہے؟
بتا تیرے جنوں پر وردہ رِندوں کو ہُوا کیا ہے
نہ لالے کی جگر چاکی سے بدلی فطرت گلچیں
نہ پُوچھا باغباں نے، بے زباں کا مُدعا کیا ہے

ناصؔر کاظمی:

پورا نام: ناصر رضا کاظمی۔ 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ شہر میں محمد سلطان صاحب کے ہاں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم انبالہ، شملہ اور لاہور میں حاصل کی۔ 1945ء میں انبالہ واپس آ گئے اور موروثی زمین کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ 1960ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اختؔر شیرانی (مرحوم) سے بہت متاثر تھے اور اُنھیں کی طرز پر کئی رومانی نظمیں اور سانیٹ بھی لکھے لیکن بعد میں غزل کہنا شروع کیا۔ بے حد حسّاس اور دردمند انسان تھے۔ میر تقؔی میر کی شاعری نے انہیں اس قدر مسحور کیا کہ بعد میں وہی درد اور تاثیر ان کے کلام کی پہچان بن گئے۔ ناصؔر کاظمی کا شعری لب ولہجہ ایک لطیف اور مُنفرد شناخت رکھتا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندو مسلم فسادات کے خونیں مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور وہ اندر سے جیسے ٹوٹ کے رہ گئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے کلام میں اُن پُر سوز اور دردناک احساسات کا جا بجا اظہار بھی کیا۔ شاعری کے علاوہ ناصؔر میدانِ صحافت کے بھی ممتاز اور کامیاب شہسوار تھے۔ ''اوراق''، ''خیال''، ''ہمایوں'' اور ''ہم لوگ'' جیسے کئی مقتدر رسالوں کے وہ مُدیر رہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''برگ نے'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے بیسیوں معتبر گلوکاران کی غزلوں اور نغموں کو گاتے آ رہے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار زبان زدِ عوام ہیں۔

4 مارچ 1974ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انبالہ ہی کے ایک اور نامور ادیب اور صحافی جناب حسن رضوی (مرحوم) نے ناصؔر کاظمی کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

نمونۂ کلام:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

یُوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دُنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تُو کہاں؟
آ اے شبِ فراق! تجھے گھر ہی لے چلیں

اے دوست! ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

غلام بھیک نیرنؔگ:

اصل نام محی الدین تھا۔ ستمبر 1876ء میں ضلع انبالہ کے ایک قصبہ میں سید قاسم علی کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ ہی حاصل کی۔ بعد میں مشن اسکول انبالہ سے 1895ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور پنجاب بھر میں اوّل رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور بی۔ اے کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ کالج میں علاّمہ اقبال ان کے سینئر تھے لیکن ان سے ایسی دوستی ہوئی کہ آخر دم تک قائم رہی۔ 1900ء کے آغاز میں انہوں نے انبالہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک نامور وکیل بن گئے۔ وکالت کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعری کی تسکین بھی کرتے رہے۔ نظم اور نثر دونوں پر انہیں یکساں دسترس حاصل تھی۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ غالب ہے لیکن وہ ایک پختہ گو شاعر تھے۔ سماجی کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ دوستوں کے تعاون سے انہوں نے

انبالہ میں ایک اسلامیہ اسکول بھی قائم کیا تھا۔

تقسیم ملک کے وقت انبالہ سے ہجرت کر کے پہلے کراچی پہنچے پھر لاہور اور راولپنڈی میں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد جھنگ میں منتقل ہو گئے تھے جہاں 16 اکتوبر 1952ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

مت پُوچھ کہ کیا کیا نہ ستم ڈھا گئیں دل پر
شرمائی ہوئی تیری شرافت کی نگاہیں
ہونے کو گُل ولالہ بھی ہیں، شمس وقمر بھی
تیری ہی طرف اُٹھتی ہیں خلقت کی نگاہیں

تحسینِ حسنِ یار میں میرا ہے وہ شریک
نیرنگ! کیوں عزیز نہ رکھوں رقیب کو!

(سوامی) واحد کاظمی:

4 دسمبر 1945ء کو قصبہ آنتری (گوالیار) میں سیّد امتیاز علی کے یہاں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ مڈل کے بعد آگے کی تعلیم لشکر (گوالیار) میں پائی۔ بوجوہ 1969ء میں گوالیار کو خیر باد کہہ دیا اور دہلی، جبل پور و لکھنو میں کچھ مدت تک قیام کرنے کے بعد 1974ء میں فریدآباد آ گئے۔ 1989ء میں آپ انبالہ آئے اور تب سے اب تک یعنی پچھلے لگ بھگ بائیس سالوں سے یہیں رہائش پذیر ہیں۔ انبالہ چھاؤنی کے ایک بوسیدہ سے ہوٹل میں کمرہ لے رکھا ہے۔ قوّتِ سماع سے یکسر محروم ہو چکے ہیں لیکن خلوت گزیں اور گوشہ نشیں ہو کر اپنے ادبی و تحقیقی کام میں منہمک رہتے ہیں۔

آپ پہلے اُردو میں کئی مضامین و مقالے تحریر کر چکے ہیں لیکن اب ایک مدّت سے ہندی میں لکھتے ہیں۔ ان سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ اب بھی بیشتر مضامین اُردو شعراء اور اُدباء یا اُردو ادب کے کسی موضوع پر لکھتے ہیں اور یہ تخلیقات نہ صرف ہندی رسائل میں شائع ہوتی ہیں بلکہ اردو کے کئی مقتدر مجلّے ان کا ترجمہ کروا کے اپنے جریدوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ سوامی واحد کاظمی کوئی بھی مقالہ لکھنے سے پہلے اپنی جسمانی معذوری کے باوصف خدا معلوم کہاں کہاں سے پوری کھوج اور چھان بین کر کے ایسے ایسے حقائق کو پُورے حوالوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ایک عام محقق کو انہیں یکجا کرنے میں کئی برس لگ جائیں۔ ادب کے فروغ وارتقا کے لئے اس مردِ قلندر کی یہ تحقیقی اور تنقیدی تحریریں یقیناً لائقِ تحسین ہیں۔ مزاجاً بھی آپ ایک درویش صفت انسان ہیں۔

آچاریہ رجنیش (مرحوم) کے فلسفہ اور نظریہ حیات سے بے حد متاثر ہیں ان کے نام سے پہلے ''سوامی'' کا اضافہ آچاریہ رجنیش ہی کا کیا ہوا ہے۔ آپ صرف نثر لکھتے ہیں اور آج کل کمرہ نمبر 10، راج ہوٹل، پُل چمیلی، انبالہ چھاؤنی۔ 133001 میں قیام پذیر ہیں۔

وقاؔر انبالوی:

اصلی نام ناظم علی تھا۔ ان کی ولادت ضلع انبالہ کے مشہور قصبہ مُلّا نا میں صفدر علی صاحب کے ہاں 1892ء میں ہوئی تھی (پروفیسر امیر چند بہاؔر نے اپنے منظوم تذکرہ ''سرودِ رفتہ'' میں ان کا یومِ ولادت 22 فروری 1904 درج فرمایا ہے) وقاؔر صاحب کے والد گرامی اسکول ماسٹر تھے۔ ان کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و ادب کی طرف راغب تھی۔ بقول ڈاکٹر تمنّا انبالوی (مرحوم) ''وہ ایک الّھڑ قسم کے کھدر پوش نوجوان تھے جو اپنے کاندھے پر کھدّر کا ایک تھیلا لٹکائے ہوئے انبالہ کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ لاہور چلے گئے جہاں ان کی طبیعت کی روانی اور افکار کی جولانی دیکھ کر بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں نے اُنہیں اپنے مشہور زمانہ روزنامہ ''زمیندار'' میں ملازم رکھ لیا۔ بعد میں انہوں نے کئی دیگر روزناموں میں بھی بطور مُدیر ذمہّ داریاں نبھائیں اور ان اخبارات کے لئے اداریے، مزاحیہ کالم اور کئی زوردار نظمیں اور قطعات لکھے۔ آخر میں وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ساتھ منسلک رہے۔ اسی اخبار نے فروری 1988ء میں اُن کی 95ویں سالگرہ جوش وخروش کے ساتھ منائی۔ اس تقریب میں صدر ملک جنرل ضیاء الحق کی طرف سے پچاس ہزار روپے کا چیک بھی بطور نذرانہ اُنہیں پیش کیا گیا تھا۔

اُردو کے علاوہ وہ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے انگریزی حکومت کے دور میں حُبّ وطن کی کئی جوشیلی اور باغیانہ نظمیں بھی لکھیں جنہیں انگریزی سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔

26 جون 1988ء کو آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ آخر کار غروب ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

بڑھو بہادرو بڑھو۔ علم وطن کا کھول کر
کرو مقابلہ عدو کا تیغ تول تول کر

وطن کی آن تُم سے ہے۔ وطن کی شان ہو تمہیں
وطن کی لاج تم سے ہے، وطن کا مان ہو تمہیں

لڑو تو اس طرح لڑو، بہادری نثار ہو
مقابلہ ہو موت سے تو موت شرمسار ہو

(ذیل میں مذکورہ شعراء اور ادباء کے بارے میں زیادہ تفصیلات حاصل نہیں ہو سکیں۔ بہرحال جو کچھ معلوم ہو سکا درج کیا جا رہا ہے)

اجؔل انبالوی:

خُمروں والی مسجد (انبالہ چھاؤنی) کے امام تھے۔ رہائش بھی وہیں

تھی۔اُردو فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے۔انبالہ کے معروف شاعر ڈاکٹر رام کشن تمنّا کے اُستاد تھے۔تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔

بلقیس اختر:

آبائی وطن انبالہ ہے۔تقسیم ملک کے وقت دوسال کی تھیں۔اپنے والدین کے ہمراہ لاہور آ گئیں اور اپنی ابتدائی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ایم۔اے اور بی۔ایڈ کی اسناد حاصل کر کے تعلیم و تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ان کے والد بھی اسکول کے ماسٹر تھے۔بسمل لکھنوی صاحب کی دُختر نیک اختر اور بذاتِ خود معروف شاعرہ محترمہ منوّر سلطانہ نے مجلّہ ''گلفشاں'' (لاہور) کے غالب نمبر۔2 (اپریل 1969ء) میں بلقیس اختر کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ''وہ کاوش اور لگن کو ایمان بنائے ہوئے زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد کرتی ہے اور اگر اس میں کوئی چیز قابلِ ستائش ہے تو وہ اس کی اَنا ہے''۔

نمونۂ کلام:

جو مل سکا کہیں نہ جہانِ خراب میں
ہم نے وہ چین ڈھونڈ لیا اضطراب میں
کرتا تھا وہ تو خواب میں آنے سے بھی گُریز
تصویر جس نے بھیج دی رکھ کر کتاب میں
یہ حُسن کا ہے ظرف کہ وہ عشق کے لیے
کچّے گھڑے پہ تیر گیا ہے چناب میں

بسمل انبالوی:

اصل نام مُنشی محمد عبدالرحمٰن تھا۔اکتوبر 1916ء میں گیا کے ایک یادگار طرحی مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔

نمونۂ کلام:

عاشقوں کو غش نہ آئے رُوئے تاباں دیکھ کر
کھولیو بند نقاب اے آفت جاں! دیکھ کر
کہہ کہ بلبل سے چمن میں یوُں صبا چلتی ہوئی
جاتی ہوں میں بے ثباتی گلستاں دیکھ کر

تبرّ انبالوی:

اصل نام نُور بخش تھا۔(ان کے بارے میں اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا)

(کسی طرحی سے مشاعرے سے) نمونۂ کلام:

ہم پہ کی اِک مہربانی جائے گی
اک ہماری بات مانی جائے گی
داغِ فرقت دل پہ ہے اے تبرّ
قبر میں اک نشانی جائے گی

خادم انبالوی:

پورا نام خادم حسین تھا۔کوثر خیرآبادی کے شاگرد تھے۔

(ایک طرحی غزل سے) نمونۂ کلام:

لذّت دُنیائے فانی جائے گی
جائے گی یہ زندگانی جائے گی
باز آ خادم! بُتوں کے عشق سے
مُفت میں تیری جوانی جائے
گی

ساغر انبالوی:

اصل نام محمد اسماعیل تھا۔اور اِن کے بارے میں کُچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

(ایک طرحی غزل سے) نمونۂ کلام:

وصل کی جس روز ٹھانی جائے گی
دردِ ہجراں کی گرانی جائے گی
مبتلائے عشق ساغر! گر ہوئے
خاکِ کوئے یار چھانی جائے گی

سعید انبالوی:

اصل نام سعیدالدّین احمد تھا۔

(ایک طرحی غزل سے) نمونۂ کلام:

حُور کے دامن میں چھانی جائے گی
کم نہ ہو جائے، نہ مانی جائے گی
اس کے آتے ہی قیامت آ گئی
دیکھئے کب یہ جوانی جائے گی

سوختہ:

پُورا نام ڈاکٹر سیّد محمد مجتبیٰ تھا۔شاعر، ڈانسر اور ستار نواز تھے۔ان کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

شفقت انبالوی:

ان کے بارے میں اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ایک طرحی غزل کے یہ دو اشعار ملے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

نمونۂ کلام:

چار دِن کی چاندنی مشہور ہے
اے صنم! اِک دن جوانی جائے گی
گرنہ شفقت! ان کو لایا راہ پر
تیری لِسانی نہ مانی جائے گی

سوندھے خاں فیروز:

مولوی سوندھے خاں فیروز انبالہ کے کسی نزدیکی گاؤں کے رہنے والے تھے خالصہ ہائی اسکول انبالہ شہر میں اردو فارسی مضامین کے ہیڈ ٹیچر تھے۔

سیاہی مائل رنگ تھا۔اچھے خاصے تومند اور ہنس مکھ انسان تھے۔ ہر کسی سے خلوص محبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے۔ سر پر ہمیشہ طُرّہ دار پگڑی ہوتی تھی۔ کلین شیو تھے اور ہٹلر کٹ مونچھیں رکھتے تھے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی مذاہب کے افراد ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ کلام بہت پختہ اور دلوں کو متاثر کرنے والا تھا۔ کوئی مجموعۂ کلام شائع نہ کروا سکے۔ ایک نعتیہ شعر ان کا دستیاب ہوا ہے۔

ذرّے جو چھو گئے کفِ پائے حضور سے
خورشید نُور بن گئی خورشیدِ نُور سے

سُنا ہے 1947ء کے فسادات میں ہلاک ہو گئے تھے۔ انبالہ ہی کے دو معروف شاعر حافظ شیر محمد محوؔی اور ڈاکٹر ہری چند گل فیروزؔ صاحب کے حلقہ تلمذ میں سے تھے۔

قمؔر انبالوی:

اکتوبر 1916 میں گیا کے ایک یادگار طرحی مشاعرہ میں شریک ہوئے تھے۔

نمونۂ کلام:

محوِ حیرت جب ہوا میں روئے تاباں دیکھ کر
خود بھی حیراں ہو گئے وہ مجھ کو حیراں دیکھ کر
گدگدایا اور بھی شوقِ شہادت نے مجھے
قتل گہہ میں خنجرِ قاتل کو عُریاں دیکھ کر

محشؔر انبالوی:

ڈرامہ نویس تھے اور انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ ان کا ایک ڈرامہ غریب ہندوستان عرف ''انقلاب'' یعنی ''سودیشی تحریک'' بہت مشہور ہوا تھا۔

نیّر انبالوی:

ڈرامہ نویس تھے ان کا ایک ڈرامہ ''وطن'' بہت مشہور ہوا تھا۔

ضلع انبالہ سے تعلق رکھنے والے ان حضرات کے صرف اسمائے گرامی ہی دستیاب ہو سکے ہیں:

اقبالؔ ادیب، ساجد اسدؔی، عبدالرشید شیدؔا، منشی فخر الدین، سراج احمد لاؔلہ اور محمد انصارؔی۔

حوالہ جات:

۱۔ جعفؔر بلوچ ''آیاتِ ادب'' (تذکرۂ شعرائے لیہ و مظفر گڑھ)، لاہور، مکتبہ عالیہ، 1998ء
۲۔ جعفؔر بلوچ (مرتّب)، مجالسِ اقبالؔ، لاہور، دار التذکیر، 2002ء
۳۔ حسؔن رضوی، ''عقیدتیں'' لاہور الحسن پبلی کیشنز، 2003ء
۴۔ ساقؔی الحسینی، ''اشارات'' مرتبہ جعفؔر بلوچ (تنقیدی مضامین)، لاہور، دار التذکیر، 2005ء
۵۔ شاہؔد اقبال، ''ہریانہ کے چند گم نام شعراء'' (صفحات 80 تا 87) بشمولہ کتاب ''ہریانہ کا اردو ادب'' مرتبہ دیس راج سپرو شاہ آباد، محلّہ ماجری، 1996ء
۶۔ ''گلفشاں'' (پندرہ روزہ) غالب نمبر۔2، جلد 3، شمارہ 4 اپریل 1969ء مرتبہ سیفؔ زلفی، لاہور، 22 نکلسن روڈ۔
۷۔ ''نیا دور'' (ماہ نامہ) مضمون: ''جنگ آزادی اور اردو ڈرامہ'' از درخشاں تاجوؔر، صفحہ 14، لکھنؤ، مارچ 2007ء
۸۔ حضرات حسن عسکرؔی کاظمی (لاہور)، پروفیسر جعفر بلوچؔ (لاہور)، سُرورؔ انبالوی (راولپنڈی) اور اقبال سحرؔ انبالوی (لاہور) کے بے شمار خطوط راقم السطور کے نام۔

☆

''سانسوں کا سنگیت''

مسعود مفتی

(اسلام آباد)

گہری دھند انسانی حواس کو معطل کر دیتی ہے۔ بصارت و سماعت اور قوتِ شامہ بے بس۔ اور ذہن ماؤف۔ جیسے زندگی سے مہکتا ہوا شہر آندھی کے طوفان میں گُم ہو جائے۔

قدرت نے انسان کو جو بھی مثبت صلاحیت دی ہے۔ دھند اس کی نفی کر دیتی ہے۔ مگر اس کی اپنی گہری یکسانیت اور غیر شفاف یک رنگی کا تجزیہ ممکن نہیں۔

رتن سنگھ نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔

رتن سنگھ کی عنایت سے ایک سو صفحات پر مشتمل (سانسوں کا سنگیت) مجھے ملی۔ اور محض ذائقہ چکھنے کو اس کی ورق گردانی کی۔ تو الجھن ہوئی کہ یہ کس قسم کی تحریر ہے۔ بالکل دھند میں گھیرنے والی جیسی الجھن۔ چنانچہ مناسب وقت پر پڑھنے کے لئے الگ رکھ دی۔ مگر الجھن بڑھتی رہی۔ اٹھتے بیٹھے، گھومتے پھرتے اسی کا خیال آتا رہا۔ اور بالآخر یہی مجبوری اس کتاب تک دوبارہ لے گئی۔

اب جو اٹھائی تو ایک ہی نشست میں ختم ہوگئی۔ اور میں مسرت آمیز حیرت کی اُس منزل پر جا پہنچا۔ جہاں ادب کا قاری کبھی کبھار ہی پہنچتا ہے۔ حیرت اس بات کی کہ جانکنی سے نڈھال ذہن کی دھندلی کیفیات کو تخیل کی اڑان سے کس طرح گرفت میں لایا گیا ہے۔ اور مسرت اس گنجلک کو سلجھانے کی کامیابی پر۔

یہاں دھند سے تقابل بلا وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ کتاب کا مرکزی کردار ہی زندگی کی شام کے دھندلکے (TWILIGHT) میں گھرا ہوا انسان ہے۔ جو متحرک زندگی اور ساکن موت کے موہوم سنگم پر بے چینی سے ہاتھ پاؤں ہلا کر خود کو تلاش کر رہا ہے کہ وہ اس سرحد کے کس طرف ہے۔ اس دھندلکے کی اوٹ میں زندگی اور موت میں یہی کشمکش اسی دھند کا معنی خیز تجزیہ کر دیتی ہے۔ جس میں تانے پیٹے اور دیگر تمام اجزائے ترکیبی خوردبین تلے نظر آتے ہیں۔ تخیل کی زقندیں انہیں کئی گنا بڑا کر کے دکھا دیتی ہیں۔ اور بیان پر بھرپور گرفت قاری کو خوشگوار ابلاغ تک لے جاتی ہے۔ ایک سہہ طرفی (THREE DIMENSIONAL) ابلاغ۔۔۔ جس میں کن فیکون کی ملفوف حکمت کے پرت مور کے پروں کی طرح کھلتے جاتے ہیں۔ اور کائنات کے اندرونی ڈھانچے کے بنیادی اصول دھیرے دھیرے ابھرنے لگتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ سطور اس کتاب پر تبصرہ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ذاتی ردِعمل ہے۔ مروجہ ادبی اصولوں کے تحت یا کسی نقاد کی تنقید نہیں۔ بلکہ بے ساختگی کے عالم میں ایک مخصوص قاری کی تحسین ہے۔ عین ممکن ہے۔ دیگر قارئین اس تصنیف سے مختلف انداز میں متاثر ہوں۔ یا اگر اسی انداز سے ہوں۔ تو کم تر شدت سے ہوں۔ اسی لئے مجھے ''مخصوص قاری'' کی اصطلاح پر اصرار ہے۔ جس میں مصنف اور اس قاری کے ماہ و سال کی قربت کی طرف اشارہ ہے۔ ہم دونوں زندگی کے اس مرحلے کے RING SIDE تماشائی ہیں جو اکھاڑے کے بالکل ساتھ اگلی قطار میں اکٹھے بیٹھ کر زندگی اور موت کا مقابلہ دیکھ رہے ہوں۔ اور کھلاڑیوں کی جارحیت۔ دماغ، چھوٹی بڑی حرکات بلکہ باریک ترین جنبش کو بھی بیک وقت دیکھ سکتے ہوں۔ زمان و مکان کی اس قربت سے ایسے لوگوں کے مابین ایسا مخفی تعلق ہوتا ہے جو لکڑی کے تانے ہوئے پہلے تار کی طرح دوسروں کو نظر نہیں آتا۔

اس کتاب کا کینوس وسیع مگر پلاٹ انتہائی مختصر ہے۔ جو باکسنگ میچ کے آخری راؤنڈ کی طرح بالکل مختصر بھی ہے فیصلہ کن بھی ہے اور مستقبل کے مضمرات سے لبریز بھی ہے۔ ایک بوڑھا آدمی ہسپتال میں میڈیکل آلات کے الجھے ہوئے تاروں، اور کئی قسم کی نلکیوں کو جسم میں کھبوئے بستر پر پڑا ہے۔ موت وحیات کی کشمکش اپنے آخری راؤنڈ پر پہنچ چکی ہے۔ اس کا ذہن کبھی ناہموار سی حرکت کرتا ہے۔ اور کبھی نامکمل طور پر ساکت ہو جاتا ہے۔ شعور اور لاشعور کی اس دھکم پیل میں وہ ذہن کئی قسم کی قلابازیاں کھا رہا ہے۔ مقولے۔ علمی اور اساطیری حوالے۔ وسوسے۔ امیدیں۔ مایوسیاں۔ تجربے۔ مشاہدے۔ خواہشیں۔ مذاہب اور فلسفوں کے ملبے کے ٹکڑے اس غیر مربوط ذہن میں کبھی جھکڑ بن کر گھسے آتے ہیں۔ اور کبھی باد صبا کی طرح رینگنے لگتے ہیں۔ جیسے دھوئیں کے منڈلاتے بادل میں چنگاریاں اور راکھ کے ذرے آپس میں الجھتے رہتے ہیں۔ اور سارے موہوم اجزا مل کر ہر قسم کی روشنی کا راستہ روک دیتے ہیں۔ مریض کا جانکنی میں ادھ موا ذہن ان متلاطم اور متصادم لہروں کے طوفان سے نکل کر زندگی کے ساحل تک پہنچنے کی تگ و دو میں بے دم ہوتے ہوئے بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے ہوش میں آتے ہی کہانی کا پلاٹ تو ختم ہو جاتا ہے۔ مگر قاری کی سوچوں کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ خود خیالات کے نرغے میں آ جاتا ہے۔

قانونِ قدرت کے کئی پرت ہوتے ہیں۔ مثلاً جنسِ مخالف کی موجودگی کا احساس مرد یا عورت کو اُس کے جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا وسیع تر پرت یوں ہے کہ زندگی کا صحیح ادراک اسی وقت ہوتا ہے جب زندگی روٹھ کر جا رہی ہو۔ اس کا تیسرا پرت دروں بینی تک پھیل جاتا ہے۔ کہ زندگی کی کس منزل میں یہ تعلق ٹوٹ رہا ہے۔ اونچے مینار کی مختلف منازل پر تماشائی کا منظر نامہ مختلف ہو جاتا ہے۔ نچلی منزلوں پر محدود اور چوٹی کے گنبد پر لامحدود اور

افق تک پھیلا ہوا۔اسی مناسبت سے یہ رشتہ ٹوٹتے وقت اسی ادراک کی ماہیت بھی مختلف ہوتی ہے۔اسی طرح ہر قاری پر اس کتاب کا متن بھی مختلف انداز میں اثر انداز ہوگا۔اس کا بیانیہ۔علامتیں۔تلمیحات اور حوالے بھی ہر قاری کے لئے علیحدہ علیحدہ پرت کھولتے ہیں۔اسی لئے میں بعض خوبصورت اقتباسات پیش کرنے سے گریز کررہا ہوں۔کیونکہ حس کے مرقع میں سے کوئی لب و رخسار کو پسند کرتا ہے۔تو کوئی چشم و مژگاں کو۔کوئی زلف کے پیچ۔کوئی گردن کے خم کو اور کوئی مجموعی تناسب و تاثر کو۔اسی طرح یہ کتاب حسن کی اپیل کی طرح آفاقی بھی ہے۔اور حسن کی تفصیل کی طرح اختلافی بھی۔غالباً اسی وجہ سے کتاب شائع کرنے والی اتر پردیش اردو اکیڈمی نے بھی اندراج کیا ہے۔کہ ان کا ''کتاب کے مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں''۔

ہندی اور سنسکرت سے ناواقفیت کی بنا پر میں بعض فقروں اور خیالات سے پوری طرح مستفید نہیں ہوسکا۔مگر ان کے بہاؤ کے رخ سے آگاہ رہا۔کیونکہ مرکزی کردار کی منتشر خیالی اور مصنف کے طرز بیان کا سارا رخ ایک ہی طرف ہے۔روئے زمین پر بہنے والے تمام ندی نالوں اور دریاؤں کی طرح جو اپنے موڑ توڑ اونچ نیچ اور گھٹتے بڑھتے پھیلاؤ کے باوجود ہر دم سمندر کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔اسی طرح اس تحریر کا بہاؤ بھی ایک ہی مرکزی خیال کی طرف ہے۔جو مصنف کے الفاظ میں یوں ہے۔

''پوری قدرت، پوری کائنات کا ایک جسم ہے اور ہم سب
جیو، جنتو، بندے، پودے، دھرتی، آسمان، سورج، چاند
اور ستارے قدرت کے اس ایک جسم کا حصہ ہیں۔۔۔۔
اپنے آپ میں سب ادھورے، سب کے ساتھ مل کر سب
پورے۔۔۔۔ماضی اور حال کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے ہوا،
مستقبل کی طرف بڑھتی ہوئی وقت کی لامحدود ذات کا
حصہ بنتی ہوئی اسی میں نئی زندگی پھونک رہی ہے''

اس مرکزی خیال کو قبول کرنے میں کائنات کے ایک رکن انسان کے بہت سے تحفظات ہوسکتے ہیں۔مثلاً ظاہری اور باطنی حسن کی ناہموار اور غیر مساوی بانٹ۔انسانی فطرت میں خیر و شر کا تضاد اور تصادم۔نسل و رنگ کی تفریق۔تقدیر اور تدبیر کی لاینحل پہیلی۔اور مجبوری اور مختاری کا معمہ وغیرہ۔لیکن اس کے باوجود اس میں ایک معنوی۔مجموعی اور جمالیاتی سچائی ہے۔جس کے شواہد تو موجود ہیں۔مگر آپس میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔

غالباً اس الجھاؤ کے اظہار کے لئے کتاب میں تفاصیل کی تکرار بھی ہے۔جوان تاروں کو الگ الگ کرکے دکھانے کے لئے کسی حد تک ضروری تھی۔

رتن سنگھ نے اس انتہائی مشکل مہم کو بڑی کامیابی سے سر کیا ہے۔کہ تھوڑے الفاظ مگر بہت زیادہ اور بہت گہرے معنی۔مگر یہی مخصوص انداز تو انہیں رتن سنگھ بناتا ہے۔

بقیہ:شام کی منڈیر سے

''شام کی منڈیر سے'' اس حقیقت کو بھی سامنے لاتی ہے کہ وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کے خلاف بھی منفی پروپیگنڈے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا جبکہ انہوں نے دیباچے میں واضح طور پر لکھا تھا:

''کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں اس زبان اور اس کی شاعری نے جنم لیا ہے۔''

وزیر آغا نے تاریخ اور تہذیب کی سطح پر برصغیر میں پروان چڑھنے والی شاعری کی تین اصناف گیت، غزل اور نظم کا تجزیہ پیش کیا اور نئے نتائج اخذ کیے۔لیکن انہیں شدید ردّعمل کا سامنا کرنا پڑا۔اختلاف کی اس دل دوز داستان کو اس کتاب میں وزیر آغا نے خنک مزاجی سے پیش کیا ہے اور اس تنگ نظری کو بھی آشکار کیا ہے جو ہمارے ادبی اور علمی حلقوں میں پروان چڑھ چکی ہے۔

''شام کی منڈیر سے'' کا دوسرا حصہ ۱۹۶۸ سے ۲۰۰۶ء تک کی فکری داستان ہے۔اس دور میں وزیر آغا گاؤں چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور میں آباد ہو چکے تھے۔اس دور میں ہی انہیں تین یا چار مرتبہ بھارت کی راجدھانی دہلی جانے اور ایلورا اور اجنتا کے ثقافتی آثار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ایک طویل سفر لندن کا اختیار کیا۔اس حصّے میں دونوں ملکوں کے ادیبوں کے ساتھ ملاقاتیں اور مختلف موضوعات پر مباحثے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔وہ دوستوں کے ایک وسیع حلقے سے محوِ کلام ہیں، نئے دوستوں کا یہ حلقہ لاہور میں بھی قائم ہے اور شہر سے دور لاہور چھاؤنی میں وہ شامِ دوستاں بھی آباد نظر آتی ہے جو کبھی سرگودھا میں قائم تھی۔وزیر آغا اب اپنی عمرِ عزیز کے ۸۷ برس گزار چکے ہیں۔اپنے داماد زوار حسین اور اپنی بیگم کی وفات کے سانحات کے علاوہ خود بھی ایک حادثے کا شکار ہو چکے ہیں جس میں ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔لیکن ''شام کی منڈیر سے'' ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی ایک زندہ دل انسان کی طرح اپنے افکار کی روشنی میں بسر کی اور اپنی رجائیت کو ہمیشہ قائم رکھا۔

ڈاکٹر پرویز پروازی نے درست لکھا ہے کہ ''شام کی منڈیر سے'' دوسری خودنوشتوں سے ممتاز ہے اور یہ ایک ایسے شخص کی خودنوشت ہے جس نے تنقید کو نیا لب و لہجہ دیا۔انشائیہ کو نیا ڈھنگ اور اپنی کہانی کو اظہار کا نیا آہنگ دیا اور خود کسی چیز کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا۔۔۔اسے جتنا متنازع بنانے کی کوشش کی گئی وہ اتنا ہی ابھر کر نکھر کر سامنے آیا۔

''تقدیر بنی ہے دیواریں''

(پروفیسر جمیل واسطی مرحوم سابق سربراہ شعبہ انگریزی یونیورسٹی آف سندھ کے مجموعۂ کلام ''بہکی باتیں'' سے چنیدہ نگینے)

پروفیسر خورشید احمد صدیقی
(میرپورخاص)

مجھے قرار نہیں، بیقرار رہنے دے — امید رہنے دے، کچھ انتظار رہنے دے
بدل نہ جائے زمانہ یہ اعتبار نہ کر — جفا کے پردے میں تھوڑا سا پیار رہنے دے
جو تُو نگاہ میں آئے تو پھول کھلتے ہیں — بہار بیت نہ جائے، بہار رہنے دے
بوقتِ قتل مجھے خونبہا تو مل جائے — نگاہ اپنی ذرا شرمسار رہنے دے
نئی جفا نہ ہو ظالم کی یہ خود آرائی — خدایا دل پہ مجھے اختیار رہنے دے
بُتوں سے واسطی امید التفات نہ رکھ — خود اپنے حسن کا اُن کو خمار رہنے دے

○

بربادی سامنے آنکھوں کے دیوار پہ گو مرقوم بھی ہے — جو ہو کے رہے گا ہونے دو، اُس بت سے وفا مقسوم بھی ہے
انجان نہیں انجان بھی ہیں، اندازِ تغافل کیا کہیئے — گویا کہ مرے دل کی حالت معلوم نہیں معلوم بھی ہے
تہذیب ہزاروں سال کی ہے فطرت پہ مگر کچھ ضبط نہیں — تنہائی خود اک دیوانگی ہے جو مجلس میں معدوم بھی ہے
امید اور نا امیدی سے یکدم ہے تعلق وعدوں کا — یوں ان کے کرم سے دل میرا محروم نہیں محروم بھی ہے
کیا کیا نہ کیا مجھ سے دل نے کیا کیا نہ ہوا اس دل سے بھی — مجبور ہوں اپنے دل سے میں جو ظالم ہے مظلوم بھی ہے

○

ممکن ہے ہماری غلطی ہو اور عقل ہو اِن دیوانوں میں — اسرارِ حقیقت کہتے ہیں، کہتے ہیں مگر افسانوں میں
اپنوں نے تو مارے پتّھر پر بیکس نے بھی بدلہ لے ہی لیا — زخموں سے گرا جو خونِ وفا وہ بانٹ دیا بیگانوں میں
دل کاٹ کے رکھ دیا پاؤں پہ، گو پتّھر کی تھی دیوی جھوم گئی — حیرت ہے برہمن کانپ اٹھا نغموں کی صدا تھی کانوں میں
جب عشق نے موت کو للکارا مائل بہ سجود ہوئی فطرت — کہتے تھے ملائک بھی کہ عجب اسرار ہے ان انسانوں میں
گو حسرتیں بن تو گئے ارمان پر واسطی چین نہ دل کو ملا — شعلے لپک اٹھتے ہیں اب بھی، کچھ جان تھی ان ہیجانوں میں

○

ہمت نہ ہوئی مایوسی میں پر تم جو بُلاتے آ جاتے — تاریک تھی شب رہ پا نہ سکے، تم راہ بتاتے آ جاتے
دل ٹوٹ کے بکھرا خاک پہ، ہم دیکھا کیے دل کے ٹکڑوں کو — تم یاد جو کرتے بھول کے بھی، ٹکڑوں کو اُٹھاتے آ جاتے
دن رات کسک تھی سینے میں راحت نہ رہی تھی جینے میں — امید نے بھی دھوکہ نہ دیا، دھوکے میں جو آتے آ جاتے
مانا تمہیں ملنا مشکل ہے تقدیر بنی ہے دیواریں — تم ایک اشارہ کر دیتے، ہم جان سے جاتے آ جاتے
ہے واسطی ان کو شکوہ کیوں؟ خود آ جاتے کچھ روک نہ تھی — ہم پاؤں ہتھیلی پر لیتے، آنکھوں کو بچھاتے آ جاتے

○

ایک صدی کا قصہ

اے۔آر۔کاردار

دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

اے۔آر۔کاردار جسکا پورا نام عبدل رشید کاردار تھا، 1904 میں لاہور کے ایک آسودہ حال زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی آرٹ کی طرف رجحان تھا۔ وہ جب سن بلوغت کو پہونچا تو اُس نے مصوری کو پیشے کے طور پر چنا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اُسنے پینٹنگ اور کیلی گرافی میں بلا کی مہارت حاصل کی۔ اُن دنوں ملک میں برطانوی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ کاردار ان کے پوسٹر بنایا کرتا تھا۔ وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔ مصوری پر تو اُس نے دسترس حاصل کی ہی تھی ساتھ ہی وہ اپنے قلم کے جوہر بھی دکھانے لگا۔ 1920 میں وہ کئی اخبارات کے لئے باقاعدگی سے مضامین بھی لکھنے لگا جنہیں لوگ پسند کرنے لگے۔ فلم پوسٹر بنانیکے دوران اُسکی ملاقات کئی فلمی ہستیوں سے اکثر ہو جایا کرتی تھی۔ اُن سے ملنے کے سبب اُس میں اداکاری کرنے کا شوق در آیا۔ اُس کا ایک ہم پیشہ اور ہم عمر تھا جسکا نام محمد اسمعٰیل تھا جو اُسی کی طرح کیلی گرافی میں ماہر تھا۔ دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ اسمعٰیل کو بھی فلمی اداکاری کا جنون سوار ہوا تھا۔ جب وہ کہیں ساتھ بیٹھتے تھے تو کیلی گرافی کو بھول کر فلموں کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ فلموں کی للک انہیں لاہور سے بمبئی کھینچ کر لے گئی۔ اُن دنوں فلموں کا گڑھ بمبئی تھا۔ سارے چھوٹے بڑے فلم ساز بمبئی میں دفتر کھول کے بیٹھے تھے۔ 1927 میں وہ اسمعٰیل کے ساتھ بمبئی پہونچا۔ قسمت سے اسمعٰیل کو فلم ''ہیر رانجھا'' میں ولن کے طور کام کرنے کا موقع مل گیا جب کہ کاردار کو ایک چھوٹے سے رول پر اکتفا کرنا پڑا۔ 1922 میں اے۔آر۔کاردار کو'' کوہ نور فلم کمپنی'' میں پوسٹر بنانے کا کام مل گیا۔ اس کمپنی کے کام کے ساتھ ساتھ اُس نے ''شارداسٹوڈیو'' کے پوسٹر بنانے کا کام بھی پورا کیا۔ اس کام سے جو آمدنی ہوتی تھی اُس سے اُسکے سارے خرچے پورے تو ہوتے تھے البتہ وہ جو ارمان لاہور سے لے کے اس شہر میں آیا تھا وہ اُسے پورے ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ کچھ بڑا کام کرنا چاہتا تھا اسلئے وہ اسمعٰیل کو لے کر بمبئی سے لاہور واپس چلا آیا۔ کاتب تقدیر نے اُسکی قسمت کے بہی کھاتے میں ایک نئی عبارت لکھی تھی۔ اُسکی ملاقات جے۔کے۔مہتہ سے ہوئی۔ مہتہ نارتھ ویسٹ ریلوے کا ایک سابقہ آفیسر تھا جسکو فلم بنانے کا جنون سوار ہوا تھا۔ اُس نے نوکری کو خیر باد کہہ کے لنڈن سے ایک فلم کیمرہ درآمد کرالیا۔ اُسنے کاردار کو معاون ہدایت کار کے طور پر کام کرنے کی پیشکش دی جسے اُسنے فوراً لبیک کہا۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بات معاون ہدایت کاری سے شروع ہو کے اداکاری پر ختم ہوئی۔ مہتہ نے کاردار کو لیڈ ایکٹر کے طور پر سائن کیا۔ کاردار نے اپنے کیلی گرافر دوست اور بھروسے مند ساتھی محمد اسمعٰیل کو بھی اس فلم میں ایک اچھا خاصا رول دلوادیا۔ اس فلم کو شنکر دیو آچاریہ نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ کاردار کے مقابل ہیروئن کا رول ولائت بیگم نے ادا کیا تھا۔ اسکے علاوہ اس فلم میں کام کرنے والے کلاکاروں میں ہیرا لال، وجے کمار، اسمعٰیل اور ماسٹر غلام وادر شامل تھے۔ 1928 میں لاہور میں بننے والی یہ پہلی خاموش فلم ''ہندوستان کی بیٹی'' ریلیز ہوئی۔ اُن دنوں لاہور میں کل ملا کر آٹھ سینما گھر تھے جن میں یا تو ہالی وڈ میں بنی فلمیں دکھائی جاتی تھیں یا بمبئی اور کلکتہ میں بنی خاموش فلمیں۔ ''ہندوستان کی بیٹی'' جے۔کے مہتہ کی ذہنی اُپج تھی۔ اس فلم کی فلم بندی لاہور کے بریڈلا ہال کے نزد ایک کھلے اسٹوڈیو میں ہوئی۔ اُن دنوں ساری فلمیں اسٹوڈیو میں ہی بن کر تیار ہوتی تھیں۔ کئی سارے اسٹوڈیو بند ہو گئے تھے۔ وجہ پیسے کی تنگی اور مالی خسارہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جے۔کے۔مہتہ کو کھلے اسٹودیو میں اس فلم کو مکمل کرنا پڑا۔ فلم بن کر ریلیز ہوگئی۔ اے۔آر۔کاردار کو اس فلم کے بعد کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ وہ بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو کے اپنے گھر بھاٹی گیٹ چلا گیا۔ بھاٹی گیٹ کی زمین ادبی لحاظ سے بڑی زرخیز تھی۔ یہاں شاعروں اور ادیبوں کی بہتات تھی۔ اب ان میں ایک کلاکار بھی شامل ہو گیا تھا۔ کاردار بڑا ذہین اور نابغۂ فن کار تھا جسے اس بات کا ادراک تھا کہ آنے والے دور میں فلم اور فلم انڈسٹری کا مستقبل کافی روشن اور منعفت بخش ہوگا۔ 1928 میں کاردار اور اسمعٰیل نے اپنی ساری جائیداد بیچ ڈالی اور'' United players corporation'' نام سے لاہور میں اپنی فلم کمپنی کی نیو ڈالی۔ کئی مہینوں تک وہ آفس کے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے کی تگ ودو میں لگے رہے۔ آخر مہینوں کی محنت رنگ لائی اور اُنہوں نے راوی روڈ لاہور میں اپنے دفتر قائم کئے۔ یہاں پر اُنہیں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں پر بجلی کی فراہمی تھی ہی نہیں۔ یہاں پر شوٹنگ دن کے اُجالے میں ہی ممکن ہوتی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ جگہ بہت ہی دیدہ زیب تھی اور فلموں کے لئے بہت ہی موزوں لوکیشن تھی۔ اسکے مضافات میں راوی فارسٹس تھے جو اس علاقے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ علاوہ ازیں یہاں پر مغل حکمران شاہجہاں اور ممتاز محل کے مقبرے موجود تھے۔ جنکے طرز تعمیر کو دیکھ کر لوگ محو حیرت رہ جاتے تھے۔

1930 میں اے۔آر۔کاردار نے اپنے بینر تلے پہلی فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ کام بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ شوٹنگ کے لئے باہر جاتے تھے تو فلم سے متعلق سارا سامان تانگوں پر لادا جاتا تھا۔ راستے اوبڑ کھابڑ تھے۔ کئی بار اُن کا سامان راستے میں کہیں گر گیا۔ بہر حال ان سب

دشواریوں کے باوجوداے۔آر۔کاردار نے اپنی پہلی فلم پوری کی جس کا نام''حسن کا ڈاکو'' تھا۔اس فلم سے کاردار،اداکار کے علاوہ بحثیت ہدایت کار بھی جانا جانے لگا۔اس فلم میں اُس کی ہیروئین گلزار بیگم تھی اور ساتھ میں اسمٰعیل تھا۔اس فلم میں اُسنے ایک امریکن ایکٹر کریفارڈ ارلیس کو بھی پیش کیا۔فلم کو ملی جلی کامیابی ملی۔کاردار نے اس فلم کے بعد یہ قسم کھائی کہ وہ اب کبھی بھی کیمرہ کے سامنے نہیں آئے گا البتہ وہ کیمرہ کے پیچھے رہ کر کام کرتا رہے گا۔یعنی وہ اداکاری سے توبہ کر کے صرف اور صرف ہدایت کاری پر دھیان دیتا رہے گا۔یہ وعدہ اُس نے آخری دم تک نبھایا۔

''حسن کا ڈاکو''فلم کے بعداے۔آر۔کاردار کی ہدایت تلے بننے والی دوسری فلم ''سرفروش'' تھی جسمیں ہیرو کے لئے اُس نے گُل حمید کا انتخاب کیا۔باقی اداکار وہی تھے جو''حسن کے ڈاکو'' میں کام کر چکے تھے۔اس فلم میں کاردار نے رفیق غزنوی کوایکٹر کے طور پر متعارف کیا جو بعد میں ایک کامیاب موسیقار بن گیا۔اس فلم کو فلمی شائقین نے خوب پسند کیا۔ساتھ ہی اس فلم کے بننے سے پورے ہندوستان میں ایک ہنگامہ مچا۔لاہور پس منظر سے پیش منظر میں آ گیا تھا۔فلم سازی کے میدان میں لاہور کا نام بھی درج ہو گیا تھا۔(آج یہی فلمی صنعت لالی وڈ کے نام سے مشہور ہے)بریڈرتھ روڈ لاہور کے نواسی روپ لال شوری جو لاہور سے باہر رہا تھا لاہور اسٹوڈیو کی گونج سن کر واپس اپنے شہر لوٹا اور اُس نے فلم ''قسمت کی بیٹی'' بنانے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کی ہدایت کا ذمہ اے۔آر۔کاردار کو سونپا گیا۔یہ فنی اعتبار سے اُس دور میں بننے والی بمبئی فلموں کی ہم پلہ تھی۔

تیسری دہائی میں لاہور میں جتنی بھی فلمیں بنیں وہ ہالی وڈ فلموں سے زیادہ متاثر ہوا کرتی تھیں۔نہ صرف کہانیاں،ڈرامہ یا ایکشن بلکہ سیٹ اور مکالموں تک کی ہو بہو نقل کی جاتی تھی۔حد تو یہ تھی کہ کاسٹیوم بھی اُسی طرح کے پہنے جاتے تھے۔لاہور کی فلم انڈسٹری بمبئی فلم انڈسٹری سے ہٹ کر اپنی پہچان بنانا چاہتی تھی۔کاردار کے اسٹوڈیو میں جن اداکاروں نے کام کیا اُن میں ہیرا لال،گُل حمید،نظیر،اور احمد دین،خوب چمکے جب کہ ہیروئنوں میں کوشیلیا دیوی گلزار اور ممتاز بھی لوگوں کے دلوں پر چھائی رہیں۔اے۔آر کاردار بطور ڈائرکٹر اپنا لوہا منوا چکا تھا۔اُسنے اپنی ایک فلم ''آوارہ رقاصہ'' کی ہدایت کاری کے لئے جہلم کے جے۔کے۔نندہ کی خدمات حاصل کیں۔وہ جرمنی سے ہدایت کاری اور فوٹو گرافی کا کورس کر کے لوٹا تھا۔اس فلم کا منظر نامہ اپنے زمانے کے مشہور ڈائرکٹر ایم صادق نے لکھا تھا۔

کاردار نے اپنی تین فلموں میں نذیر اور گلزار بیگم کو متواتر پیش کیا۔یہ جوڑی کافی مقبول ہو چکی تھی۔اُسکی ہر فلم میں اسمٰعیل لازمی طور پر ویلن کے رول میں ہوتا تھا۔انکی دوستی واقعی مثالی تھی۔1929 سے لاہور میں بننے والی بیشتر فلموں کے ٹائٹل انگریزی میں تھے۔جیسے Masked Rider, The Golden, Golden dragger, The sweet heat, The prisioner, Passion Flower, The Sacred Flame, House Boat Golden Temple, The Award, Paradise وغیرہ وغیرہ۔کچھ اُردو ٹائٹل کے ساتھ بھی فلمیں بنیں جیسے لالہ رخ،کافر،خواجہ سرا اور فردوس،پر ان میں سے بیشتر فلمیں نامکمل ہی رہیں۔''یونائیٹڈ پرڈیوسرس'' نے کل ملا کر آٹھ فلمیں بنائیں جو کہ کامیاب رہیں۔وہاں بمبئی میں خاموش فلموں کا دور اپنے اختتام پر تھا۔اُدھر کلکتہ اور بمبئی میں فلمیں بولنے لگی تھیں۔آخر کار فلم ''عالم آرا'' کے ساتھ متکلم فلموں کا دور شروع ہو گیا۔بمبئی اس بار بازی مار گیا تھا۔ 1931 میں فلم ''عالم آرا'' ریلیز ہو گئی۔لاہور اس بدلاؤ میں شامل ہونا چاہتا تھا اسلئے اے آر۔کاردار نے حکیم رام پرساد کے تعاون سے پہلی بولتی ہوئی فلم بنائی جسکا نام ''ہیر رانجھا'' تھا۔یہ فلم 1932 میں بن کر تیار ہو گئی۔لاہور کی بولتی فلموں کا بانی صحیح معنوں میں حکیم رام پرساد تھا جس نے اے۔آر۔کاردار کا خواب شرمندہ تعبیر کر دیا۔

بولتی فلموں کے ساتھ ہی بڑے بڑے فلم ساز اور ہدایت کار بمبئی کا رخ کرنے لگے۔اے۔آر۔کاردار بھی لاہور سے کلکتہ کے لئے چل پڑا۔کاردار کا خاصا نام ہو چکا تھا اسلئے اُسے کلکتہ پہونچ کر کام کے لئے زیادہ جدو جہد نہ کرنا پڑی۔''ایسٹ انڈیا فلم کمپنی'' نے اُسے ہدایت کاری کا موقع فراہم کیا۔اُس نے اس کمپنی کیلئے کئی فلمیں ڈائرکٹ کیں جن میں ''سیتا'' اور ''چندر گپتا'' قابل ذکر ہیں۔کلکتہ کا موسم اُسے زیادہ دنوں تک راس نہ آیا۔اُسنے کلکتہ سے ہجرت کر کے بمبئی کو اپنا نیا مسکن چنا۔یہاں بھی قسمت اُس پر مہربان رہی۔اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔اُسنے بمبئی میں کئی ساری فلمیں بنائیں۔جیسے 1936 کی ''باغی سپاہی'' 1937 کی ''مندر'' اور ''ملاپ'' 1938 کی ''باغبان'' 1939 کی ''ٹھوکر'' 1940 کی ''ہولی'' ''پاگل'' اور ''پوجا'' اور 1941 کی ''سوامی''۔ کاردار کو جن فلموں سے بے پناہ مقبولیت ملی وہ ''رنجیت اسٹوڈیوٗ'' اور ''نیشنل اسٹوڈیوٗ'' کی فلمیں تھیں،جو عورتوں کے جنسی اور ذہنی استحصال پر محیط تھیں۔ 1940 سے لے کے 1942 تک کاردار بمبئی کے کئی فلم کمپنیوں کے لئے کام کرتا رہا۔1942 میں اُس نے اپنی فلم کمپنی کھولنے کا فیصلہ کیا۔بمبئی کے لور پریل علاقے میں زمین خرید کر اُسنے ''کار دار اسٹوڈیوٗ'' کی داغ بیل ڈال دی۔اس بینر کے تحت اُس نے کئی فلمیں بنائیں جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔اب وہ کاردار کے نام سے نہیں بلکہ میاں جی کے نام سے جانے جاتے تھے۔شروع شروع میں اُس نے ہالی وڈ کی کامیاب فلموں کی کاپی کی جیسے فلم ''داستان'' اور ''جادو'' ہالی وڈ کی مشہور فلم "encroachment" اور "The loves of cammron" کی ہو بہو کاپی تھی۔اپنے ابتدائی دور میں وہ ہالی وڈ فلموں کی کاپی کر کے کافی نام کما چکا تھا۔

میاں جی نے اس انڈسٹری کو بہت سارے موسیقار،گلوکار اور ادا

کار کھوج کے دئے۔اے۔آر۔کاردار کو پاکستان فلم انڈسٹری کا کولمبس کہا جاتا ہے۔آجکا ''لالی وڈ'' اُسی کی کاوشوں کا ثمر ہے۔

اُنکی فلموں کی تفصیل اس طرح ہے۔ یہ وہ فلمیں ہیں جو کاردار اسٹوڈیو کے بینر تلے بنیں اور جن کو کاردار صاحب نے ڈائرکٹ کیا۔

1942	''نئی دنیا''
1943	''خونی لاش''
1943	''قانون''
1946	''شاہجہاں''
1947	''درد''
1949	''دلاری''
1949	''دل لگی''
1950	''داستان''
1951	''جادو''
1952	''دیوانہ''
1953	''دل نادان''
1955	''یاسمین''
1958	''دو پھول''
1966	''دل دیا درد لیا''
1976	''میرے سر تاج''

کاردار صاحب کی فلمیں اُنکی روح پرور اور سحر انگیز موسیقی کی وجہ سے صدا بہار رہیں۔آج بھی ان فلموں کے گیت روح کو فرحت بخشتے ہیں۔فلم ''یاسمین'' اور ''سوامی'' کو چھوڑ کر اُنکی باقی ساری فلمیں نوشاد کی دھنوں سے آراستہ ہیں۔''یاسمین'' کی موسیقی سی۔رامچند ر اور ''سوامی'' کی موسیقی رفیق غزنوی نے دی تھی۔اُنکی سیکنڈ لاسٹ فلم ''دل دیا درد لیا'' تھی جو اُنکے لئے سم قاتل ثابت ہوئی۔یہ فلم اُنہیں بہت زیادہ درد دے گئی۔اُنکے اور دلیپ صاحب کے بیچ تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی جس کا فلم پر بری طرح اثر پڑا۔فلم کو بننے میں کئی برس لگے۔کاردار صاحب بری طرح مقروض ہوگئے۔خدا خدا کر کے فلم مکمل ہوئی۔ریلیز ہوئی تو فلم باکس آفس پر بری طرح ناکام رہی۔اس ناکامی سے کاردار صاحب کی کمر ٹوٹ گئی۔کولمبس ہار گیا۔دلیپ کمار کے چاہنے والوں نے اپنے ہیرو کو منفی رول میں قبول نہیں کیا۔شمی کپور نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اس فلم کی فلم بندی کے دوران کاردار صاحب اپنے اسٹوڈیو کے باہر ایک لاچار کی طرح بیٹھے نظر آتے تھے جب کہ اندر دلیپ صاحب اپنی نگرانی میں اس فلم کی شوٹنگ کراتے تھے۔کاردار صاحب پر آخری دنوں کی ناکامی یا یوں کہیے گمنامی کا شدید اثر ہوا جس کے باعث وہ 22 نومبر 1989 کو اس دنیا کو خیر باد کہہ کے چلے گئے۔اور اپنے پیچھے بہت ساری کھٹی میٹھی یادیں چھوڑ گئے۔آج بھی ''دلاری'' کا یہ گانا جب کانوں میں گونجتا ہے۔سہانی رات ڈھل چکی۔ نہ جانے تم کب آو گے۔تو ایک موہوم سی اُمید دل میں جاگتی ہے کہ شاید جانے والا لوٹ کے آجائے پر ایسا ممکن کہاں۔ جو چلا گیا وہ لوٹ کے کہاں آتا ہے۔بس ایک کسک دے جاتا ہے۔ایک میٹھی سی کسک جو بس اندر ہی اندر دل کو برماتی رہتی ہے۔

''جو خوشی سے چوٹ کھائے وہ جگر کہاں سے لاؤں۔''

☆

''کُوزہ گر''

منظر میں کوئی طاقتِ دیوار بھی تو رکھ
منزل کو تم نے پانا ہے، رفتار بھی تو رکھ

گر توڑنا ہے مجھ کو کُوزہ گر ذرا سا تھم
خوابوں کو میرے چاک پر بیدار بھی تو رکھ

ہے زندگی تو ساری ہی ویران سی میری
تُو اِس میں اے خدا دلِ دلدار بھی تو رکھ

اُٹھ جائے کب کہاں پہ یہ تمنا بھرا قدم
ہو جائے شوق پُورا سزاوار بھی تو رکھ

حیراں ہوں کہ شوق کو جاناںؔ کے کیا ہُوا
تُو اپنے کھیل میں مرا کردار بھی تو رکھ

فرزانہ جاناںؔ
(راولپنڈی)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین
وقار جاوید
(راولپنڈی)

پیارے بھائی گلزار جاوید،
سلام اور دعائیں

اب کی مرتبہ چہارسو کی سوغات تو ملی ہی لیکن ساتھ ہی ہم دونوں نا چیز خادمانِ ادب میاں بیوی کا گوشہ جس کو آپ کے ذوقِ سلیم نے قرطاسِ اعزاز کا اعلیٰ نام دے رکھا ہے بطورِ عیدی وصول ہوا۔ گوشے کو آپ نے اپنی مہربانیوں کے پھولوں سے مہکا مہکا دیا ہے۔ روایت اور جدت کے حسین الضمام کا دوسرا نام مجلّہ چہارسو ہے۔ اللہ کرے وہ ہر ماہ دنیا کے کونے کونے میں شعر و ادب اور فکشن کی آبیاری کرتا رہے۔ عمرِ طویل سے آپ، آپ کے صاحبزادے، صاحبزادی اور تمام کار گزاران واہلِ چہارسو سرفراز ہوں۔ ایک حیران کن حقیقت جو چہارسو کی شناخت ہوتی جارہی ہے یہ ہے کہ قرطاسِ اعزاز کے ساتھ کی مشمولات کا معیار بھی ہر ماہ اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتا جارہا ہے۔ شعبۂ عقیدت میں توصیف تبسم اور امین راحت چغتائی اپنا حصّہ بٹور رہے ہیں اس مرتبہ افسانے کا شعبہ شاہد جمیل، شائستہ عالم، عمران مشتاق، رینو بہل، اور خود گلزار جاوید نے آباد کیا ہے۔ حیرت سرائے کے تحت شہر یار کی موجودگی سے بڑی خوشی ہوئی آپ نے ان کی علالت کا ذکر کر کے ادارات کے فرائض کو انسانیت کا لمس دے دیا ہے۔ خوش رہیئے۔

دور جاتی ایک پرچھائیں ہوا میں ہلتا ہاتھ
میں جدائی کا منظر آج تک بھولا نہیں

خطوط میں انور سدید کا خط افتخار نسیم کے بارے میں پڑھا۔ پڑھنے کے لئے خاص ہے۔ پرچے کا مجموعی تاثر قاری کو پڑھنے پر مائل ہی نہیں مجبور کرنے والا ہے کسی ادبی پرچے کو اور کیا چاہیئے۔۔؟ کاش آپ کی ان مساعی کا آپ کو مناسب اجر جلد مل جائے۔ آمین۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

جنابِ گلزار جاوید صاحب،
السلام وعلیکم۔

چہارسو دیکھا۔ بہت دیدہ زیب ہے۔ قرطاسِ اعزاز پر میرا خیال ہے مجھے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ پاکستان سے، جرمنی سے، لندن سے امریکہ سے اور ٹورانٹو سے بھی احباب کے فون اور ای میلس آئے لگتا ہے سب کو ہی پسند آیا ہے۔ چہارسو کی دیدہ زیبی، جدت پسندی، اور قرطاسِ اعزاز کی خوبصورتی آپ کے حساب میں جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے ممنونیت اور احسان مندی کے احساسات اور جذبات آپ تک کس طرح پہنچائیں اس کے لئے ہمیں شکریئے کا لفظ استعمال کرنا پڑے گا۔ اگر چہ یہ لفظ بہت عام ہے لیکن احساسات اور جذبات کے لحاظ سے اس کے معنوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آپ یقیناً میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے۔ انہی دنوں میں آپ کے متعلق دو آراء حاصل ہوئیں ایک تو عبداللہ جاوید صاحب کی کہ'' آپ کی طبیعت میں جدت پسندی ہے اور آپ جیسے لوگ ہی دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں۔'' اور دوسری آپ کی صاحبزادی عطیہ سکندر علی کی کہ'' والد صاحب شروع ہی سے مشکل پسند واقع ہوئے ہیں، انکی ایک عمر مشکلوں سے کھیلتے گزری۔'' میں نے چہارسو میں آپ کی ان دونوں صفات کو موجود پایا۔ کچھ احباب نے براہِ راست (جاوید کے انٹرویو) اور مجلسِ چہارسو (میرے انٹرویو) کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ مجھے خود بھی ذاتی طور پر عطیہ سکندر علی صاحبہ کے سوال پسند آئے اور جواب دینے میں مجھے نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ مجھے اپنے ماضی کے خوبصورت لمحوں میں جھانکنے کے مواقع میسر آئے۔ میں عطیہ صاحبہ کی مشکور ہوں مجلّہ نکالنا آج کل جان جوکھم کا کام ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں آپ یہ سب کچھ کس طرح کر پاتے ہیں۔

افسانے پڑھے۔ اسطوخودوس، شاہد جمیل صاحب کا افسانہ/انشائیہ/افسانہ نما انشائیہ جسطرح آپ کو پسند آیا ہوگا اسی طرح مجھ کو بھی پسند آیا مگر ایک بات کہنے کی آپ سے اور شاہد جمیل صاحب سے اجازت مانگوں گی کہ آج جب کہ ہم ان جنگوں سے دوچار ہیں جن کو طاقتور ملکوں نے Culture کلچر کی جنگ کا نام دیا ہے۔ شاہد جمیل صاحب انسانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ میں پیچھے بہت ہی پیچھے لے جارہے ہیں۔ یہ افسانہ بہرحال نت نئے اور حیرت انگیز حقائق کو ہمارے بالکل سامنے لے آتا ہے تو کبھی کسی چلمن کے پیچھے سے جھلکیاں دکھاتا ہے۔ تہذیب اور تمدن دونوں کے معاشرتی پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہد جمیل صاحب نے گھر اور اس کے مختلف حصوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح لکھا ہے اس کو میں خاتون ہونے کے ناطے حیرانی اور تحسین کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ یہ افسانہ مکالمے سے خود کلامی کی جانب سفر کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسطوخودوس والا معاملہ زیادہ گھمبیر نظر آنے لگتا ہے۔ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس خود کلامی کو ذہنی خلفشار تک لے جانا چاہے تو لے جاسکتا ہے۔۔ اس افسانے کے ایک فقرے میں قافیہ پیمائی بھی ملتی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے روایتی گیان، دھیان، وجدان، ادیان، بیان، اور نسیان کی اکتاہٹ کے سائے سائے چلیں۔''

رینو بہل کا افسانہ اچھی خاصی داستانِ غم ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ'' خدا کی بیٹی مدد چاہتی ہے۔'' اس بھری دنیا میں ہر جگہ اور یونہی مدد چاہتی رہے گی۔

• گلزار جاوید صاحب آپ ہمیشہ فکشن میں نوع نوع کے امکانات

تلاش کرتے اور آزماتے رہتے ہیں۔''قیامت کی چال''میں بھی آپ نے ایسا ہی کیا ہے۔کہیں کہیں وہ ٹیکنیک نظر آئی جسکو Slice of bread ٹیکنیک کہا جاتا ہے۔افسانے کو بڑی مشاقی کے ساتھ مرکزی خیال پر استوار کیا گیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

پاکستان کے موجودہ معاشرے میں اتنی زیادہ جرائت یا جسارت کم از کم مجھے مناسب نہیں لگی ابھی قرۃ العین کے برقع پہننے کا زمانہ ہے۔عزیز کے سوالوں کا زمانہ بہت دور محسوس ہوتا ہے۔اللہ کرے جلد سے جلد قریب آجائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی کے ساتھ درازی عمر عطا کرے تاکہ آپ اردو فکشن کو ان گنت ''قیامت کی چالیں'' دے سکیں۔آمین۔

اٹھو وگر نہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

عزیز مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام شوق۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ ملا۔اس نے ایک اور بھولی بسری یاد تازہ کر دی۔چیئرنگ کراس لاہور میں جہاں آج کل واپڈا ہاؤس کی دیو ہیکل عمارت قائم ہے وہاں درختوں کے جھنڈ میں ایک پُرسکون و پُرکشش ریستوران ''میٹرو'' ہوا کرتا تھا۔ایسی ہی ایک ادبی نشست میں جو اکتوبر ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی۔میں نے مولانا عبدالمجید سالک کی زبانی یہ غزل سنی تھی جو آپ نے ''چہارسُو'' کے صفحہ ۱۱۳ پر شائع کی ہے۔مولانا ترنم سے پڑھتے تھے اور پنجم سروں میں سماں باندھ دیتے تھے۔یہ ان کی تازہ غزل تھی۔جونہی اُنھوں نے مطلع

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہار ہم نہیں ہوں گے

پڑھا تو سامعین چونکے اور جب اُنھوں نے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پر چھٹکے کی افشاں ہم نہیں ہوں گے

پڑھا تو سامعین دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔داد و تحسین کے ڈونگرے بھی برس رہے تھے،آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔ایک طرف مرصع غزل،دوسری طرف اُس عہد کے احوال اور تیسری طرف مولانا کا ترنم۔ساری فضا عجب کیف میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور مولانا اپنی فکر و دانش اور خوش الحانی سے سامعین کو تڑپا رہے تھے۔

ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں ہوں گی جب آساں ہم نہیں ہوں گے

میں اب بھی مولانا کو تصور میں ''میٹرو'' کے سبزہ زار میں غزل پڑھتا دیکھ رہا ہوں۔بڑی پُروقار شخصیت تھی۔بھرا بھرا جسم،مناسب قد،سر پر رومی ٹوپی پہنتے تھے بعد میں جناح کیپ پہننے لگے تھے۔مومن مومن چہرہ،کافر کافر چھوٹی آنکھوں پر چشمہ،عمر بھر اچکن اور شلوار پہنی،ہاتھ میں خمدار سرے والی چھڑی،نجی محفلوں میں سنجیدہ سا چہرہ بنا کر پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے رہتے تھے صحافت ایسی کہ ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں''۔غزل ایسی کہ عابد علی عابد جیسی شخصیت پھڑک اُٹھے۔علم و ادب کی گفتگو ہو تو سامعین جھولیاں بھر بھر اُٹھیں۔ ہائے! مجھے آپ نے میرے کس عہد کی یاد دلا دی۔عابد علی عابد سے بڑا غزل شناس تو اب بھی لاہور میں موجود نہیں۔

لیکن یہ تو ابھی میں نے بتایا ہی نہیں کہ ''میٹرو'' کی خصوصیت کیا تھی۔یوں تو لاہور میں ان دنوں کافی اور لورینگز دو ''انٹلیکچولز'' کے ریستوراں کہلاتے تھے۔مگر ریگل چوک سے نزدیک مال روڈ پر ''سٹینڈرڈ'' اور چیئرنگ کراس میں ''میٹرو'' دو ایسے ریستوراں تھے جو پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے دم قدم سے آباد تھے۔اور کیوں نہ ہوتے۔ان دونوں ریستورانوں میں شام کو کیبرے ڈانس بھی ہوتا تھا۔سٹینڈرڈ کی رقاصہ اینجلا تھی اور میٹرو میں کوئینی رقص کرتی تھی۔اینجلا نسبتاً زیادہ جوان خوب صورت اور پُرکشش جسم کی بوٹا سا قد رکھنے والی لڑکی تھی۔کوئینی چھریرے بدن کی دلکش خدوخال کی لڑکی تھی اور رقص کی زیادہ ماہر تھی۔چنانچہ طلبا حسبِ ذوق ان ریستورانوں کو آباد رکھے ہوئے تھے، اس خصوصیت کے ساتھ کہ دونوں مقامات پر رقص کے دوران کوئی غیر شائستہ جملہ نہیں اچھالا جاتا تھا اور دونوں ریستوران اپنی اپنی حدود میں ''سنجیدہ شہرت'' رکھتے تھے۔مجھے اور میرے دوستوں کو کوئینی کا رقص زیادہ پسند تھا بلکہ ان دنوں اُسی کے رقص کو دیکھ کر میں نے ''رقص'' کی یوں تعریف کی تھی۔

عشق پیچاں کی بیل کو جیسے
بادِ صبح بہار چھو جائے

چلئے،اس بار ''چہارسُو'' میں یادنگاری ہی سہی،مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ میں شری دیپک کنول کو بھول گیا ہوں۔وہ تو میری صدی کا قصہ بیان کرتا ہے۔پُراز معلومات،دلآویز اسلوب نگارش کے ساتھ۔میری طرف سے ہر بار میرے جذباتِ تحسین اُس تک پہنچاتے رہیئے۔اُس نے بہت عرصے سے دلیپ کمار کا ذکر نہیں کیا۔جانے اب اُس کی صحت کیسی ہے۔اور آپ نے ''قیامت کی چال'' خوب چلی۔یہی کچھ ہوتا ہے گلی محلوں میں۔بات کچھ نہیں ہوتی مگر اُس کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آتا۔مگر اس ''کچھ نہیں'' تک وقت قیامت کی چال چل چکا ہوتا ہے۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

محیط چہارسو!! گل و گلزارِ جاوید۔
دل مضطرب' نگاہِ شفیقانہ کو سلام۔

چہارسو آپ کی جاویدانہ گل و گلزار خلّاقی کا مصوّر رہے عبداللہ جاوید کو قرار واقعی مقام ملا ہے۔تازہ ''چہارسُو'' میں گو ان کی ادبی جہات کا مکمل احاطہ تو نہیں ہو سکا تاہم ان کے شعر و ادب کی تفہیم ممکن ہوئی۔ان سے متعلق ستیہ پال

آنند کا مضمون خاصا چشم کشا ہے۔ستیہ پال آنند عہدِ موجود کے ممتاز نظم نگاروں میں سے ہیں۔انھوں نے امیج، علامت اور استعارہ دیکھے، جانچے اور انھیں عبد اللہ جاوید کے کلام میں بدرجہ اتم محسوس کیا۔ عام حسیّت ہے کہ یہ تینوں ''ماجرے'' الگ الگ ہو کر بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ان کے تصورات توڑ تاڑ کر جدا جدا بمشکل دیکھنے میں آتے ہیں۔آنند صاحب نظم (شعر کے) کے معتبر پارکھ ہیں وہ ان تینوں ''چیزوں'' کو اپنی مشاق اور تمیز دار عینک سے پڑھتے ہیں۔دیکھنا، پڑھنا اور جانچنا تجربے کا کام ہے۔کبھی کبھی آدمی ''زعم'' میں مفروضہ سازی بھی کر لیتا ہے۔بڑے قلم کا مفروضہ بظاہر حقیقت سے دور نہیں ہوتا۔نظم اور غزل کے بعد و قرب کا رولا بھی آج کا نہیں بہت پرانا نہ سہی پرانا ضرور ہے۔شاعری کا بیج پھوٹتا ہے تو پھلتا پھولتا ہے اس اکائی سے نکلے ہوئے اجسام رنگ روپ میں ایک سے نہیں ہوتے۔نظم اور غزل اگرچہ مختلفات کے متقاضی ہیں مگر اصل سے منہ نہیں موڑ سکتے۔''اصل'' کے اندر گہرائی میں صرف ایک احساس کروٹیں لے رہا ہوتا ہے۔کسی نے پوچھا اقبال کی نظم اچھی ہے یا غزل؟ جواب ملا بھائی! شاعری اچھی ہے۔ یہاں میں آنند صاحب کے نہایت ارفع اعتبارِ فکری کے سامنے اپنی غزل کا یہ شعر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

نظم کیسے نکال لائی ہے
درد غزلوں میں چھپ کے بیٹھا تھا
میں خیالوں میں ڈھونڈتا تھا اُسے
شعر لفظوں میں چھپ کے بیٹھا تھا

آنند صاحب نے عبداللہ جاوید کے ایک اظہار ''فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن کو بھی موضوعِ نقد'' کیا ہے۔بحور کا جذبات و احساسات کے پس منظر سے بڑا تعلق ہوتا ہے جو تصور، خیال ذہن و دل کے مکان و امکاں سے اٹھتا ہے وہ شاعر کے دماغ اسی جذبے کے مخصوص ردھم میں بیدار ہو جاتا ہے۔محولہ بالا اظہار چنانچہ ایک احساساتی خصوصیت کا کارفرما ہے۔بدیں وجہ ایک الگ طبیعت داری کا حامل ہے۔عبداللہ جاوید صاحب کی تظمیت اس سے لگا کھاتی ہے۔یہ چیز احمد ندیم قاسمی کی طبعی افتاد کا بھی خاصا ہے مرحوم نے نظم اور غزل دونوں میں اس سے اپنی طبعی آہنگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے ان کی غزل کا ایک شعر ہے

میری پہچان تو مشکل تھی مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے

اس شعر کے اُفق میں ذرا پرے پرے نظم کی دودھ میں نہائی ہوئی پریاں کھڑی ہیں۔ستیہ پال آنند کے نظریہ تعصب میں چونکہ اخلاصِ شاعرانہ کا سچ ہے اس کا تاثر دیرپا ہے۔نظم سے ان کے روابط اٹوٹ انگ کی طرح ہیں، بہرنوع ان سے عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ غزل کے حق کو بیک زبان و قلم مسترد نہ کر دیں۔نظم میں غزل کو ورود گناہ نہیں نہ نظم کو دور دور رہنا کوئی کارِ ثواب۔نظمیہ شاعروں نے بھی غزل کہی ہے۔امیجری اس میں نظمیہ ہی برتی ہے۔ بریں ہم وہ لطف سے خالی نہیں۔ایک صدی کا قصہ۔۔نتن بوس۔۔اثر انگیز ہے۔فلم گنگا جمنا میں نے دیکھی تھی۔اس میں فن، فنکاری عروج پر ہے۔کرداروں کی تخصیصات میں مکالمے نہایت اچھے لگے۔اداکاری کا معیار۔۔۔کیا کہوں بس دیکھا چاہیے دیپک کنول کشور سا ہو کو بھی لیں۔فلم ندیا کے پار ماحول کے تناظر میں کمال کی چیز ہے۔دلیپ کمار کی مرنے کی اداکاری نے مبہوت کر دیا تھا۔رس رابطے۔۔۔۔ میں نوید سروش صاحب کا شکر گزار ہوں وہ ہمیشہ مجھے یاد کرتے ہیں۔اب کے ایک شعر بھی دیا ہے میرے مصرع پر زہیر کنجاہی صاحب کی غزل خوب ہے

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

محترم گلزار جاوید صاحب

'چہارسُو' کا تازہ شمارہ میرے کمپیوٹر پر بکھرا ہوا ہے۔ ایک خوبصورت رسالہ جو اپنی آب و تاب کے ساتھ ہر ماہ نیویارک میں مہیا ہو جاتا ہے۔کاش پاکستان سے نکلنے والے دوسرے رسالے بھی اس شعار کو اپنا سکیں۔اس شمارے میں عبداللہ جاوید صاحب اور شہناز آپا کے انٹرویو شامل کر کے آپ نے ایک خوشگوار روایت کی ابتدا کی ہے۔عبداللہ جاوید کا انٹرویو کیا ہے ایک ادارہ سے استفادہ ہے۔گاہے گاہے ان سے فون پر گفتگو کا شرف حاصل ہے۔ان سے گفتگو کیجیے تو عالمی ادب پر ان کی عمیق نظر اور اس پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔جو شرافت، سادگی اور علمیت ان سے فون پر گفتگو میں ملتی ہے وہ ان کے انٹرویو میں بھی جھلک رہی ہے۔بڑے لوگوں کی یہی خوبی ہے کہ جتنا زیادہ پڑھتے جاتے ہیں، اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی کتنا پڑھنا باقی ہے۔یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ جو کم پڑھتے ہیں وہ اپنے علم کو دریا جانتے ہیں۔ انٹرویو کا ایک پہلو عبداللہ جاوید کے جوابات میں وہ لطیف پیرائے اظہار ہے جو اتنے دقیق موضوعات پر گفتگو میں بھی باقی رہتا ہے۔ان کے اور شہناز آپا کے افسانوں پر اتنے بڑے بڑے لوگوں نے اتنے اچھے الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ میں کیا اضافہ کروں۔

افسانے سارے بہت اچھے تھے۔شائستہ عالم کا افسانہ 'قصور کس کا ہے' ایک معاشرتی افسانہ ہے، جس کا بنیادی سوال وہی ہے جو آجکل ہر ذہن میں گھوم رہا ہے۔افسانہ صحافتی لہجے سے دامن نہیں بچا سکا۔رینو بہل نے افسانے 'مدد چاہتی ہے حوا کی بیٹی' میں ایک پرانے زخم کو نئی دوا دی ہے۔ایک روایتی انداز میں اس افسانے کو ختم کرنے کے بجائے یہ عزم و خود شناسی کو نیا راستہ دکھاتا ہے۔ گلزار جاوید کا افسانہ 'قیامت کی چال' بہت خوبصورت افسانہ ہے۔گلزار نے بہت خوبصورت بنت سے قاری کی توجہ آخر تک قائم رکھی ہے۔انہوں نے ایک رستے ناسور کو بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

الیاس عشقی صاحب کی تحریر نے بہت سی یادیں تازہ کر دیں۔عشقی صاحب مرحوم میرے بہت عزیز اور قریبی دوست ڈاکٹر ادیب الیاس کے والد تھے۔ہم سب انہیں کاکا کہتے تھے۔حیدرآباد میں ریڈیو پاکستان کے اسٹیشن

ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان سے تعلقات سرسری اور اسی نوعیت کے تھے جو ایک دوست کے والد کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ گھر میں ہر طرف زمین سے چھت تک کتابوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ غالباً میں نویں جماعت میں تھا اور اسکول میں منعقدہ ڈرامے 'مرزا غالب عوام کی عدالت میں' میں مرزا کا وکیلِ صفائی، عشقی صاحب نے اس میں جج کے فرائض انجام دئے تھے۔ مرحوم کا انتقال ریاض سعودی عرب میں کھانے کی میز پر ہوا۔ بغیر کوئی دکھ اٹھائے یاد کھ دیئے اچانک نکل لئے۔

آپ کے اس شمارے میں ایک اور ہمدمِ دیرینہ کی خوبصورت غزل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ پروفیسر سید محمد رضی ایک سال چھوٹے اور اچھے دوست تھے۔ رضی کا مطلع دیکھئے

روشنی چاہیے کس مول ملے گی صاحب
نقد جاں ہے مرے پلو میں چلے گی صاحب

عرصہ بیس سال سے رابطہ نہیں ہے۔ ہو سکے تو ان کا ای میل مجھے بھیج دیجئے یا میرا ای میل اور ایڈریس انہیں بھیج دیجئے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی (نیویارک)

پیارے گلزار، خوش رہو۔

تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس مرتبہ تو آپ نے غضب کر دکھایا۔ قرطاسِ اعزاز پر میاں کے ساتھ اُن کی شریک حیات کو بھی دبوچ لیا۔ خوب کارنامہ سرانجام دیا آپ نے۔ عبداللہ جاوید صاحب اور محترمہ شہناز خانم عابدی دونوں خوب لکھتے ہیں۔ عبداللہ جاوید کا افسانہ ''دخترِ آب'' اور شہناز صاحبہ کا ''نیا گرا'' خوبصورت منظر نگاری کردار اور حالات پر گہری نگاہ کے مظہر ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ 'مدد چاہتی ہے حوا کی بیٹی' عمدہ افسانہ ہے۔ آپ نے ''قیامت کی چال'' کو شروع سے آخیر تک خوب نبھایا ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہے۔ جناب شہریار کی غزلیں

آسماں کچھ بھی نہیں تیرے کرنے کے لیے

اور

وقت تیری یہ ادا میں آج تک سمجھا نہیں

کا ایک ایک شعر دل میں اُتر تا چلا گیا۔ جناب نند کشور وکرم کا شورش کاشمیری مرحوم پر تحریر کردہ خاکہ لاجواب تحریر ہے۔ شورش کاشمیری مرحوم جرأت و بے باکی اور حق گوئی کی مثال تھے اور چہارسُو پر یہ قرض اُن کا واجب تھا جو احسن طریق پر ادا ہوا۔ جناب عارف شفیق کی غزل

لہو میں ڈوبا ہر ایک منظر روتا ہے

کراچی کے حالات پر نہایت دلدوز تبصرہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی غزلیں، نظمیں لائق مطالعہ ہیں خاص کر پروفیسر سید رضی کی غزل لاجواب ہے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' کے قسط وار سلسلے میں تمن بوس کی زندگی کے حالات پڑھ کر اچھا لگا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

پیارے بھائی گلزار جاوید، سلام مسنون۔

بجلی شام چار بجے سے بند ہے اور سنا ہے رات بارہ بجے آئے گی۔ مدھم روشنی میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ چہارسو کا ستمبر/اکتوبر کا شمارہ ملا جو آپ کے حسن ادارت کا ثبوت ہے۔ ''قرطاسِ اعزاز'' کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس بار عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوئیں۔ آپ نے نند کشور وکرم کے ساتھ راولپنڈی لکھا ہے حالانکہ وہ دلی میں ہوتے ہیں۔ فیروز عالم کی سرگزشتہ خوب ہے۔ میری درخواست ہے کہ حمد و نعت شروع میں دیا کریں مہندر پرتاپ چاند کا خط قابل توجہ ہے۔ ہمیں ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہیے جو کسی کی دل شکنی کا باعث ہو۔ اسلام کسی مذہب پر تنقید نہیں کرتا۔ آغا گل بہت پڑھے لکھے اور مایہ ناز ناول نگار اور افسانہ نگار، نہایت باشعور اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ نہ جانے ان سے یہ سہو کیسے ہو گیا؟ ہمارے لیے ہر مذہب کے لوگ قابل قدر ہیں۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

محترمی گلزار جاوید صاحب' تسلیمات۔

قرطاسِ اعزاز میں ادب کے کسی ستارے سے ایک تفصیلی ملاقات ہمیشہ متوقع رہتی ہے۔ اس مرتبہ دو شریکِ ادب شاعر اور افسانہ نگار جو شریکِ زندگی بھی ہیں، کا انتخاب چہارسو کی روایت کا خوبصورت موڑ ہے۔ عبداللہ جاوید کا زندگی کی کاملیت کو ظاہر کرنے والا ان کا شعر:

جو مصری کی ڈلی سا تھا گھلا ماحول میں
زندگی کی سختیوں، کڑواہٹوں میں کون تھا

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز، اندھیرے اجالے پر ان کی یکساں اور گہری نظر ہے۔ آپ کے سوال پر کہ اعلیٰ شاعری کے اوصاف کیا ہیں۔ جواب میں جو مثال عبد اللہ جاوید نے پیش کی، نہایت خوبصورت اور جامع ہے۔

غنچے نے کہا کہ اس جہاں میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول کہ ''میں نے اپنے رب کو اپنے ارادے کی ناکامی سے پہچانا'' اس کی کس قدر جامع اور سادہ منظوم شکل ہے۔

ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
ارادے جب ہمارے ٹوٹتے
ہیں

''دخترِ آب'' عبداللہ جاوید کا ایک خوبصورت افسانہ جہاں تمثیل نگاری اپنے عروج پر ہے۔صنفِ نازک کی حسن وقبح کا خوب خوب اظہار ملتا ہے، اس نصیحت کے ساتھ کہ حسن کی بات کی جائے اور قبح سے گریز۔تسلیم الٰہی زلفی نے، شہناز خانم عابدی کو شبنمی اسلوب کی افسانہ نگار کہا اور کیا خوب کہا، شفیق احمد شفیق نے ''میانِ خواب وحقیقت'' میں ان کے افسانوں کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا۔ان کا افسانہ ''نیا گرا'' پڑھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا کہ لاکھوں لوگ برسوں سے نیا گرا دیکھنے جاتے اور اس کے جلالِ حسن کے اسیر ہو جاتے ہیں۔لیکن نیا گرا کو جس طرح شہناز خانم عابدی نے دیکھا، شاید کسی اور نے دیکھا ہو، یہ ادب کی معراج ہے۔شاہد جمیل نے ''اسطوخودوس'' میں تہذیب اور تمدن کے تذکیروتانیث کا فائدہ اٹھاتے '' کردار اپنے افسانے میں تمثیلاً سجائے اور تاریخ انسانی کے کینوس پر اسے بکھیر دیا کہ تہذیب وتمدن ہے تو انسانیت ہے ورنہ انسان پھر حیوان ہے۔زیادہ سے زیادہ حیوانِ ناطق۔رینو بہل مشہور افسانہ نگار نے ''مدد چاہتی ہے حوا کی بیٹی'' میں ثابت کر دیا کہ ہم آج تک عزت وناموس کی حفاظت کے نام پر خونی رشتے تک قربان کرتے آئے ہیں۔اس سے زیادہ شقی القلبی اور کیا ہو سکتی ہے۔آپ کا افسانہ ''قیامت کی چال'' نازک احساس کا خوب صورت پیرایہ'' مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران ایک بزرگ کو دعا میں جب یہ کہتے سنا کہ'' ہمیں نگاہوں کی پاکیزگی عطا کر تو میں کئی دن تک اس جملے کی گہرائی اور گیرائی میں کھویا رہا۔ایک دانشور کا یہ قول کہ اگر آپ کسی شخص کی تہذیب وشرافت کو جانچنا چاہتے ہوں تو یہ دیکھ لینا کافی ہوگا کہ اس کے دل میں عورت کی کتنی توقیر ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۱ء کا شمارہ ملا خطوط کے بعد کے فیروز عالم کی خود نوشت سوانح عمری ''ہوا کے دوش پر'' کا مطالعہ کیا اور باغ باغ ہو گیا۔فیروز عالم صاحب نے صاف ستھرے میر پور خاص، گورنمنٹ ہائی اسکول اور شاہ عبداللطیف کالج کی نئی پر شکوہ عمارات کا ذکر کیا ہے۔شہر کے کچھ جنونیوں کو بھی یاد کیا ہے۔ہیڈ ماسٹر دین محمد آرائیں مرحوم اور ماسٹر چودھری بشیر احمد مرحوم کو بہت احترام اور محبت سے موضوع بنایا ہے۔فیروز عالم صاحب کی نسل اور اُن کے شاگرد دین محمد آرئیں صاحب کو بہت احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔پھول کی چوری اور توبہ کا واقعہ دلچسپ ہے۔فیروز عالم صاحب اپنے متعلق (شخصیت) لکھتے ہوئے کچھ جھجک محسوس کر رہے ہیں یا تذبذب کا شکار ہیں۔بچپن کے حوالے سے کہیں شرمیلا کہیں شرارتی اور کہیں خاموش طبع کہہ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔بھائی کھل کر لکھیے۔

قرطاس اعزاز افضل عبداللہ جاوید صاحب اور قرطاس اعزاز اعلیٰ شہناز خانم عابدی کے نام کر کے آپ نے اپنی مدیرانہ صلاحیت اور ادب سے سنجیدہ وابستگی پر ایک اور مہر ثبت کر دی ہے۔''براہِ راست'' میں صاحبِ قرطاس سے، آپ نے علمی وادبی سوالات کے علاوہ ادب کے ایسے پہلوؤں پر بھی سوالات کیے ہیں جو ادب میں کچھ متنازعہ رہے ہیں مگر جیسے آپ کے جرأت مندانہ سوالات ویسے ہی عبداللہ جاوید صاحب کے جوابات، پڑھ کر مزا آ گیا۔ بہت پہلے ''حصارِ امکاں'' (شعری مجموعہ) مطالعہ میں رہا ہے۔پچھلے دنوں تسلیم الٰہی زلفی کی کتاب ''شاعرِ صدرنگ عبداللہ جاوید، تجزیاتی مطالعہ'' پڑھی جس سے اُن کی شاعری کی کئی پرتوں سے آشنا ہوا تھا اس گوشے نے اُن کی شخصیت اور شاعری کے نئے گوشے روشن کیے ہیں۔عبداللہ جاوید کا مضمون سید سعید نقوی کے افسانوی مجموعے ''نامہ بر'' پر مختصر مگر مربوط اور ٹھوس گفتگو ہے۔اکرام بریلوی کی تحریر ''خلوت خانۂ دل'' پڑھ کر مزا بھی آیا اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ بریلوی صاحب پرانے اور مستند لکھاری ہیں اُنھوں نے عبداللہ جاوید کے نظریاتِ شاعری کا گہرے مشاہدے کے ساتھ خوب تجزیہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا۔

اشعار کا انتخاب بھی خوب دیا ہے۔''حصارِ امکاں'' پر ڈاکٹر الیاس عشقی مرحوم کا تبصرہ بطور ''تبرک'' پڑھا۔مبین مرزا اردو افسانے اور تنقید کا ایک وسیع مطالعہ رکھتے ہیں انھوں نے ایک خاص نقطۂ نظر سے عبداللہ جاوید کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔اس جائزے میں کچھ نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔

قرطاسِ اعزاز اعلیٰ میں شہناز خانم عابدی سے ملاقات نے بھی خوشی اور طمانیت کا احساس بخشا ہے۔''مجلسِ چہارسُو'' میں عطیہ سکندر علی نے سوالات کے معاملے میں گلزار جاوید کی پیروی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔شہناز خانم صاحبہ کے مختصر مختصر جوابات نے فضا کو سجائے رکھا۔شہناز خانم عابدی کی تحریر ''چراغِ رخِ زیبا'' منصورہ احمد مرحومہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔مضمون میں مصنفہ نے منصورہ احمد سے محبت سے پُر مراسم کا ذکر بھی اپنائیت سے کیا ہے۔''نیا گرا'' دلچسپ اور اپنی گرفت میں لے لینے والی تحریر ہے شہناز صاحبہ نے بڑی چابک دستی اور ہنر مندی سے تحریر کو اختتام تک پہنچایا ہے۔سید توقیر حسن صاحب کا ''خواب کا رشتہ'' پر مضمون شہناز خانم صاحبہ کا ایک اچھا تعارف بھی ہے اور افسانوں کا مختصر تنقیدی تجزیہ بھی۔دیارِ غیر میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کا دم غنیمت ہے بلکہ وہ پردیس میں اہلِ علم وفن کے لیے ایک علمی وادبی نعمت سے کم نہیں وہ تخلیق کاروں کے فن پاروں کا تجزیہ وتبصرہ، بہت محنت اور غیر جانب داری سے کرتے ہیں شہناز خانم پر اُن کا مضمون ''شبنمی اسلوب کی افسانہ نگار'' میں اُنھوں نے مصنفہ کے طرزِ تحریر، موضوع کے لحاظ سے اسلوب کا چناؤ اور افسانوں کے موضوعات کا چناؤ خوب کیا ہے۔

شفیق احمد شفیق اور سہیل جاوید کے مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں۔

قاری شانے ''ماہ نجم کا رشتہ'' اور عروب شاہد نے ''خیالِ خاطر'' میں مختلف مضامین کے اہم اقتباسات سلیقے سے ترتیب دے کر عبداللہ جاوید اور شہناز خانم کی شخصیت اور فن کے مختلف زاویے دکھائے ہیں۔ڈاکٹر عمران مشتاق کا افسانہ ''گڑیا'' اپنوں کی جُدائی، ہجرت کا کرب اور دھرتی اور رشتوں کے محبت کی کہانی ہے۔شائستہ جمیل کی کہانی ''قصور کس کا'' کراچی میں سرفراز شاہ کے قتل کی روداد

معلوم ہوتی ہے۔ رینو بہل اور شاہد جمیل کے افسانے بھی منفرد ہیں آپ کے افسانے پر تبصرہ کرنے پر آپ نے خاموش پابندی سی لگائی ہوئی ہے۔ پرواز انبالوی، ڈاکٹر سید رضی محمد، ندیم ہاشمی، ارشد محمود ناشاد، قیصر نجفی، ڈاکٹر شباب للت کی غزلیں انفرادیت اور تازگی لئے ہوئے ہیں۔ جناب آصف ثاقب نے مشکل قافیے ردیف میں رواں غزل کہی ہے اُن کا اپنا رنگ ہے۔ عارف شفیق کی غزل کیا ہے کراچی کا نوحہ ہے۔

سندھی، بلوچ، پٹھان ، مہاجر پنجابی
جس کو دیکھو اندر اندر روتا ہے

امین راحت چغتائی صاحب کی غزل داخلی وخارجی مسائل کی خوب صورت عکاس ہے۔ شہریار کی دونوں غزلیں روایت اور جدت ادا کا حسین امتزاج ہیں بڑے سلیقے سے شعر کہتے ہیں۔

اس نتیجے پر پہونچنے میں بڑی مدت لگی
تجھ سے اچھے تو بہت ہیں پر کوئی تجھ سا نہیں
شہریار

یہ شعر پڑھ کر حالؔی کا خوب صورت شعر یاد آیا۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہیٰ تو مگر کہاں

تقریباً ایک موضوع ہوتے ہوئے بھی شہریار نے موضوع کو نیا پن اور تازگی کی نئی بہار دی ہے حالؔی کا شعر سدا بہار ہے۔ توصیف تبسم امین راحت چغتائی کی نعتوں میں عقیدت بھی ہے اور فکر بھی۔ عبداللہ جاوید کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کے ہردلعزیز استاد چودھری بشیر احمد کا کمپری ہینسو ہائی اسکول میں، میں بھی شاگرد رہا ہوں اُن کا چھوٹا بیٹا عارف بشیر میرا ہم جماعت رہا ہے۔ تقریباً بیس برس پہلے بشیر صاحب کا جوان بیٹا طاہر کراچی سڑک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بشیر صاحب بھی ڈھلک گئے تھے اب تو وہ بھی دنیا میں نہیں رہے۔ میر پور خاص سے نوکوٹ تک اور بدین سے مٹھی تک طوفانی خوفناک بارشوں نے بہت تباہی مچائی ہے لاکھوں لوگ بے گھر ہو کر سڑکوں پر آ گئے رہی سہی کسر اعلیٰ سرکاری افسران کی نااہلی اور صاحب اختیار واقتدار طبقے کی مفاد پرستی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول (پرتاب بھون بلڈنگ) میں تقریباً تیس خاندان عارضی طور پر پناہ لیے ہوئے ہیں۔ عجیب تکلیف دہ منظر ہے میں روزانہ انھیں دیکھتا ہوں تو مجھے سن ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے آنے والے خاندان کی بے بسی یاد آتی ہے روزانہ آپ کو یاد کرتا ہوں کہ آپ کے خاندان کا بھی پہلا پڑاؤ یہ عمارت تھی مگر ایک افسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء اور آج لوگوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے بقول تاج قائم خانی

بنتے وقت نظریہ تھا جو' اب وہ صرف علاقہ ہے
یہاں نظریے کے بل پر اب رہنا ہے دشوار بہت

گلاب خاں تاج قائم خانی بھی ۲۱ اگست ۲۰۱۱ کو انتقال فرما گئے۔ وہ ۲۹ مئی ۱۹۲۹ میں بیکانیر ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ سہ ماہی ''پہچان'' کے سرپرست تھے۔ گیت اور دوہا اُن کی پہچان تھا۔ نظم ونثر کی سات کتابیں آ چکی ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا شکریہ۔ ''قرطاسِ اعزاز'' میں عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی جیسی شخصیت نے ''چہارسُو'' میں چار چاند لگا دیئے ایسے ستاروں کا انتخاب آپ جیسے نظر شناس ہی کر سکتے ہیں۔ افسانوں میں شاہد جمیل صاحب کا افسانہ ''اسطوخودوس'' بہت خوب رہا۔ جب کہ ''قصور کس کا؟'' میں شائستہ خانم نے کراچی میں گزشتہ دنوں ہونے والے ایک واقعہ کو افسانہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک رپورٹ سے آگے نہیں بڑھا جبکہ ''مددچاہتی ہے حوا کی بیٹی'' رینو بہل کے افسانہ کا ایک نیا انجام اچھا لگا۔ ''قیامت کی چال'' میں گلزار جاوید نے ایک نہایت حساس مسئلہ کو بہت خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے۔ ''حیرت سرائے'' میں جناب شہریار صاحب کا فون نمبر دے کر آپ نے ہمیں اُن سے بات کرنے کا موقع دیا جن کو ہم ایک عرصے سے مختلف رسائل میں پڑھتے آ رہے ہیں۔

رومانہ رومی (کراچی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' اور آپ کا محبت نامہ ملے کئی روز ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں نے جستہ جستہ ''چہارسُو'' پڑھ لیا ہے۔ حسب سابق براہِ راست کے تحت آپ کا محترم عبداللہ جاوید سے مکالمہ دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ عزیزی عطیہ کا ''مجلس چہارسُو'' کے عنوان سے محترمہ شہناز خانم عابدی سے مکالمہ مجھے آپ کے مکالمے سے بڑھ کر اچھا لگا ہے کہ بیٹی کے محترمہ سے سوالات میں ان کے لفظ لفظ میں بڑی اپنائیت اور احترام کا احساس پایا جاتا ہے۔ عزیزی عطیہ کی میری نظر سے یہ پہلی تحریر گزری ہے اور خوب ہے۔ مبارک باد! اس دفعہ میں نے آپ کے افسانے کے علاوہ دو افسانے اور پڑھے ہیں۔ محترمہ شہناز خانم کا ''نیاگرا'' چہارسو کا خوبصورت ترین افسانہ ہے۔ میں اُردو افسانے کا بہت پرانا قاری ہوں۔ عورت مرد کی محبت پر بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے اے حمید کی ''منزل منزل'' اور جوانا مرگ آنجہانی پی سی منظر کی لوسٹوری ''برگد'' میری یادداشت میں اب تک محفوظ ہے۔ محترمہ شہناز خانم عابدی کی لوسٹوری ''نیاگرا'' بھی بھلائے نہ بھلائی جائے گی۔ محترمہ کے لیے بھی مبارک باد!

تازہ شمارے میں دوسرا افسانہ جو میں نے پڑھا اور پسند آیا وہ عمران مشتاق کا ''گڑیا'' ہے۔ برصغیر کی تقسیم کو ایک عرصہ گزرا مگر اب بھی کبھی کبھار اس

موضوع پر کوئی اچھی کہانی نظر آ جاتی ہے۔اس کہانی کی پسندیدگی میں غالبًا سرگودھا کا ذکر ہے جہاں میں نے ایک لمبا عرصہ گزارا۔تقسیم کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں ''سرگودھا'' کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں کسی غیر مسلم کو تکلیف تو ایک طرف معمولی گزند بھی نہیں پہنچایا گیا تھا۔افسانہ نگار اگر مان سنگھ کی والدہ کو سرگودھا لے آتا تو اُسے زندہ سلامت اپنی گڑیا مل جاتی۔

سجادنقوی (لاہور)

برادرِمحترم گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

بلاشبہ ''چہارسو'' اردو شعر وادب میں روایت اور جدّت کا ترجمان ہے،اوراس میں بھی کلام نہیں کہ قرطاس اعزاز کی تاریخ میں پہلی بار صاحب قلم میاں بیوی کی خدمت میں بیک وقت قرطاس اعزاز پیش کرنا جریدے ''چہارسو'' کی ہی ایک اورجدّت ہے۔عبداللہ جاوید ایک جامع الکمالات قلمکار ہیں۔ان کے فن اور شخصیت کی متنوع جہات ہیں۔اور ہر جہت ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است'' کی مصداق ہے۔ہمارے نزدیک وہ ایک نابالغہ ہیں۔ان کی بیگم شہناز خانم عابدی کا کمال یہ ہے کہ علم وفن کے ایک بڑے درخت کے نیچے بھی ان کا نخل افسانہ نگاری پھلتا پھولتا رہا اورانجام کار صاحب کتاب ہونے کا شرف انہیں نصیب ہوا۔

ڈاکٹر سعید نقوی کے افسانوی مجموعے ''تمنائے ثمر'' پر تبصرہ عبداللہ جاوید کی افسانہ فہمی اور تنقیدی بصیرت کا مظہر ہے۔اس تبصرے سے بحیثیت ایک قلمکار ان کی مشاقی ہویدا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کے اظہار خیال کی Concise اور To the Point ایسے الفاظ سے ہی تحسین کی جاسکتی ہے۔

ستیہ پال آنند ایک ایسے تخلیق کار ہیں۔جن کی نظم ونثر ہردواصناف ادب کے کشت زاروں سے زرخیزئ زمین ظاہر ہے۔وہ ایک بڑے نظم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے نقاد بھی ہیں۔ان کی تنقید یکسر منفرد نوعیت کی ہے،وہ اپنے تنقیدی جائزوں اور تجزیوں میں تکنیک اور فن کے رموز کے ساتھ ساتھ متن ومواد کے اسرار بھی کھولتے ہیں۔ستیہ پال آنند کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں بیش بہا معلومات کے خزانے کا انبار لگا دیتے ہیں۔اس پر مستزاد انگریزی اور ہندی ادب کے حوالے ہیں،جوان کی تحریروں میں آفاقیت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ان کے ہاں فنی اصطلاحات کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے ذخیرے کا احساس ہوتا ہے۔اصطلاحات کی اختراع وایجاد میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ہم پال جی کو تنقید میں فراق گورکھپوری اور انتظار حسین کے زمرے میں کھڑا پاتے ہیں۔عبداللہ جاوید کی تمثال نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے فکروفن کے دریا بہا دیئے ہیں۔امیج،استعارہ،علامت ایسی اصطلاحات میں جو باریک سامعنیاتی تفاوت ہے اور جس کا اندازہ صرف حسِ باطنی سے ہی لگایا جا سکتا ہے،اس پر فلسفیانہ رنگ میں مباحث چھیڑنا یقیناً ایک ایسا کمال ہے جو معاصر تنقید نگاروں میں صرف ستیہ پال آنند کو حاصل ہے۔

اکرام بریلوی نے عبداللہ جاوید کے شعری مجموعے ''خلوت خانۂ دل'' کا دقت نظر سے جائزہ لیا ہے۔انہیں اس مجموعۂ کلام میں عبداللہ جاوید ایک درویش بے ریا اور صوفی باصفا لگے ہیں۔ہمارے نزدیک بھی یہ مجموعہ ''یہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا'' کی تفسیر اور ''پردے تعینات کے جو تھے اٹھادیئے'' کی تعبیر ہے۔ڈاکٹر الیاس عشقی نے نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے عبداللہ جاوید کے دوسرے شعری مجموعے ''حصارِ امکاں'' پر تبصرہ کیا ہے۔عشقی صاحب نے عبداللہ جاوید کا شاعرانہ مقام متعین کرنے میں احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ کوئی واضح مقام دینے سے گریز کیا ہے اور بعض رسمی جملے کہنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

''چپکا جو چاند رات کا'' عبداللہ جاوید کی شعری دانش پر صابر وسیم کا رقم کردہ تبصرہ ہے۔اس تبصرے کو شاعر کی تحلیل نفسی اور ان کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ قرار دیجیے تو زیادہ مناسب ہوگا۔اے خیام نے عبداللہ جاوید کے افسانوی مجموعے ''بھاگتے لمحے'' پر ایک سطحی نوعیت کا مضمون لکھا ہے جس میں افسانہ نگار کے فن کا گہرے تنقیدی شعور سے جائزہ نہیں لیا گیا۔امر واقعی یہ ہے کہ ان کا تبصرہ محض تین جملوں پر مشتمل ہے۔جو ہمارے خیال میں قابل ذکر ہے۔

''عبد اللہ جاوید ایک مختلف اور بڑے ویژن کے مالک
ہیں۔عبداللہ جاوید کے افسانوں میں ایک نیا ذائقہ ہے۔
اور ہر موضوع کے لئے وہ اپنا ایک زاویہ رکھتے ہیں۔''

مبین مرزا کو ایک ادبی جینئس کہا جائے تو بجا ہوگا۔ان کے ذہن و قلم میں جو ہم آہنگی ہے۔وہ فی زمانہ خال خال دیکھنے کو ملتی ہے۔ہم ان کی نکتہ دانی اور دقیقہ رسی کے دل وجان سے مداح ہیں۔عبداللہ جاوید کی افسانہ نگاری پر انہوں نے روایتی انداز کا تبصرہ لکھنے سے شعوری طور پر اجتناب کیا ہے۔ان کی منفرد مبصرانہ دانش مضمون کے حرف حرف سے ہویدا ہے، جو نقد افسانہ کی ایک طرز نو سے متعارف کراتی ہے۔انہوں نے نہایت بالغ نظری سے عبداللہ جاوید کی مجموعی تخلیقی شخصیت کا وسیع تناظر میں جائزہ لیا ہے اور ان کے فنکارانہ سروکار کو سمجھنے میں کامگار رہے ہیں۔

شہناز خانم عابدی نے اپنے مضمون بعنوان ''چراغِ رخ زیبا'' میں منصورہ احمد کے فن وشخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور سطر سطر ان کی رطب اللسان نظر آئی ہیں۔یادنگاری کے ذیل میں لکھا ہوا یہ مضمون اخلاص ومحبت کے سچے جذبات سے عبارت ہے بلکہ خراج عقیدت کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ممدوح کے ہی نہیں مداح کی راست شخصیت کے خدّ وخال بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شاہد جمیل نے ''اسطورخودوس'' کے نام سے یکسر ایک نئے اسلوب اور نئے مزاج کا افسانہ لکھا ہے۔اس افسانے میں انسانی رویوں کے حوالے سے ماضی وحال میں مطابقت و یکسانیت کا احساس دلانے کی کاوش کی گئی ہے۔یہ افسانہ طنز ملیح کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔افسانہ نگار نے جس مہارت فن سے علامت واستعارہ کا استعمال کیا ہے۔اس نے ''اسطوخودوس'' کو علامتی افسانوں

کی آبرو بنادیا ہے۔سچ پوچھیےتوابہام ہی اس افسانے کاحُسن ہے۔کہانی کی عدم موجودگی میں ایک باقاعدہ کہانی کا تاثر قائم کرنا،افسانہ نگارکاوہ اختصاص ہے جو ان کے فنکارانہ ترفع پر دلالت کرتا ہے۔ الغرض ''اسطوخودوس'' ایک ایسے افسانے کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے جواپنے تمام ترعناصر ترکیبی میں حیرتیں ہی حیرتیں سموئے ہوئے ہے۔گلزار جاوید کا سماجی ومعاشرتی شعور قابل رشک ہے۔رواں زندگی کے متنوع پہلوؤں پران کے کامیاب افسانے موجود ہیں۔''قیامت کی چال'' میں ایک ایسی معاشرتی کجروی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا آئے دن ہمیں سامنا رہتا ہے۔ یہ افسانہ کرداروں کی کثرت کے تناظر میں اس امرکی چغلی کھاتا ہے کہ گلزار جاوید میں وسیع کینوس کی کہانی یعنی ناول لکھنے کی تمام ترصلاحتیں پائی جاتی ہیں۔ان کے مکالموں کی برجستگی اورحفظ مراتب ''قیامت کی چال'' کی ادبی اہمیت کودوچند کرتے ہیں۔

منظرایوبی کواردوغزل میں استادانہ مہارت حاصل ہے۔ان کی غزل میں عصری حسیّت پائی جاتی ہے۔ان کی زیربحث غزل ایک شہرآشوب قرار دی جاسکتی ہے۔ان کا استفہامی لہجہ اس غزل کا اصل فن ہے۔جن کی اُنہیں داد نہ دینا ادبی ناانصافی ہوگی۔امین راحت چغتائی،سعید قیس،آصف ثاقب اورحسن عسکری کاظمی کی غزلیں بھی ہمیں پسند آئی ہیں۔ستیہ پال آنند،توصیف تبسّم اور گلزارکی نظموں سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے ہیں اورانہیں کلمۂ تحسین پیش کرنے میں ہمیشہ متذبذب رہتے ہیں۔

قیصرنجفی (کراچی)

☆

شام

دھر دیا ہے آن کر
شام کی دہلیز پرسورج نے سر
اعلان کرتا ہے گجر
اب تم بھی اپنی شان وشوکت بھول کر
اور کرّ وفر
لوٹ آؤ گھر

چھینتی ہے تیرگی
سورج کی مٹھی کھول کر
آخری اُس سے کرن
دے کر پروں میں اپنے سر
بےصدائیں
چہچہا کرتے طیور
محبوس خاموشی کے زنداں میں ہے
آوازوں کا شور

ٹوٹا ہے آب وتاب کاروشن حصار
اپنی وصولی کے لیے
رات ہے سرپرکھڑی
آؤ!ادائے قرض کی ہے یہ گھڑی

(تنہائی کے تہوار سے انتخاب)

اردوشاعری بالخصوص نظم کے موجودہ منظرنامے میں ایک نام جس نے غیرمعمولی طورپرقارئین کواپنی طرف متوجہ کیا ہے،وہ آصف رضا کا ہے۔فکری بالیدگی اورمعنی کی دبیز پرتوں کے لحاظ سے ان کی نظمیں ایسی ہیں کہ ہم انہیں ن۔م۔راشد کی نظموں کے سلسلے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔(ڈاکٹراحمدمحفوظ)

ادراک حسن اورزندگی کی معنویت کی یکجائی ہی آصف رضا کی تخلیقی پروسیس کے قفل ابجد کی کلید ہے۔آصف رضا کی نظموں میں ادراک جمال یا سراغ جمال کئی عمودی اور افقی سمتوں سے مترشح ہوتا ہے۔(عبدالاحدساز)

موضوع،مضمون،متن اوراسلوب یعنی ہرلحاظ سے آپ کی نظمیں ایک نامیاتی وحدت میں پروئی ہوئی،استعارے کی سطح پرخودکفیل شعری اکائی کااحساس دیتی ہیں۔استعارہ سازی میں بھی آپ فی زمانہ سکہ بندبازاری مال سے گریز کرتے ہیں۔(ڈاکٹرستیہ پال آنند)

آصف رضا کی نظمیں اپنے موضوعات اورزبان وبیان دونوں لحاظ سے ہماری موجودہ دورکی شاعری سے الگ نظرآتی ہیں۔ مجھےان پرکچھ اثرات ن۔م۔راشد کے بھی محسوس ہوئے ہیں۔ان کی نظموں میں یوں تو مصرعے ترشے تراشے نظرآتے ہیں لیکن ان کے پیچھے گہری سوچ اورفلسفیانہ شعوربھی کارفرما ہے،اسی لیےان کااسلوب روانی کے باوجودایک دبازت لیے ہوئے نظرآتا ہے۔(صبااکرام)

آصف رضا کی نظموں کا دوسرا مجموعہ

تنہائی کے تہوار

مکتبہ شہرزاد(کراچی)سے اگست ۲۰۱۱ میں شائع ہوگیا ہے۔

...... کھرے سکّے ......

ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی اُردو کے اُن گِنے چُنے لکھاریوں میں سے ہیں جو ایک طول طویل عرصے سے ادب کی مختلف جہتوں میں اپنی قلم کارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں انھوں نے افسانے بھی لکھے، خاکہ نگاری بھی کی نیز نوخیز نسل کے لئے بھی لکھا اور خوب لکھا۔لیکن ان کا اصل میدان تحقیق وتنقید ہے اور اس میدان میں وہ ایک اختصاصی مقام کے حامل ہیں۔ان کی تحقیق کی بنیاد معروضی حقائق پر ہے جنہیں وہ اپنے دوررس منطقی شعور کی کسوٹی پر پرکھ کر ایک خاص سلیقے سے مرتب ومنضبط کرتے ہیں، نیز زندگی کے بنیادی مسائل ومعاملات کے وجدانی ادراک کے ساتھ ساتھ وقت اور ماحول کی کوکھ سے ہر لحظہ جنم لینے والی نو بہ نو سنگین حقیقتوں کی تہہ دارانہ جہتوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی قلم کارانہ کاوشیں صاحبانِ شعرا اور اربابِ علم وفضل کے کسی نہ کسی نفسیاتی مطالعے کی تسکین اور اہلِ ذوق کی آسودگیٔ ذوق کا سبب ہیں۔ادب کی قلم رو میں یہی وہ وصفِ خاص ہے جو کسی بھی صاحبِ قلم کو صاحبِ اعتبار کہنے اور کہلائے جانے کا استحقاق عطا کرتا ہے۔

...... پروفیسر ڈاکٹر احمد رفاعی

دستیابی: 2-B/137، لطیف آباد 8، حیدرآباد، سندھ۔

...... ریزہ ریزہ ہوا یہ زنجیرِ گراں ......

جناب حسن حمیدی منفرد اسلوب کے شاعر اور نہایت مخلص اور محبِّ وطن سیاسی رہنما تھے۔وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے خاصی طویل مدت تک جیل میں رہے لیکن اُنہوں نے قید وبند کی تکلیف سے تنگ آ کر حق وصداقت کا راستہ کبھی نہیں چھوڑا۔سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ شعری تخلیق کا سفر جاری رکھنا نہایت مشکل کام ہے لیکن حسن حمیدی نے اس مشکل کو اپنے لئے نہ صرف آسان بنا لیا بلکہ شاعری جن لطافتوں اور نزاکتوں کی متقاضی ہے اس سے بھی کبھی صرفِ نظر نہیں کیا اُن کے رویہ کی وجہ سے ان کی شاعری کسی طرح بھی نعرہ بازی میں نہیں ڈھلی۔جب ہم اُن کی غزلیں اور نظمیں دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جس کا اوڑھنا بچھونا سیاست ہو وہ اپنی شعری تخلیقات میں شاعرانہ حسن اور جمالیاتی قدروں کو اس مضبوطی سے کیسے تھامے ہوئے ہے۔اُنہوں نے اپنی اردو شاعری میں سندھی شعری روایات کو جس خوبصورتی سے برتا ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔حسن حمیدی سمجھتے تھے کہ شاعری معاشرہ کو نکھارنے، سنوارنے، بدلنے اور آگے بڑھانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن وہ اس کی جمالیاتی قدروں سے غفلت برتنے کے کسی قیمت پر بھی روادار نہیں تھے۔

...... حکیم سعید

دستیابی: حمیدی اکیڈمی، 133، پہلی منزل، سنی پلازہ، حسرت موہانی روڈ، کراچی۔

...... اشکِ رَواں کا مَوسم ......
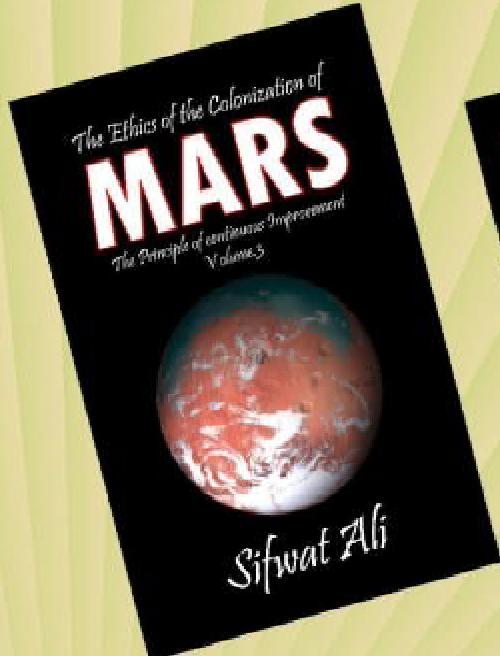
رونق حیات کی شاعری ایک سچے آدمی کی شاعری ہے۔اُنھوں نے نہ صرف اپنے دِل کا احوال لکھا ہے بلکہ اُن کی غزلوں میں آج کے سماج کا چہرہ بھی نظر آتا ہے۔وہ زبان وبیان کو اپنے تخلیقی سفر میں بہت اہمیت دیتے ہیں اِسی لئے اُن کی لفظیات، اُن کے استعارے، اُن کی تشبیہات ایک خاص حُسن رکھتی ہیں۔''اشک رواں کا موسم'' کی غزلیں نئے شعور کی غزلیں ہیں مگر ان کا رشتہ روایتی اقدار کے ساتھ بہت گہرا ہے۔رونق حیات حُسن پرست تخلیق کار ہیں، وہ جمالیات کے اظہار میں بے باک بھی ہیں اور شائستہ بھی۔اُن کا کلام ہماری تہذیب کا آئینہ دار ہے جس میں عہدِ جدید کے تصورِ عشق کی بازگشت ملتی ہے۔رونق حیات کی زیرِ نظر کتاب ہمیں حُسن اور صداقت کے نئے منظروں سے آشنا کرتی ہے۔

...... ڈاکٹر جمیل جالبی
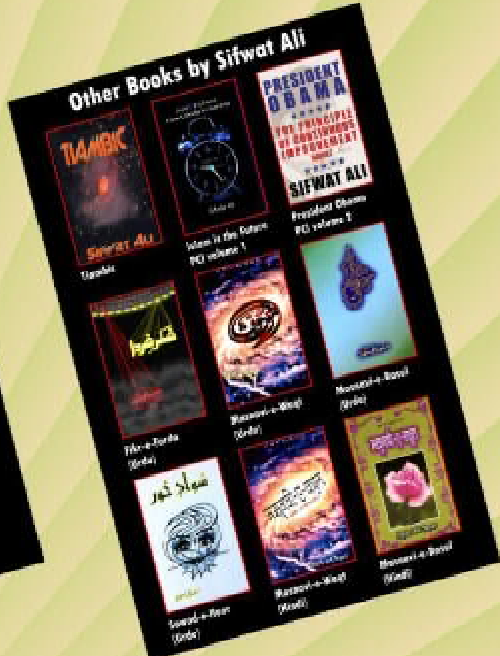
دستیابی: ملٹی میڈیا افیئرز، 21 نند اسٹریٹ، شام نگر، چوبرجی، لاہور۔

A short note about the author and the book

Sifwat Ali is not just a writer he is a Philosopher, a Physicist, a Theologian, a Computer Scientist, a journalist, a biologist, and the list is growing. He is not afraid of digging deep in any field of human endeavor. His most famous idea is what he calls as the "Principle of Continuous Improvement" or PCI. Anything that comes to mind, an idea or physically existing in nature, will either improve in form and function or simply perish. He has described it in a form that anyone can understand. Yet he has given it a mathematical formulation, a formulation that a Physicist will readily understand and experiment with, and a journalist will write stories about.

Sifwat Ali has written many books and hundreds of articles in various languages; his work is being appreciated on a global scale, and at least one comprehensive book has been written on his works. This is his fourth book in the English language (see the back cover to look at his other works). As usual he is asking tough questions. When the humans are busy killing each other on this planet, why think about colonizing another planet. He has examined the scriptures: The Old Testament, The New Testament and the Quran to see what these old books say about moving to another planet. He has introduced the idea of a "Worship Corridor" in the "Arabian Terra" on the Planet Mars. If PCI holds then he asks a powerful question; Will the current concepts on "GOD" will hold and for how long or another more powerful paradigm is needed and what its formalism shall be? He invites you to read this and provide your input to him.

This book opens our minds and forces us to think about how we began our life yet the book is about the future and goes into great detail on the issues of habitation of another planet; arrival, making love, giving birth, and raising children without becoming non-human, and yes burying our dead. This colonization is about to reduce the probability of self-extinction forever.